فتاویٰ اجماعیہ

مترجم

حضرت [illegible]

[illegible]

حسب ارشاد

حضور شیخ العالم، رہبر شریعت، شیخ طریقت

[illegible] اشرفی جیلانی شاہ رحمۃ اللہ علیہ

کچھوچھہ شریف

ناشر

[illegible]

فتاویٰ جماعتیہ

مرتبہ

علامہ مفتی غلام رسول، دارالعلوم نقشبندیہ
علی پور شریف، ضلع سیالکوٹ

حسبِ ارشاد

ختام المحققین، امام المدققین، رہبر شریعت، شیخ طریقت
علامہ الحاج الحافظ پیر سید **اختر حسین شاہ** رحمۃ اللہ علیہ
علی پور شریف

ناشر

دارالعلوم جامعہ جماعتیہ حیات القرآن
بازار پاپڑ منڈی اندرون شاہ عالمی گیٹ۔ لاہور

مقام اشاعت ۔ دارالعلوم جامعہ جماعتیہ حیات القرآن
بازار پاپڑ منڈی اندرون شاہ عالم گیٹ لاہور ۔

طبع اوّل مئی ۱۹۸۲ء

تعداد ایک ہزار قیمت چالیس روپے

لیاقت علی ابوالمعالی پرنٹنگ پریس نزد رتن سینما میکلوڈ روڈ لاہور
کتابت ۔ صوفی محمد ابراہیم شاد نوری جماعتی نقشبندی میروال ۔

ملنے کے پتے

شرکت حنفیہ لمٹیڈ گنج بخش روڈ لاہور

جناب پیر سیّد منور حسین شاہ صاحب جماعتی عفی اللہ عنہ
دربار عالیہ علی پور شریف ضلع سیالکوٹ

دارالعلوم جامعہ جماعتیہ حیات القرآن
بازار پاپڑ منڈی اندرون شاہ عالم گیٹ لاہور

اِنتساب

مَیں فتاویٰ جماعتیہ کا انتساب، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، محی الملّۃ، مقیم السنّۃ، منبع الارشاد، مرجع الافراد، مجدد دوراں، غوثِ زماں، حامی الشریعۃ، امیر الملّۃ، الحاج، الحافظ پیر سیّد جماعت علی شاہ صاحب محدّث علی پوری قدس سرّہ العزیز کی طرف کرتا ہوں۔

مفتی

غلام رسول گجراتی

مدرس دارالعلوم نقشبندیہ

علی پور شریف ضلع سیالکوٹ

فہرست

اگر مقیم نے مسافر امام کی اقتداء کی ۱۷۱
مطلق قرائت نہ کرے
اگر امام اور مقتدی کے درمیان اختلاف
ہو جائے
اجرت پر جانور ذبح کرنے والا امام بن سکتا ہے
اگر نماز میں رکوع چھوٹ گیا
قرائت زبان سے ادا کرنی چاہیئے
اگر امام قرائت غلط پڑھتا ہے تو پھر کیا
حکم ہے
ڈاڑھی مونڈھوانے والا امام نہیں بن سکتا
سجدہ تلاوت رکوع میں ادا ہو جاتا ہے
تداخلی صورت
قیاس کی استحسان پر ترجیح
مصالحہ مرسلہ
مفقود الخبر کا مسئلہ
ٹیپ ریکارڈ سے سجدہ تلاوت واجب
نہیں ہوتا
اگر امام مسجد کے بیوی بچے شیعہ ہوں
اگر امام حضرت معاویہ کو گمراہ سمجھے، اس
کا حکم
حضرت معاویہ کاتب وحی تھے

خشخشی ڈاڑھی رکھنے والے امام کا حکم
حدیث کا صحیح مفہوم
تعمیم حکام کے لیے ہے
غیبت کی تعریف
جو شخص عشاء کی جماعت میں رمضان میں
شریک نہ ہوا وہ وتر علیحدہ پڑھے
سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا چاہیئے

باب الجمعۃ

نماز جمعہ فرض ہے
گاؤں میں جمعہ فرض نہیں ہے
شہر کی صحیح تعریف
ظاہر الروایۃ
گاؤں میں اگر عوام جمعہ پڑھیں تو منع نہیں
کریں گے
احتیاط الظہر
عملی طور پر پیش رفت نہیں ہوئی
خلل اندازیٔ نماز کے متعلق اہم فتویٰ ۱۷۲
صاحب فتاویٰ نظامیہ کی تصریح
تکبیرات تشریق کے شرائط
تکبیرات تشریق اصل مسئلہ سے مستثنیٰ ہیں

باب الجنائز

کتاب الزکوٰۃ

مرجوح قول کے مطابق فتویٰ دینا ناجائز
ہے
نوح بن مریم کی روایت مرجوح ہے
سادات کو نذرانے دینے چاہئیں
سگرٹ نوشی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے
رمضان کا مہینہ قمری حساب سے رکھنے
کی حکمت
جہاں چھ ماہ رات ہو اور چھ ماہ دن ہو
وہاں روزہ کا حکم
ٹیکہ سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

کتاب الحج

کیا حج سے حقوق العباد معاف ہو جاتے
ہیں۔
گناہ چار قسم پر ہے
حقوق العباد معاف ہونے کی صورت
مدینہ منورہ جائے تو روزہ مطہرہ کی
نیت کرے
ابن تیمیہ کی غلطی
نبی علیہ السلام زندہ ہیں
مدینہ منورہ مکہ مکرمہ سے افضل ہے
حضرت عمر کا مذہب کہ مدینہ افضل ہے
حدیث شدر حال کی بحث
حافظ ابن حجر و حافظ عینی کی تحقیق
استثناء میں اصل
حدیث توسل صحیح ہے
راوی عثمان بن عمر پر بحث
حدیث توسل محدثین کے نزدیک
صحیح ہے

کتاب النکاح

نکاح کا خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے
سیدزادی کا نکاح غیر سید کے ساتھ
جائز نہیں ہے
غیر کفو میں نکاح نہیں ہو سکتا
سیدزادی کے لیے سید ہی کفو
ہو سکتا ہے۔
حدیث یا تو ضعیف ہے یا مخصوص البعض ہے
اعلیٰ حضرت کا فتویٰ صورت مخصوصہ
سے متعلق ہے
تضاد ناممکن ہے
امام ابو حنیفہ کا جواب

والدہ کے چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح
جائز ہے۔
حاملہ من الزنا کے ساتھ نکاح جائز ہے
سنی لڑکی کا نکاح شیعہ مرد کے ساتھ
منعقد نہیں ہوتا
جو شیعہ کے کفر میں شک کرے وہ خود
کافر ہے
مرد سفر میں ہے عورت نے تین سال بعد
بچہ جنا نسب ثابت ہوگا
ولی کی کرامت برحق ہے
مزنیہ کی بیٹی زانی پر حرام ہے ۲۵۸
اگر ساس کے ساتھ زنا کیا تو بیوی حرام
ہو گئی
شرط حلالہ کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ ہے
حدیث کی صحیح تاویل نکاح کے بعد
چھوہارے پھینکنے جائز ہیں
نابینا آدمی نکاح پڑھا سکتا ہے
نکاح کا مسجد میں ہونا مسنون ہے
حقیقی بہن کی رضاعی بہن کے ساتھ
نکاح جائز ہے
اگر دادا نے بعدم موجودگی باپ کے

نکاح کیا تو اجازت پر موقوف ہوگا
اجازت صراحۃً لازم ہے
مہر کا وجوب تین چیزوں سے ہوتا ہے
جواز نکاح کے لیے گواہوں کی موجودگی
شرط ہے
شافعیہ کے نزدیک گواہ دونوں مرد
ضروری ہیں
قالوا کا مقولہ غیر مستحسن ہے
نبی کریم علیہ السلام عالم الغیب ہیں
آیت مداینیہ میں شہادت کا تعین کر دیا
گیا ہے
اگر شادی میں باجے وغیرہ ہوں
جو حقیقی پھوپھی نہ ہو اس کے ساتھ نکاح
جائز ہے
تجدید ایمان
مرضعہ کی تمام اولاد رضیع پر حرام ہے

کتاب الطلاق ۲۷۰

عورت کو کہا: تو مجھ پر حرام ہے
مردنے عورت کو طلاق دی۔ دو گواہ
کہتے ہیں کہ ایک طلاق دی، دو کہتے

کہتے ہیں کہ تین

مرد نے عورت سے کہا : تجھ کو میں نے

طلاق دی اور تجھ کو میں نے طلاق دی

طلاق کا دینا دو قسم پر ہے

امام حسین علیہ السّلام

طلاق پر دستخط کر دیئے لیکن زبانی طلاق

نہیں دی

تین طلاقیں بیک وقت دینے سے

تین ہی واقع ہوں گی

عبداللہ بن عباس کی روایت کا مفہوم

اگر عورت مدخول بہا ہو تو ابن عباس

کے نزدیک بھی تین ہی ہوں گی

حدیث مذکور منسوخ ہے

اس حدیث کے راوی مجہول ہیں

رکانہ کی وفات

فخرالدین رازی تین ہیں

بلا حرف تشبیہہ نہ طلاق ہوتی ہے نہ ظہار

کنایات تین قسم پر ہیں

بعض چیزوں کو حلال سمجھنا کفر نہیں ہے

بلا علم فتویٰ دینا حرام ہے

رافضی مرتد اور کافر ہیں

تین طلاقیں دینے کے بعد عورت حرام

ہو گئی

تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع

ہوں گی

ابن تیمیہ گمراہ ہے

فاطمہ بنت قیس کو ان کے خاوند نے

تین طلاقیں دیں

نابالغہ کا نکاح اور حلالہ

مولوی پر بہتان باندھا

مرد نے کہا تین طلاق

طلاق کے وقوع میں عورت کی طرف

نسبت شرط ہے

اگر طلاق جبراً لکھائی گئی تو طلاق

نہ ہو گی ۔

اگر پہلے طلاق دی پھر تین مرتبہ کہا :

حرام ، حرام ، حرام ۔

بائن صریح کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے

طلاق ثلاثہ

عورت مغلظاً حرام ہو گی

اگر چھ طلاقیں دیں

عورت سوائے حلالہ کے جائز نہیں ہے

کتاب الوقف

مسجد قیامت تک مسجد ہے

اگر مسجد کا سامان بوسیدہ ہو گیا

امام ابو یوسف کے نزدیک بوسیدہ سامان

فروخت ہو سکتا ہے

مسجد کس وقت بنے گی

مسجد کا حساب کس کے پاس رہنا چاہیئے

مسجد اجابہ

کتاب البیوع

مردار کا چمڑا رنگنے کے بعد فروخت کرنا

جائز ہے

امام نے ہاتھی کو نجس العین کہا ہے

جانور کو جو پالتا رہا ہے اس کو معاوضہ

دیا جائے

مرہونہ چیز سے نفع اٹھانا حرام ہے

حدیث آیت ربوا کے ساتھ منسوخ ہے

سود حرام ہے

سود خوار کے ہاں دعوت کھانی حرام ہے

سود کی تعریف

اللہ تعالیٰ خبیث مال کو پسند نہیں فرماتے

حرام مال کا صدقہ

کیا حکومت سے سود لینا اور انکم ٹیکس

میں کٹائی کرنا جائز ہے

اگر والد نے اپنے ایک لڑکے کو جائیداد

ہبہ کر دی

ہبہ خصوصی

رہن کی شرعی صورت

ہبہ کے لیے مکمل قبضہ شرط ہے

ہبہ وراثت میں تبدیل ہوگا

کتاب الایمان

بیوی کو کہا کہ تیرے ہاتھ سے کھاؤں تو

خنزیر کھاؤں

کفارہ کا تداخل

یمین غموس

کتاب الذبائح

سیدنا غوث اعظم کے نام جانور

مشرکین مکہ کا غلط نظریہ

حلّت اور حرمت کا مدار
اہلال کا لغوی معنی
اندھی تقلید
حرام مغز وغیرہ کا کھانا حرام ہے
اگر کافر نے شکار کیا تو اس کا حکم
ذبح شرعی
عورت کی ذبح جائز ہے
عیسائی کی ذبح مفتیٰ بہ قول کے مطابق حرام ہے
اگر کان تہائی سے کم کٹا ہوا ہے تو قربانی جائز ہے
اگر قربانی کے حصہ میں غیر مقلد شریک ہو تو ناجائز ہے
جانور کا منہ بوقت ذبح قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے
طوطا حلال ہے
قربانی کے جانور کی عمر
جانور کو ذبح کیا لیکن اس نے حرکت نہ کی

کتاب الحضر والاباحۃ

غیر اللہ کو سجدہ کرنا

دو یہودیوں کا سوال
کیا بیعت توڑنی جائز ہے ؟
طریقت سے مردود
کیا بیعت کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے
بیعت کی قسمیں
بوسیدہ قرآنی اوراق کو دفن کر دینا چاہیئے
سینما دیکھنا حرام ہے
سینما تخریبِ اعمال کا سبب ہے
کیا اسقاطِ حمل جائز ہے یا نہیں
جن امور کو شریعت نے منع نہیں کیا انکا درجہ اباحت کا ہے
جو اپنے کو غیر باپ کی طرف نسبت کرے اس پر لعنت ہے
حضرت عکاشہ بن محصن
کربلا میں شہید ہونے والے افراد
اہل بیتِ نبوت سے انیس تھے
اصحاب کہف کا کتّا جنتی ہے
دس جانور جنّت میں جائیں گے
حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں
علامہ تقی الدین کی تصریح

مزارات پر چراغ جلانا جائز ہے
قبروں پر جانے کا فائدہ
مزارات پر چادریں ڈالنی جائز ہیں
تصویر کا رکھنا حرام ہے
قبر کے لیے زمین متعین نہیں کرنی چاہیئے
مقلد کسے کہتے ہیں
جو لوگ اہل السنّۃ کو مسلمان نہیں سمجھتے وہ
خود کافر ہیں
کیا مسلمان اور مؤمن میں فرق ہے ؟
نکاح مسجد میں مسنون ہے
صدقہ نفل امیر غریب کھا سکتا ہے
منکرات سے روکنا لازم ہے
ایمان میں جہالت عذر نہیں ہے
کسی کی حق تلفی ناجائز ہے
نماز کے اوقات
سنّت اور نفل نماز فرائض کے لیے تکملہ ہیں
شکرانہ کے نفل
زیور کی زکوٰۃ فرض ہے
قرض اٹھانا بہ نیت ادائیگی جائز ہے
انشورنس کرالینی کیا جائز ہے یا نہیں
ضبطِ تولید کہاں تک جائز ہے

پانچ نمازیں قرآن سے ثابت ہیں
سنتیں پڑھ کر امام جماعت کرائے
زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہ
لازم ہیں
تعزیر میں نصاب شہادت
حقوق دو قسم سے ہیں
جنازہ میں اخیر صف میں ثواب زیادہ ہے
جنازہ کے لیے وضو کیا ، کیا اس سے
فرض نماز پڑھ سکتا ہے ؟
بندوق کے ساتھ شکار

کتاب الوصایا والمیراث

وراثت کا چھوڑنا تب ہوتا ہے جبکہ مالک ہو
حموی کا ضابطہ
بیوی کے لیے وصیت
وارث اگر وصیت کو جائز کہیں تو جائز ہے
وصیت ثلث مال سے ہوگی
جو اصول کو ملتا ہے وہی فروع کو ملتا ہے
زندہ انسان کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی
عول کا معنیٰ
ایک مکان دو بھائیوں کے نام

لڑکا اپنی ماں کا وارث ہے

بیوی ذوی الفروض سے ہے

بھتیجا کے ساتھ بھتیجی عصبہ نہیں ہے

میت کا باپ میت کی بیٹی کے ساتھ مل کر عصبہ ہو جائے گا

باغ فدک کے متعلق چار سوال

فدک ایک گاؤں کا نام تھا

مال فئی اور مال غنیمت میں فرق

حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کا فدک مطالبہ

حدیث لانورث کے راوی حضرت علی شیر خدا بھی ہیں

کلمہ انما مفید حصر ہے

خبر واحد قابل حجت ہے

باغ فدک مال فئی سے ہے

حضرت داؤد علیہ السلام کی وراثت

حضرت ذکریا علیہ السلام کی وراثت

کیا فدک ہبہ تھا

نصاب شہادت

فدک کا ذکر کتب اہل السنت والجماعت میں

حضرت ابوبکر نے سیدہ کی نماز جنازہ پڑھائی

حضرت عباس نے جنازہ میں شرکت نہیں کی

باپ کے ہوتے ہوئے میت کے بھائی محروم ہوتے ہیں

بیوی کے فوت ہونیکے بعد زیور کا وارث کون ہوگا۔

حرفِ اوّل

علم فقہ کے لیے دقتِ نظر ہونا لازمی اور ضروری ہے کیونکہ فقہ کی تعریف ہے :

العلم بالاحکام الشرعیۃ الفرعیۃ المکتسب من ادلتھا التفصیلۃ

یعنی ان احکام شرعیہ فرعیہ کا جاننا جو اپنی تفصیلی دلیلوں سے اخذ کئے گئے ہیں - علامہ شامی لکھتے ہیں کہ فقیہ درحقیقت مجتہد ہوتا ہے - چنانچہ ردالمحتار میں ہے :

لیس الفقیہ الا المجتہد عندھم واطلاقہ علی المقلد الحافظ للمسائل مجاز - (ردالمختار ص۳۵)

علماء اصولیین کے نزدیک فقیہہ مجتہد ہی ہوتا ہے اور مقلد جو مسائل کا یاد کرنے والا ہو ، اس کو مجازاً فقیہ کہا جاتا ہے - امام حسن بصری فرماتے ہیں :

انما الفقیہ المعرض عن الدنیا الزاھد فی الآخرۃ البصیر لعیوب نفسہ -

دنیا سے اعراض کرنے والے ، آخرت میں رغبت کرنے والے اور اپنے عیبوں سے واقف شخص کو فقیہہ کہتے ہیں -

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آپ علم فقہ کی طرف کیسے مائل ہوئے - امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ توفیق تو بس خدا کی طرف سے ہوتی ہے - البتہ واقعہ یوں ہے جب میں نے تحصیلِ علم کا ارادہ کیا تو تمام علوم کو اپنا نصب العین بنایا اور ایک ایک فن کو پڑھا اور ہر ایک کے انجام اور فائدے پر غور و فکر کیا - تمام علوم سے بہترین میں نے علمِ فقہ کو پایا - اس علم کی عظمت و

جلالت شان میرے دل میں بیٹھ گئی، میں نے خیال کیا کہ اس علم کی تحصیل کے لیے علماء، فقہاء، مشایخ وقت اور صاحب نظر بزرگوں کی مجلس میں بیٹھوں گا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ فرائض کی ادائیگی اقامت دین اور عبادت گذاری اس علم کی معرفت کے بغیر ناممکن ہے اور اس علم فقہ سے ہی دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہو سکتی ہیں اور جو شخص عبادت اور خلوت نشینی کا ارادہ کرے تو عبادت الٰہی بھی بغیر علم ممکن نہیں ہے اور وہ علم، علم فقہ ہے، جو علم با عمل کا نام ہے۔ معلوم ہوا کہ علم فقہ بہترین بلکہ اکثر علوم کا مغز اور خلاصہ ہے۔ ۱۹۵۹ھ کے آخر (بندہ راقم الحروف) کا مرکزی دار العلوم نقشبندیہ علی پور شریف میں بحیثیت صدر مدرس تقرر ہوا تھا۔ یہ میرا تدریسی فرائض کے لیے تقرر قدوۃ الفضلا، زبدۃ الاصفیاء، تاج الاماثل، سراج الافاضل، عظیم البرکت، رفیع الدرجت، حامی طریقت، سراج الملت حضرت قبلہ پیر سید محمد حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

اس وقت آپ ہی دار العلوم نقشبندیہ کے مہتمم تھے۔ آپ ایک عظیم اور جید عالم ہونے کے علاوہ حقیقی مذہبی رہنما، حق و صداقت کے مجسمہ، زہد و اتقاء کے پیکر، حقیقت میں تمام اوصاف جمیلہ کے مالک تھے۔ اپنی تمام عمر کتب درس نظامیہ، طلباء دین کو پڑھاتے رہے۔ آپ کی تصنیف "افضل الرسول" آپ کے علم و فکر کا واضح ثبوت ہے۔ آپ کی وفات ۱۹۶۱ء کو ہوئی۔

اب ۱۹۸۰ء ہے تقریباً بیس سال گذرنے کو ہیں اس دوران تدریسی فرائض کے لیے فتوٰی نویسی کا کام بھی میرے ذمہ ہی رہا۔ دربار عالیہ میں بے شمار مسائل پاکستان بلکہ بیرون ممالک سے بھی آتے رہتے ہیں، تمام کے جوابات لکھے جاتے ہیں اور کچھ جوابات بمعہ استفتاء رسالہ "انوار الصوفیاء" میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں اور کچھ استفتاء اور اُن کے جوابات کی نقلیں محفوظ بھی رکھی گئیں۔ خاتم المحققین، امام المدققین، رہبر طریقت، پیر شریعت حضرت قبلہ سید اختر حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکم فرمایا کہ ان استفتاء اور جوابات کو "فتاوٰی جماعتیہ" کی شکل میں ترتیب دے دینا چاہیئے۔ لہٰذا میں نے آپ کے حکم اور ارشاد کے مطابق، "فتاوٰی جماعتیہ" کو مرتب کیا۔ فتاوٰی جماعتیہ کی ترتیب و تحریر میں جناب صاحبزادہ علامہ

حوالہ ؟

الحاج پیر سید افضل حسین شاہ صاحب سجادہ نشین علی پور شریف بھی میرے معاون رہے۔ آپ درس نظامیہ کے مکمل عالم اور علوم عربیہ کے فاضل ہیں اور دار العلوم نقشبندیہ کے مہتمم بھی ہیں۔ ۱۹۸۰ء ماہ اکتوبر میں حضرت پیر طریقت، رہبر شریعت، منبع جود و سخا، مخزن رشد و ہدیٰ قبلہ پیر سید اختر حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اچانک بیمار ہو گئے۔ تین دن کے اندر تکلیف زیادہ ہو گئی۔ حتیٰ کہ چھ اکتوبر ۱۹۸۰ء بروز سوموار کو آپ کا وصال مبارک ہو گیا۔ بعد میں صاحبزادہ بلند اقبال پیر سید منور حسین شاہ صاحب زید علمہ، فرمانے لگے کہ فتاویٰ جماعتیہ میں چند فقہی اصطلاحات کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ میں نے "فتاویٰ جماعتیہ" کے آغاز میں کچھ فقہی اصطلاحات کا اضافہ کر دیا جن کا مسائل فقہ کے ساتھ ربط اور تعلق بھی تھا اور ان اصطلاحات کے ضمن میں بعض مقامات میں مسائل کا تذکرہ بھی آ گیا اور قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، محی الملۃ، مقیم السنۃ، منبع الارشاد، مرجع الافراد مجدد دوراں، غوث زماں، کاشف الغمہ، ملجاء الامت، وارث الانبیاء، ولی الاولیاء، فانی فی اللہ، باقی باللہ، آیت من آیات اللہ، حامی الشریعت، امیر الملت، حاجی الحرمین والشریفین، الحافظ، العالم پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری قدس سرہٗ کی تمام اولاد علم و عمل کا حسین امتزاج ہیں، منبع جود و سخا، مخزن رشد و ہدیٰ، نواسہ امیر الملۃ، معین الملت پیر سید حیدر حسین شاہ صاحب مدظلہ العالی بہت فیاض اور سخی ہیں۔ مساجد کی تعمیر اور مدارس عربیہ کی معاونت اور غرباء اور مساکین کی خدمت فرماتے رہتے ہیں اور پیر طریقت الحاج الحافظ سید نذر حسین شاہ صاحب نہایت متقی اور متشرع پیر ہیں اور حضرت قبلہ جوہر الملۃ پیر سید اختر حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متقی پرہیزگار پابند شریعت و سنت پیر تھے۔ دین اسلام کی خدمت اور مذہب اہلسنت والجماعت (بریلوی) کی حمایت و تائید اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ یہ وہ گھرانہ اہلبیت رسول ہے جن کی محبت فرض عین اور ان کی عزت و احترام جزو ایمان ہے۔ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ جامع مسجد کے دروازہ پر بنو ہاشم کے ایک چھوٹے لڑکے سے ملے جو دروازے سے باہر جانا چاہتا تھا مگر اس نے امام صاحب کو نکلتے دیکھا تو تعظیماً کھڑا ہو گیا تاکہ آپ نکل جائیں

امام صاحب نے جواسے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے اور ہاشمی بچے کو پکڑ کر بوسہ دیا اور کھڑے ہو گئے، حتیٰ کہ وہ بچہ مسجد سے باہر چلا گیا پھر فرمایا یہ بچہ اہل بیت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا احترام فرض کیا ہے۔ صوفیاء کے پیشوا اور مسئلہ وحدت الوجود کے بانی محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ کے پاس اگر کوئی سید تعلیم کے لیے آتا تو اس کو بلند جگہ پر بٹھاتے اور خود نیچے بیٹھتے۔ امام محمد بن ادریس شافعی اہل بیت کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ آپ نے تصریح کی ہے کہ میں اہل بیت کے متبعین سے ہوں حتیٰ کہ ان کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو آپ نے جواباً فرمایا:

اگر آل محمد کی محبت رفض ہے تو جن وانس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

حضرت زین العابدین علیہ السلام جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لاتے تو ابن عباس کھڑے ہو جاتے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کی حمایت میں متعدد مرتبہ قابل تحسین موقف اختیار کیا۔ جس کی بنا پر سن کہولت میں حکومت کی طرف سے ان پر عتاب نازل ہوا اور آخر کار حق کے ساتھ تمسک اور نہایت بے نیازی کی حالت میں عترت نبوی کی محبت میں مقام شہادت حاصل کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اہل بیت کی تعظیم و توقیر میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن حسن المثنیٰ جب ان کے پاس تشریف لاتے تھے تو انہیں بلند جگہ پر بٹھاتے اور آپ نیچے بیٹھتے۔ حضرت بایزید بسطامی المتوفی ۲۶۱ھ جن کی ولایت کا شہرہ تمام دنیا میں ہے۔ مشہور روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں پانی بھرا کرتے تھے۔ (رشفۃ الصادی ص۱۵۰)

حضرت امام معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۲۰۰ھ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے دربان تھے۔ حضرت معروف کرخی حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا المتوفی ۲۰۳ھ کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ امام عارف باللہ عبدالوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ فرماتے ہیں: کہ سید اور اہل بیت رسول کا ایک حق ہم پر یہ بھی ہے کہ ہم اپنی جانیں ان پر قربان کر دیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک اور لحم پاک ان کے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا وہ آپ

حوالہ ؟

؟

کے گوشۂ جگر ہیں. تعظیم و تکریم میں جو کل کا حکم ہے وہی جزو کا بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جزوِ مبارک کی عزت قیامت تک ایک جیسی ہے جس میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔

علّامہ ابوبکر بن شہاب الدّین شافعی الحضرمی اپنی کتاب "رشفۃ الصادی" کے خطبہ میں فرماتے ہیں ؛

تمام تعریفیں اس پروردگار کے لیے ہیں جس نے اپنے نبی کے اہل بیت کو عظیم مفاخر و مناقب سے آراستہ کیا اور انہیں عظیم مظاہر و مواہب کی وجہ سے قربت سے نوازا ۔ انہیں اتنا بلند کیا کہ اس کی انتہا کو کوئی زبان اور کسی کا قلم بیان نہیں کر سکتا۔ اپنے ارادہ ازلی سے اس کریم خاندان کو پاکیزگی بخشی اور اعلیٰ مراتب و مناصب پر پہنچایا، فتنوں کی طغیانی کے وقت انہیں سفینۂ نجات بنایا۔ امّت کے لیے انہیں پناہ گاہ ٹھہرایا جبکہ فتنوں کے جھکڑ چلیں ۔ ہدایت کے ستارے بنایا جبکہ مصائب کی راتیں سیاہ پڑ جائیں ۔ انہیں ان کے نانا رسول اللہ کی قرابت ان کی والدہ ماجدہ فاطمہ زہراء بتول کی وجہ سے اور ان کے باپ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے واسطے مکرم و محترم بنایا اور ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمیں پاکیزہ آل نبی اور اہل بیت کی تعظیم کی توفیق دی۔

حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ المتوفی ۳۲ھ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حسنین کریمین سے محبت کرتے تھے اور انہیں اپنی اولاد پر ترجیح دیتے تھے ۔ ایک دفعہ عمر فاروق نے حضرت زبیر بن العوام المتوفی ۳۶ھ سے فرمایا کیا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے میرے ساتھ چلو گے کیونکہ وہ بیمار ہیں ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بنو ہاشم کی عیادت (بیمار پرسی) فرض ہے۔"

امام شعرانی اپنی کتاب "الیواقیت والجواہر" میں عقائد کے بیان میں لکھتے ہیں ؛

واجب ہے کہ وجوب محبت ذریت نبی کا اعتقاد رکھا جائے ۔ ان کا اکرام و

احترام ملحوظ رکھا جائے۔ وہ حسن وحسین حضرت فاطمہ کے دونوں بیٹے اور ان دونوں کی اولاد ہے، روزِ قیامت تک۔

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی المتوفی ۶۷۱ھ لکھتے ہیں کہ اہلِ بیت کی محبت فرض ہے جس میں کسی کے لیے عذر کی گنجایش نہیں ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام الشہید ۱۸۳ھ فرماتے ہیں کہ ایمان کی تکمیل کے لیے محبت اہل بیت لازم ہے یعنی محبت اہل بیت رسول کے سوا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

اپنی اولاد کو تین باتوں کی تربیت دو۔

نبی کی محبت، اہل بیت رسول کی محبت اور قرأتِ قرآن۔

امام سلیمان بن احمد طبرانی المتوفی ۳۶۰ھ فرماتے ہیں کہ اہلِ بیت رسول کی محبت کے سوا اعمال صالحہ فائدہ نہیں دیتے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ المتوفی ۳۳ھ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

کسی شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا حتیٰ کہ میری محبت کی وجہ سے میرے اہلِ بیت سے محبت کرے۔

امام محمد بن عبداللہ حاکم المتوفی ۴۰۵ھ نے صحیح السند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اہل بیت رسول، دُنیا کے لیے باعث امان ہیں۔

بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ ہر سو سال کے بعد جو مجدد آئے گا اور دین اسلام کی تجدید کریگا وہ اہل بیت سے ہی ہوگا۔ یہ لوگ اس حدیث سے دلیل پکڑتے ہیں جو علی بن حسن بن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ نے امام احمد بن حنبل سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ میرے اہل بیت سے ہر صدی پہ ایک شخص بھیجے گا جو میری امت

کو تعلیم دے گا۔

بلاشبہ حضرت امیر الملّت پیر سیّد حافظ جماعت علی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ اس حدیث نبوی کے مصداق تھے اور آپ ہی چودھویں صدی ہجری کے مصلح اور مجدّد تھے۔ آپ نے مسلسل وطویل ریاضات شاقہ کو برداشت فرما کر طول طویل اور دُور دراز مقامات پر پہنچ کر اپنی شبانہ روز محنت و ریاضت سے دین حق کی تجدید کی۔ ارکان وشعائر اسلام کا احیاء فرمایا اور حضرت امیر الملت رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی و نام نامی کے ساتھ ہی میں فتاوٰی جماعتیہ کو منسوب کرتا ہوں۔

حررہ

غلام رسول مدرس دار العلوم نقشبندیہ

علی پور شریف

خطبہ

الحمد لله الذی ھدانا فی البدایة لمعرفة الھدایة ورعانا بعین العنایة فی النھایة عن الجھل والغوایة ۔ وجعلنا ممن آمن بما انزل و اتبع الرسل و وفق للدرایة وخصنا باھلیة الشھادة علی الامم بفضل منه وکمال الرعایة وخلقنا فی امتہ الذی فاز رتبتہٗ الی قاب قوسین والصلوٰة علی رسوله الکریم مادام طلوع النیرین محمد ن المبعوث الی الاسود والاحمر بالکتاب العربی المعجز المنور وعلی آله واصحابه القائمین بنصرة الدین القویم الازھر والصفوة المجتھدین من امته الوارثین لعلمه العزیز الانور لاسیما امامنا الاعظم ذوی الفضل الاقدم وعلینا معھم وبھم ولھم یا ارحم الراحمین والحمد لله رب العلمین ۔

تقدیم

فقہ کے لغوی اور اصلی معنی میں مختلف اقوال ہیں۔ علامہ ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر بن محمد الزمخشری المتوفی ۵۳۸ھ لکھتے ہیں:

الفقہ حقیقۃ الفتح والفقیہ العالم الذی یفتح ما استغلق منہا۔

کہ فقہ کا اصلی معنی کھولنا ہے۔ فقیہہ وہ ہے جو کہ مشکل مسائل کو کھولتا ہے۔

علامہ شیخ زین بن ابراہیم بن محمد بن محمد بن محمد بن بکر الشہیر بابن نجیم المصری المتوفی ۹۷۰ھ فرماتے ہیں:

الفقہ لغۃ الفہم فقہ کا لغوی معنی سمجھنا ہے۔ محمد بن علی بن محمد بن علی علاؤالدین الحصکفی مؤلف در مختار المتوفی ۱۰۸۸ھ کہتے ہیں:

الفقہ لغۃ العلم بالشیئ ثم خص بعلم الشریعۃ کہ لغوی معنی فقہ کا کسی چیز کا جاننا ہے پھر اس کا اختصاص علم شریعۃ کے ساتھ ہو گیا ہے۔

اقرب الموارد میں ہے:

الفقہ العلم بالشیئ والفہم لہ

کسی شے کا جاننا اور اس کا سمجھنا فقیہ عالم (فقہ کے جاننے والے) کو کہتے ہیں۔ اور بہت سمجھدار اور ذکی عالم کو بھی فقیہ کہا جاتا ہے اس کی جمع فقہاء ہے۔

عرب کہتے ہیں تفقہ الرجل مرد نے علم فقہ سیکھ لیا اور حاصل کر لیا اور اصطلاحی معنی ھو التصدیق بالاحکام الشریعۃ الفرعیۃ المکتسب من ادلتہا التفصیلیۃ احکام شرعیہ فرعیہ (جزویہ) کی تصدیق جو کہ ادلہ تفصیلہ (کتاب سنت اجماع قیاس) سے حاصل ہو

رہی ہے (تصدیق)، کا نام فقہ ہے۔

- ماخذ فقہ: کتاب اللہ، سنّت رسول اللہ اجماع امّت اور قیاس ہے۔
- موضوع فقہ: مکلّف کا فعل اس لحاظ سے کہ یہ صحیح ہے یا فرض یا واجب یا حلال یا حرام وغیرہ۔
- غرض و غایت: دین و دنیا میں سعادت اور فلاح و بہبودی۔

واضع علم فقہ: امام عالی مقام سراج الامّت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں

آپ کی تاریخ پیدائش کوفہ میں ۸۰ھ میں ہوئی اور سن وفات ۱۵۰ھ ہے۔ آپ حضرت حماد بن سلیمان المتوفی ۱۲۰ھ کے شاگرد ہیں۔ حضرت حماد نے ابراہیم نخعی المتوفی ۹۶ھ سے تعلیم پائی جو علقمہ بن قیس المتوفی ۶۵ھ کے شاگرد تھے۔ علقمہ براہِ راست حضرت عبداللہ بن مسعود المتوفی ۳۲ھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ تابعی ہیں اور ائمہ اربعہ (مالک، شافعی، احمد) سے یہ شرافت صرف ابوحنیفہ کو ہی حاصل ہے۔ آپ نے متعدد صحابہ کرام سے ملاقات کی اور ان سے علمی طور پر استفادہ کیا۔ مثلاً حضرت انس بن مالک المتوفی ۹۳ھ، عبداللہ بن ابی اوفی المتوفی ۸۷ھ، واثلہ بن الاسقع المتوفی ۸۵ھ، سہل بن ساعد المتوفی ۸۸ھ اور عامر بن واثلہ المتوفی ۱۰۲ھ وغیرہ۔ (المناقب للمکی ص۲۴ جلد ۱ و خیرات الاحسان ص۲۲ و تبییض الصحیفہ ص۶ للسیوطی)

انہ من التابعین رأی انسا غیر مرۃ لما قدم الکوفۃ و ھذا ھو الصحیح الذی لیس ماسواہ الا غلطاً و قد نص علیہ الخطیب البغدادی والدارقطنی و ابن الجوزی والنووی والذھبی و ابن حجر المکی والسیوطی و غیرھم من اجلۃ المحدثین۔

صحیح یہی بات ہے کہ امام ابوحنیفہ تابعین سے ہیں۔ اس کے سوا غلط ہے۔ آپ نے حضرت

انس رضی اللہ عنہ کو متعدد مرتبہ دیکھا ہے اس کی ان محدثین نے تصریح کی ہے۔ خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۳ھ، دار قطنی المتوفی ۳۸۵ھ، ابن جوزی المتوفی ۵۹۷ھ، محی الدین نووی المتوفی ۶۷۶ھ بغدادی

، حافظ شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ، ابن حجر مکّی المتوفی ۹۷۳ھ
امام جلال الدین سیوطی شافعی المتوفی ۹۱۱ھ وغیرہم اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ سے جب پوچھا گیا تو کہا کہ امام ابوحنیفہ تابعی ہیں۔

علامہ ابوالحسن علی ابن الاثیر المتوفی ۶۳۰ھ اور ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ تابعی ہیں۔ آپ کے تابعی ہونے کا انکار محض تعصب پر مبنی ہے۔ ملک معظم عیسٰی بن ابوبکر الیوبی نے اپنی کتاب "السہم المصیب فی کبد الخطیب" میں بیان کیا ہے کہ ابوحنیفہ کی جرح و قدح پر مشتمل تمام روایات جھوٹی ہیں۔

ابن حجر مکّی فرماتے ہیں کہ امام اعمش سلیمان بن مہران کرخی جو کہ اجلّہ تابعین اور تمام حدیث کے اساتذہ الاساتذہ ہیں۔ المتوفی ۱۴۸ھ سے کسی شخص نے کچھ مسائل پوچھے ہمارے امام اعظم اس زمانہ میں حضرت اعمش سے حدیث پڑھتے تھے۔ اعمش نے وہ مسائل ابوحنیفہ سے پوچھے۔ امام اعظم نے فوراً جواب دیئے۔ امام اعمش نے کہا: یہ جواب آپ نے کہاں سے پیدا کیے تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا ان حدیثوں سے جو خود میں نے آپ ہی سے سُنی ہیں اور وہ حدیثیں مع سند روایت فرمادیں۔ امام اعمش نے کہا جو حدیثیں میں نے سو دن میں آپ کو سُنائیں آپ گھڑی بھر میں مجھے سُنا دیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان حدیثوں میں یوں عمل کرتے ہیں۔

یا معشر الفقہاء انتم الاطباء ونحن الصیادلۃ و انت ایھا الرجل اخذت بکلا الطرفین۔

اے فقہ والو تم طبیب ہو اور ہم محدث لوگ عطار ہیں اور اے ابوحنیفہ

تم نے تو فقہ و حدیث کے دونوں کنارے لیے۔ (صفائح اللجین ص ۲۶)

امام ابن حجر مکی شافعی نے "خیرات الاحسان" میں اور رئیس الحنیفہ ملّا علی القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ نے "مسلک المتقسط" میں بیان کیا ہے کہ امام مستقل مجتہد مطلق سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۲۰۴ھ نے جب امام اعظم ابوحنیفہ کے مزار اقدس پر صبح کی نماز پڑھائی تو امام شافعی نے نہ بلند آواز سے بسم اللہ پڑھی اور نہ رفع یدین کیا نہ قنوت پڑھی۔ کسی نے سبب پوچھا:

فرمایا ان صاحب قبر کے ادب کی وجہ سے قاضی عیاض بن عمرو بن موسیٰ المتوفی ۵۴۴ھ نے ترتیب المدارک میں نقل کیا ہے۔ مدینہ منورہ میں ایک روز امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ اور ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی۔ جب امام مالک مجلس سے باہر نکلے تو بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ لیث بن سعد المتوفی ۱۷۵ھ نے کہا آپ کا پسینہ بہہ رہا ہے۔ امام مالک نے کہا ابوحنیفہ سے مل کر مجھے پسینہ آگیا۔ ان کے عالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

الناس عیال فی الفقہ علی ابی حنیفہ

لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔

امام احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ پہلے قاضی القضاۃ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم المتوفی ۱۸۲ھ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ امام ابو یوسف، امام ابوحنیفہ کے تلمیذ رشید ہیں۔ امام احمد کا مقولہ ہے:

"میں نے قاضی ابو یوسف سے تین سال میں اس قدر معلومات جمع کیں جن سے تین الماریاں بھر جائیں"۔ امام احمد نے محمد بن حسن الشیبانی المتوفی ۱۸۹ھ شاگرد ابوحنیفہ کی کتب سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جب امام احمد سے دریافت کیا گیا کہ یہ علمی

جوابات آپ نے کہاں سے سیکھے تو فرمایا محمد بن حسن کی تصنیفات سے گویا کہ امام احمد امام ابو حنیفہ کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ یحیٰی بن معین المتوفی ۲۳۳ھ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک فقہ حقیقتاً ابو حنیفہ کی فقہ ہے۔ عبداللہ بن مبارک بن واضح المتوفی ۱۸۲ھ جو کہ امام احمد کے اساتذہ سے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ جیسا میں نے فقہ میں کوئی نہیں دیکھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ امام صاحب کے شیوخ میں سے سب سے ممتاز شخصیت حضرت حماد بن سلیمان المتوفی ۱۲۰ھ کی ہے۔ انہوں نے ابراہیم نخعی سے علم فقہ حاصل کیا۔ اس بنا پر وہ ابراہیم نخعی کے ہی شاگرد نہیں تھے بلکہ ساتھ ساتھ امام شعبی المتوفی ۱۰۴ھ کے علوم کے بھی حامل سمجھے جاتے تھے اور ابراہیم نخعی اور شعبی نے علقمہ بن قیس اور مسروق بن الاجرع ہمدانی المتوفی ۶۳ھ سے تحصیل علم کی تھی اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود اور علی بن ابی طالب المتوفی ۴۰ھ سے براہِ راست استفادہ کیا تھا۔ جن کے علوم کے اہلِ کوفہ وارث سمجھے جاتے تھے۔ ان ہر دو صحابہ اور ان کے تلامذہ کے فتاویٰ ہی پر کوفی فقہ کی عمارت قائم تھی۔ حضرت امام ابو حنیفہ اٹھارہ[۱۸] سال تک حماد سے استفادہ کرتے رہے اور حضرت حماد سے جو علوم حاصل کیے وہ دراصل حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود کی فقہ کا جوہر اور خلاصہ تھا۔

شاہ ولی اللہ کا مبالغہ

شاہ ولی اللہ المتوفی ۱۱۷۶ھ حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل ص ۱۴۶ میں لکھتے ہیں کہ فقہ حنفی کا اصل سرچشمہ ابراہیم نخعی کے ہی اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی کے مذہب کے پابند تھے۔ شاہ ولی اللہ کی اس تصریح میں مبالغہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے صرف ان فقہاء پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمۂ اہل بیت کرام سے ذوق و شوق اور عقیدت کے ساتھ اخذ و استفادہ کیا بلکہ اہل بیت کی محبت و حمایت میں متعدد مرتبہ قابل تحسین موقف اختیار کیا جس کی بنا پر سن کہولت میں حکومت کی طرف سے عتاب نازل ہوا اور آخر کار حق کے

۱؎ ابو حنیفہ کے چار ہزار استاد مشہور ہیں جن سے آپ نے علم حدیث کی تحصیل کی ہے۔ ۱۲۔

ساتھ تمسک اور نہایت بے نیازی کی حالت میں عترت نبوی کی محبت میں مقام شہادت حاصل کیا
ائمۂ اہل بیت سے زید بن علی امام زین العابدین رضی اللہ تعالی عنہ المتوفی ۱۲۲ھ کے پاس امام ابوحنیفہ
متواتر دو سال تک اخذ علوم کرتے رہے۔ چنانچہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ علم میں
ان کی کوئی مثال نہیں تھی۔ امام ابوحنیفہ کا امام محمد الباقر بن علی زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ علمی
طور پر ربط اور تعلق تھا۔ امام باقر نے چونکہ علم وفضل میں بہت زیادہ وسعت حاصل کر لی تھی اس لیے
یہ باقر کے لقب سے مشہور ہوئے۔ امام باقر علیہ السلام نے ۱۱۴ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع
میں دفن ہوئے۔

امام ابوحنیفہ کا امام باقر کے ساتھ جو علمی رابطہ قائم ہوگیا تھا وہی رابطہ امام صاحب نے ان کے
صاحبزادے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بدستور قائم رکھا۔ علماء نے امام جعفر صادق کو
امام ابوحنیفہ کے شیوخ میں شامل کیا ہے۔ امام جعفر صادق ۱۴۸ھ میں فوت ہوئے اور جنت البقیع
میں دفن ہوئے۔ امام جعفر صادق کے پانچ لڑکے ہوئے:

موسیٰ کاظم، اسماعیل، علی العریضی، محمد المامون، اسحاق۔

امام جعفر صادق کے لڑکے جو محمد المامون ہیں ان کی نسل پاک سے محی الملۃ مقیم السنۃ
قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین غوث زماں مجدد دوراں امیر الملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب
محدث علی پوری قدس سرہ العزیز ہیں (المتوفی ۱۳۷۰ھ) حافظ ابن حجر مکی لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کو ابو محمد عبد اللہ
بن حسن بن حسن المتوفی ۱۴۵ھ کے ساتھ بھی شرف تلمذ حاصل تھا حضرت سفیان ثوری المتوفی
۱۶۱ھ اور حضرت امام مالک نے ان سے روایت لی ہے۔ معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ صرف نخعی
کے پابند نہ تھے بلکہ ایمۂ اہل بیت اطہار سے بھی کافی حد تک استفادہ کرتے رہے۔

امام صاحب کے تین اہم اصول

۱- امام ابوحنیفہ مستحق طلباء کی امداد کرتے۔ حوائج کے پورا کرنے میں ان کی اعانت کرتے بلکہ

جسے اپنے شاگرد بناتے اسے پیٹ کے دھندوں سے بے نیاز کر دیتے ۔ حتیٰ کہ اُس کے اہل و عیال کے جملہ اخراجات کا بوجھ اپنے ذمے لے لیتے ۔

۲۔ اپنے تلامذہ کی ذہنی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے ۔ جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ علم کی وجہ سے اس میں احساس برتری اور گھمنڈ پیدا ہو رہا ہے تو اس کا امتحان لینا شروع کر دیتے ۔ یہاں تک کہ خود نمائی اور تعلّی کی عادت کو وہ چھوڑ دیتا اور یقین کر لیتا کہ اسے ابھی تعلیم کی ضرورت ہے ۔

امام ابو یوسف کا امتحان

روایت ہے کہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد ابو یوسف کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا کہ میں خود کیوں نہ اپنا حلقہ درس قائم کر کے الگ بیٹھ جاؤں ۔

امام ابو حنیفہ نے اپنے ایک تلمیذ سے کہا کہ ابو یوسف کی مجلس میں جاؤ اور ان سے مسئلہ دریافت کرو کہ ایک شخص نے رنگریز کو دو درہم کی مزدوری پر رنگنے کے لیے کپڑا دیا ۔ جب اُس شخص نے کپڑا طلب کیا تو رنگریز نے انکار کر دیا ۔ پھر اس کے دوبارہ مطالبے پر رنگریز نے رنگا ہوا کپڑا دے دیا ۔ بتایئے وہ رنگریز اجرت کا حقدار ہو سکتا ہے ۔ اگر وہ اثبات میں جواب دیں تو کہنا کہ غلط ہے ۔ اگر وہ نفی میں جواب دیں تو بھی کہنا کہ آپ غلط فرماتے ہیں ۔

چنانچہ وہ شخص ابو یوسف کے پاس گیا اور ان سے مسئلہ دریافت کیا ۔

امام یوسف نے کہا : ہاں وہ اجرت کا مستحق ہے ۔ اس پر سائل نے جب ٹوکا تو کچھ دیر سوچ کر کہنے لگے : ہاں ٹھیک ہے وہ اجرت کا مستحق نہیں ۔ اس پر سائل نے جرح کی تو اس وقت اٹھ کر حضرت ابو حنیفہ کی مجلس میں پہنچے ۔

ابو حنیفہ نے فرمایا : قصار (رنگریز) مسئلہ لایا ہو گا ۔ ابو یوسف نے کہا ہاں مجھے یہ مسئلہ بتایئے ۔ امام صاحب نے کہا اگر اس نے کپڑا غصب کر لینے کے بعد اسے رنگ دیا ہے تو وہ اجرت کا مستحق نہیں اور اگر غصب سے پہلے رنگ کر دیا ہے

بلاشبہ وہ اُجرت کا مستحق ہے کیونکہ اس نے کپڑے کے ایک مالک کے لیے اسے رنگا ہے۔

۳۔ جو طالب علم فارغ ہو کر جانا چاہتا یا جس کے متعلق امام صاحب کو توقع ہوتی کہ یہ کچھ کام کا آدمی بنے گا تو اسے نصیحت فرماتے۔ چنانچہ شاگردوں سے یہاں تک فرما دیتے کہ تم میرے غم کی دوا اور دل کی مسرت ہو۔ (امام ابوحنیفہ، محمد ابوزہرہ ص۱۴۶)

فقہ کے چھ دَور

علامہ خضری لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے لے کر آج تک فقہ پر کتنے دور گزرے؟ اس سوال پر جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہمیں چھ دَور بڑے اہم نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کے اجتہاد اور فتویٰ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

۱۔ فقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں درحقیقت یہی دور فقہ کی اصل اور بنیاد ہے۔ تمام فقہاء نے متفقہ طور پر اسے مستند قرار دیا ہے۔

۲۔ کبار صحابہ کا دور جو خلافت راشدہ کے دور پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دور ۱۱ھ سے ۴۰ھ تک ہے۔ اس دور کے مشہور فتویٰ صادر کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق المتوفی ۱۳ھ، حضرت عمر فاروق المتوفی ۲۳ھ، حضرت عثمان غنی المتوفی ۳۵ھ حضرت علی المتوفی ۴۰ھ، حضرت ابوعبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعری المتوفی ۴۴ھ اور معاذ بن جبل المتوفی ۱۸ھ اور ابی بن کعب المتوفی ۱۹ھ، زید بن ثابت المتوفی ۴۵ھ تھے جن میں کثرت سے فتویٰ دینے والے حضرت عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت تھے۔ یہ فتوے خاص طور پر فرائض کے متعلق تھے۔

۳۔ صغار صحابہ اور تابعین کا دور ہے۔ یہ دور حضرت معاویہ بن ابی سفیان المتوفی ۶۰ھ کی حکومت

کے زمانہ یعنی ۷۳ھ سے اس وقت تک کا ہے جب کہ دولت عربیہ میں قرن ثانی کی ابتداء میں ضعف کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس تیسرے دور کے مفتی اور فقہاء یہ ہیں:

مدینہ منوّرہ کے مفتی

۱۔ حضرت عائشہ صدّیقہ بنت ابوبکر الصدیق المتوفاۃ سنہ ۵۷ھ

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر المتوفی سنہ ۷۳ھ

۳۔ ابوہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر المتوفی سنہ ۵۸ھ

۴۔ حضرت سعید بن المسیب المخزومی المتوفی سنہ ۹۴ھ

۵۔ عروہ بن زبیر بن عوام اسدی المتوفی سنہ ۹۴ھ

۶۔ حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام المتوفی سنہ ۹۴ھ

۷۔ حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) المتوفی سنہ ۹۴ھ

۸۔ حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود المتوفی سنہ ۹۸ھ

۹۔ حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر المتوفی سنہ ۱۰۶ھ

۱۰۔ سلیمان بن یسار المتوفی سنہ ۱۰۷ھ

۱۱۔ حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر المتوفی سنہ ۱۰۶ھ

۱۲۔ حضرت نافع المتوفی سنہ ۱۱۷ھ (مولیٰ ابن عمر)

۱۳۔ حضرت محمد بن مسلم المعروف بہ ابن شہاب زہری المتوفی سنہ ۱۲۴ھ

۱۴۔ ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان المتوفی سنہ ۱۳۱ھ

۱۵۔ حضرت ابوجعفر بن محمد بن علی بن حسین (امام باقر علیہ السلام) المتوفی سنہ ۱۱۴ھ

۱۶۔ حضرت یحییٰ بن سعید انصاری المتوفی سنہ ۱۴۳ھ

۱۷۔ حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن فروخ المتوفی سنہ ۱۳۶ھ

مکہ معظمہ کے مفتی اور فقہا

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس المتوفی ۶۸ھ

۲۔ مجاہد بن جبر المتوفی ۱۰۳ھ (حضرت ابن عباس کے شاگرد)

۳۔ حضرت عکرمہ (مولی ابن عباس) المتوفی ۱۰۷ھ

۴۔ حضرت عطا بن ابی رباح المتوفی ۱۱۴ھ

۵۔ حضرت حکیم بن حزام کے مولی ابوالزبیر محمد بن مسلم المتوفی ۱۲۷ھ

کوفہ کے فقہاء اور مفتی

۱۔ علقمہ بن قیس نخعی المتوفی ۶۲، ۶۵ھ

۲۔ حضرت مسروق بن اجدع الہمدانی المتوفی ۶۳ھ

۳۔ حضرت عبیدہ بن عمرو سلمانی مرادی المتوفی ۹۲ھ

۴۔ حضرت اسود بن یزید نخعی المتوفی ۷۵ھ (ابن مسعود کے شاگرد ہیں)

۵۔ حضرت شریح بن حارث کندی المتوفی ۸۰ھ

۶۔ حضرت ابراہیم بن یزید نخعی المتوفی ۹۵، ۹۶ھ

۷۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ (حجاج[1] بن یوسف نے ان کو شہید کیا تھا) المتوفی ۹۵ھ

۸۔ حضرت عامر بن شراحیل شعبی تابعی المتوفی ۱۰۳ھ

مفتیان بصرہ

۱۔ حضرت انس بن مالک انصاری خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتوفی ۱۱ھ

---

[1] حجاج بن یوسف الثقفی المتوفی ۹۵ھ ۱۲ عینی ۱۲

۲۔ حضرت ابو العالیہ رفیع بن مہران ریاحی المتوفی ۹۰ھ
۳۔ حضرت حسن بصری المتوفی ۱۱۰ھ
۴۔ حضرت ابو الشعثا جابر بن زید المتوفی ۹۳ھ
۵۔ حضرت محمد بن سیرین المتوفی ۱۱۰ھ
۶۔ حضرت قتادہ بن دعامہ دوسی (حافظہ قوی تھا نابینا تھے) المتوفی ۱۱۸ھ

مفتیان و فقہاء شام

۱۔ حضرت عبدالرحمن بن غنم اشعری المتوفی ۷۸ھ
۲۔ حضرت ابو ادریس خولانی المتوفی ۸۰ھ
۳۔ حضرت قبیصہ بن ذویب المتوفی ۸۶ھ
۴۔ حضرت مکحول بن ابی مسلم المتوفی ۱۱۳ھ (صحابہ پر تدلیس کرتے تھے)
۵۔ حضرت رجاء بن حیواۃ کندی المتوفی ۱۱۲ھ
۶۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز بن مروان المتوفی ۱۰۱ھ ۔ بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے ۔ حضرت انس بن مالک اور اکثر تابعین سے علم حاصل کیا ۔

مفتیان مصر

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص المتوفی ۶۵ھ
۲۔ ابو الخیر مرشد بن عبداللہ المتوفی ۹۰ھ (حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد تھے)
۳۔ یزید بن ابی حبیب المتوفی ۱۲۸ھ

مفتیان و فقہاء یمن

۱۔ حضرت طاؤس بن کیسان جندی المتوفی ۱۰۶ھ زید بن ثابت و عائشہ صدیقہ و ابوہریرہ سے احادیث کا سماع کیا۔

۲۔ حضرت وہب بن منبہ صنعانی تابعی المتوفی ۱۱۴ھ

۳۔ حضرت یحییٰ بن کثیر مولی طے المتوفی ۱۲۹ھ

۴۔ **چوتھا دور** دوسری صدی کی ابتداء سے چوتھی صدی کے نصف تک کی فقہ اور یہی زمانہ احادیث اور فقہ کی تدوین اور ان بڑے ائمہ کے ظہور کا زمانہ ہے جن کی قیادت کا جمہور نے اعتراف کیا ہے۔ اس دور میں فقہ ایک باقاعدہ علم بن چکا تھا۔ چوتھے دور کے کوفہ کے عظیم فقہاء یہ ہیں:

۱۔ سفیان بن سعید ثوری المتوفی ۱۶۱ھ

۲۔ شریک بن عبداللہ نخعی المتوفی ۱۷۷ھ

۳۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ المتوفی ۱۴۸ھ

اسی دور کے امام ابوحنیفہ کے شاگرد ابویوسف یعقوب بن ابراہیم اور محمد بن حسن بن فرقد شیبانی اور حسن بن زیاد لوءلوئی المتوفی ۲۰۴ھ ہیں۔ انہی سے عراقیہ کا مذہب پھیلا اور اسی دور سے ابوحنیفہ کے اصحاب کے وہ شاگرد جنہوں نے ان کی کتابیں نقل کیں، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ ابراہیم بن رستم مروزی المتوفی ۲۱۱ھ

۲۔ احمد بن حفص کبیر بخاری امام محمد کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے امام محمد کی کتاب "الآثار" کو روایت کیا ہے ۲۱۷ھ ہے۔ ۱۲

۳۔ بشر بن غیاث مریسی المتوفی ۲۲۸ھ ابویوسف کے شاگرد ہیں

۴۔ بشر بن ولید کندی المتوفی ۲۳۸ھ

۵۔ قاضی عیسیٰ بن ابان بن صدقہ المتوفی ۲۲۱ھ

۶۔ محمد بن سماعہ تمیمی المتوفی ۲۳۳ھ

۷۔ محمد بن شجاع ثلجی المتوفی ۲۶۷ھ ۔ حسن بن زیاد کے شاگرد ہیں اعتزالیہ کی طرف میلان تھے

۸۔ ابو سلیمان موسیٰ بن سلیمان جوزجانی المتوفی ۲۰۰ھ

۹۔ ہلال بن یحییٰ بن مسلم البصری المتوفی ۲۴۵ھ

۱۰۔ ابو جعفر احمد بن عمران قاضی المتوفی ۲۸۰ھ ۔ یہ امام طحاوی کے استاذ ہیں ۔

۱۱۔ احمد بن عمر حصاف المتوفی ۲۶۱ھ

۱۲۔ بکار بن قتیبہ بن اسد القاضی مصری المتوفی ۲۹۰ھ

۱۳۔ ابو حازم عبد الحمید بن عبد العزیز المتوفی ۲۹۲ھ

۱۴۔ ابو سعید احمد بن حسین واقعہ قرامطہ حجاج کے ساتھ ۳۱۷ھ میں شہید ہوئے ۔

۱۵۔ امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ ۔ پہلے پہل اپنے ماموں اسماعیل بن یحییٰ المزنی المتوفی ۲۶۴ھ جو کہ امام شافعی کے شاگرد تھے ، سے فقہ کی تعلیم حاصل کی مگر ساتھ ہی فقہ عراقی کا کافی مطالعہ رکھتے تھے ۔ آخر میں اسی کی جانب متوجہ ہوئے ۔ طحاوی نے عراقی فقہ ابو حازم عبد الحمید قاضی سے حاصل کی جو عیسی بن ابان المتوفی ۲۲۱ھ تلمیذ امام محمد کے شاگرد تھے ۔ امام طحاوی نے حنفی فقہ پر توجہ مرکوز کی ۔ اس لیے حنفی فقہ کے مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں ۔ امام طحاوی کی تصنیفات احکام القرآن ، کتاب معانی الآثار ، مشکل الآثار ، المختصر ، شرح جامع الصغیر ، شرح جامع الکبیر ، کتاب شروط الکبیر والصغیر والاوسط ، المحاضرات والسجلات ، الوصایا والفرائض ، حکم اراضی مکہ ، قسم الفئی والغنائم وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

۵۔ پانچواں دور چوتھی صدی کی ابتداء سے سلطنت عباسیہ کے زوال تک کا زمانہ ہے

اس دور میں فقہ بحث و تمحیص کا زمانہ بن گیا جو مسائل ائمۂ مجتہدین سے حاصل کیے گئے تھے ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے مناظرے اسی دور سے شروع ہوئے۔ اسی زمانہ میں فقہ پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں اور بے شمار مسائل کا حل تلاش کیا گیا۔ یہ دور اس وقت ختم ہوا جب خلافت بنو عباس دم توڑ رہی تھی اور بغداد میں تاتاری غارتگری کا فتنہ سر اٹھا رہا تھا۔

اس پانچویں دور کے علمائے حنفیہ کے عظیم فقہاء و مفتیان عظام کے نام یہ ہیں :

۱۔ رئیس الحنفیہ ابوالحسن عبید اللہ بن حسن کرخی المتوفی ۳۴۰ھ جامع صغیر اور جامع کبیر جو کہ امام محمد کی کتابیں ہیں ان کی ابوالحسن کرخی نے شرحیں تحریر فرمائی ہیں۔

۲۔ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص (کرخی کے شاگرد) المتوفی ۳۷۰ھ جصاص نے مختصر کرخی اور مختصر طحاوی اور امام محمد کی جامع کی شرحیں لکھی ہیں۔

۳۔ ابوجعفر محمد بن عبد اللہ بلخی ہندوانی ابوحنیفہ صغیر المتوفی ۳۶۲ھ

۴۔ ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی (امام ہدیٰ)، (ہندوانی کے شاگرد) المتوفی ۳۷۳ھ نوازل اور عیون اور فتاویٰ خزانۃ الفقہ اور شرح جامع صغیر لکھی۔

۵۔ ابوعبداللہ یوسف بن محمد جرجانی (کرخی کے شاگرد) المتوفی ۳۹۸ھ خزانۃ الاکمل چھ جلدوں میں اور زیادات اور جامع کبیر اور مختصر کی شرحیں لکھیں حاکم شہید محمد بن محمد المتوفی ۳۳۴ھ کی کافی سے لے کر اور جامعین زیادات مجرد اور منتقی اور مختصر کرخی اور شرح طحاوی اور عیون المسائل تمام کے مسائل کو خزانۃ اکمل میں جمع کیا۔

۶۔ ابوالحسن احمد بن محمد قدوری بغدادی المتوفی ۴۲۸ھ۔ قدوری کے علاوہ کتاب التجرید اور مختصر کرخی کی شرح لکھی اور شیخ ابوحامد اسفرائینی شافعی المتوفی ۴۰۸ھ سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔

۷۔ ابوزید عبداللہ بن عمر سمرقندی المتوفی ۴۳۰ھ۔ تمام سے پہلے علم الاختلاف کی بنیاد رکھی۔ ایک عظیم تصنیف "الاسرار" ہے اور نظم فی الفتاویٰ اور کتاب

"تقویم ادلہ" بھی ہے۔

۸۔ ابوعبداللہ حسین بن علی المتوفی ۴۳۶ھ

۹۔ ابوبکر خواہرزادہ محمد بن حسین بخاری المتوفی ۴۳۳ھ علماء ماوراالنہر سے تھے۔
مختصر، تجنیس اور مبسوط، تحریر کیں۔

۱۰۔ شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد حلوانی المتوفی ۴۴۸ھ مبسوط تحریر فرمائی۔

۱۱۔ شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی المتوفی سنہ ۵۰۰ھ (شاگرد حلوانی) مشہور کتاب مبسوط جند کے ایک کنوئیں میں قید کی حالت میں تحریر کروائی جس کے پندرہ اجزاء[1] تھے۔ خاقان شاہ کو ایک نصیحت کرنے کی وجہ سے قید میں پہنچے۔ شاگرد کنوئیں پر بیٹھ جاتے، تحریر کرواتے جاتے تھے۔ اصول فقہ میں ان کی ایک کتاب "سیر کبیر" کی شرح ہے اور مختصر طحاوی کی شرح لکھی۔ ان کی مبسوط در اصل کافی کی شرح ہے جو حاکم شہید نے لکھی ہے۔

۱۲۔ ابوعبداللہ محمد بن علی المتوفی سنہ [illegible]ھ (یہ قدوری کے شاگرد تھے) عراق میں ریاست حنفیہ ان پر ختم ہوئی۔

۱۳۔ فخرالاسلام علی بن محمد بزدوی المتوفی ۴۸۲ھ۔ گیارہ جلدوں میں مبسوط لکھی۔ جامع کبیر و جامع صغیر کی شرح لکھی۔ "اصول بزدوی" کے مصنف ہیں۔ فقہ کی ایک کتاب "غناء الفقہاء" بھی تحریر فرمائی ہے۔

۱۴۔ شمس الائمہ بکر بن محمد المتوفی ۵۱۲ھ (حلوانی کے شاگرد ہیں) حفاظت مذہب میں ضرب المثل تھے۔

۱۵۔ ابواسحاق ابراہیم بن اسماعیل المتوفی ۵۳۴ھ (قاضی خاں کے استاد تھے)

۱۶۔ طاہر بن احمد بن عبدالرشید بخاری المتوفی ۵۴۲ھ ماوراءالنہر میں مذہب امام ابوحنیفہ

---

[1] ہمارے کتب خانہ (علی پور شریف) میں مبسوط کے تیس ۳۰ اجزاء ہیں۔ ۱۲

کے عظیم شیخ ہیں۔ آپ کی تصنیفات سے "خلاصۃ الفتاوٰی" اور "خزانۃ الواقعات" ہیں۔

۱۷۔ ظہیر الدین عبد الرشید بن ابی حنیفہ بن عبد الرزاق والوالجی المتوفی ۵۴۰ھ "فتاوٰی والوالجیہ" کے مصنف ہیں۔

۱۸۔ ابو بکر بن مسعود بن احمد ملک العلماء کاسانی المتوفی ۵۸۷ھ "کتاب بدائع کے مؤلف ہیں۔ کتاب تحفۃ الفقہاء کی شرح لکھی ہے۔

۱۹۔ فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی فرغانی المتوفی ۵۹۳ھ۔ قاضی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔ "فتاوٰی قاضی خاں" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ "واقعات"، "امالی"، "محاضرات" آپ کی تصانیف ہیں۔ زیادات جامع صغیر اور ادب القضاۃ مصنفہ خصاف کی شرحیں لکھیں اور قاسم بن قطلوبغا المتوفی ۸۷۹ھ نے قدوری کی تصحیح میں لکھا ہے کہ قاضی خاں کی تصحیح دوسروں کی تصحیح پر مقدم ہے۔

۲۰۔ علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل فرغانی مرغینانی صاحب ہدایہ المتوفی ۵۹۳ھ ہدایہ کے علاوہ کتاب منتقی، نشر المذہب، تجنیس، مناسک الحج، مختارات، کتاب الفرائض تحریر فرمائی ہیں۔

۶۔ چھٹا دور بغداد کی فتح سے (جو ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوئی) اب تک ہے۔ اس چھٹے دور کے عظیم فقہاءِ احناف سے علامہ الشیخ ابن الہمام محمد بن عبد الواحد السکندری المتوفی ۸۶۱ھ اور شوافع سے علامہ جلال الدین سیوطی الشافعی ہیں۔

طبقاتِ فقہاء

احکام فرعیہ اور مسائل جزئیہ کا ادلہ کلیہ (اربعہ) کتاب اللہ، سنّت رسول اللہ، اجماع امت، قیاس سے انتہائی کوشش کے ساتھ استخراج کرنا اجتہاد ہے۔ جو اجتہاد

کرے وہ مجتہد ہے ۔ اگر مجتہد ادلہ اربعہ سے مسائل کی تخریج کر سکتا ہو اور ہر قسم کی دلیل اسے بالتفصیل معلوم ہو تو اسے مجتہد مطلق کہتے ہیں اور مجتہد مطلق کے لیے چھ چیزوں کا علم ضروری ہے :

۱۔ قرآن و تفسیر ۔

۲۔ حدیث و سنت کا علم ۔ قرآن اور سنت کے علم میں یہ بھی لازم ہے کہ عام ، خاص ، مطلق ، مقید ، مجمل ، مفصل ، ناسخ ، منسوخ ۔ حدیث کی تمام اقسام اور جرح و تعدیل سے بھی واقف ہو ۔

۳۔ صحابہ اور ان کے بعد کے اجماعی اور اختلافی مسائل کا بھی علم ہو

۴۔ علم لغت ، نحو ، بیان ، معانی ، بدیع وغیرہ کا بھی ماہر ہو ۔

۵۔ قیاس اور قیاس کے احکام و اقسام ، صحیح اور فاسد کے درمیان تمیز اور طریقہ استنباط کو بھی جانتا ہو ۔

۶۔ عقائد اور کلیات سے بھی آگاہ ہو ۔

صاحب در مختار فرماتے ہیں مجتہد مطلق کا وجود ختم ہو گیا ہے ۔ علامہ نووی شافعی اور علامہ رافعی شافعی المتوفی سنہ ۶۲۳ھ نے مجتہد کی دو قسمیں بیان کی ہیں :

۱۔ مجتہد مستقل ۔

۲۔ مجتہد منتسب ۔

مجتہد مستقل تقلید نہیں کرتا اور مجتہد منتسب کے لیے ضروری ہے کہ علم حدیث فقہ کا جامع اور جو اس کے اساتذہ و شیوخ سے مروی ہے اور اصول فقہ کا بھی خوب واقف ہو ۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مجتہد کی تیسری قسم مجتہد فی المذہب ہے ۔ یہ اپنے شیخ کا ان تمام احکام میں جن کی وہ تشریح کر چکا ہے مقلد ہوتا ہے ۔ جس وقت کوئی نیا واقعہ اس کو درپیش آئے تو شیخ کے پیش کردہ اصول اور مذہب کے مطابق وہ اجتہاد اور مسئلہ نکالتا ہے ۔ اسی لیے ایسے مجتہد کو اہل تخریج سے شمار کیا گیا ہے ۔ بعض نے کہا ہے

بعض نے کہا ہے کہ چوتھی قسم مجتہد فی الفتویٰ کی ہے۔ یہ اپنے شیخ کے مذہب میں مہارتِ تامہ رکھتا ہے اور اپنے مذہب کی کتابوں پر اسے عبور حاصل ہوتا ہے۔ ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح بھی دے سکتا ہے اس کو متبحر فی المذہب بھی کہتے ہیں۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ مفتی مجتہد ہوتا ہے اور جو مجتہد نہیں لیکن مجتہد کے اقوال اسے یاد ہیں اور ان کو نقل کرتا ہے اس کو مفتی نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کی حیثیت صرف ناقل کی ہے (اگر ناقل کو مفتی کہا جاتا ہے تو مجازاً)، علامہ احمد بن سلیمان بن کمال الرومی المتوفی سنہ ۹۴۰ھ نے فقہاء کرام کو سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ مجتہد فی الشرع خود قواعد کی اساس رکھتے ہیں اور مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ اصول اور فروع میں تقلید نہیں کرتے مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد۔

۲۔ مجتہد فی المذہب یہ ان قواعد پر استنباط کرتے ہیں جو امام ابوحنیفہ نے بیان کیے ہیں۔ فروع میں اختلاف کرتے ہیں مثلاً امام ابویوسف، امام محمد۔

۳۔ مجتہد فی المسئلہ۔ یہ لوگ نہ اصول میں اختلاف کرتے ہیں اور نہ ہی فروع میں لیکن مسائل کا استنباط ان اصول کے مطابق کرتے ہیں جو امام نے متعین کیے ہیں۔ بشرطیکہ جن مسائل میں امام سے نص اور روایت نہیں ہے۔ مثلاً امام خصاف ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی، شمس الائمہ سرخسی، شمس الائمہ حلوانی، فخرالاسلام بزدوی، قاضی خان وغیرہ۔

۴۔ اصحاب تخریج۔ یہ مقلد ہیں، قول مجمل کی تعریف کرتے ہیں اور اجتہاد پر قادر نہیں ہیں۔ اصول اور ضبط ماخذ کی وجہ سے قول "مبہم" کی تشریح کر سکتے ہیں۔ ہدایہ میں جو تخریج رازی کا ذکر ہے۔ اس سے یہی تخریج مراد ہے جیسا کہ ابوبکر احمد بن علی الرازی المتوفی سنہ ۳۷۰ھ وغیرہ۔ یہ اصحاب تخریج سے ہیں۔

۵۔ اصحاب ترجیح، بعض روایات کی فضیلت بیان کرتے ہیں کہ یہ قول اولیٰ ہے اور اصح ہے یہ صحیح ہے۔ یہ عوام الناس کے لیے مفید ترین ہے مثلاً قدوری صاحب ہدایہ وغیرہ۔

۶۔ یہ بھی مقلدین۔ یہ صرف قوی اور ضعیف اور ظاہر مذہب، ظاہر روایت، نادر روایت

وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابوالبرکات حافظ الدین، عبداللہ بن احمد نسفی المتوفی ۷۱۰ھ۔ صاحب کنزالدقائق اور ابوالفضل مجدالدین، عبداللہ بن محمود الموصلی المتوفی ۶۸۳ھ صاحب المختار۔ اور احمد بن علی بغدادی المتوفی ۶۹۴ھ صاحب المجمع وغیرہ

۷۔ یہ وہ مقلد ہیں جو روایات کے درمیان تمیز کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

طبقات فقہاء کی یہی تقسیم جس کو ابن کمال نے بیان کیا ہے۔ لوگوں کے درمیان مشہور ہو چکی ہے۔ اسی کو عمر بن عمر المصری المتوفی ۱۰۷۹ھ نے بھی بیان کیا ہے۔

فائدہ صاحب کنزالدقائق بھی نسفی ہیں۔ ایک اور عمر نامی نسفی ہیں جو کہ صاحب ہدایہ کے شیوخ سے ہیں ان کا پورا نام عمر بن محمد بن احمد بن اسماعیل بن لقمان مفتی الثقلین نسفی المتوفی ۵۳۷ھ ہے ھٰذا من المجتہدین فی فروع الحنفیہ (یہ فروعات حنفیہ میں اجتہاد کرتے تھے)[1]۔

کتب فقہ حنفی کے طبقات

مذہب حنفیہ کی کتابوں کو تین طبقوں پر تقسیم کیا ہے

پہلا طبقہ الاصول: ان کتابوں کو ظاہر الروایۃ کہا جاتا ہے۔ یہ کتابیں جو طبقہ اول میں ہیں امام ابوحنیفہ۔ ابویوسف اور امام محمد کے اقوال پر مشتمل ہیں۔ جنہیں امام محمد نے اپنی چھ کتابوں (المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر) ان کتب کو ظاہر الروایۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام محمد نے ان کو ثقات سے روایت کیا ہے اور یہ خبر متواتر یا مشہور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

امام محمد نے دو اور کتابیں لکھی ہیں جو ظاہر الروایۃ (طبقہ اول) میں بھی شمار کی جاتی ہیں۔ پہلی کتاب "الآثار" ہے جس میں اہل عراق کی احادیث اور آثار کو جمع کیا ہے۔ یہ

---

[1] ایک شیخ ابوعلی نسفی المتوفی ۴۲۴ھ استاذ ہے۔ شمس الایمہ حلوانی کا ۱۲

کتاب روایات میں "کتاب الآثار" ابو یوسف کے ساتھ ملتی جلتی ہے اور یہ دونوں (کتاب الآثار) امام ابی حنیفہ کی مسانید میں شمار ہوتی ہیں۔ نیز ان دونوں کتابوں پر مذہب حنفی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ ان میں وہ تمام قضایا اور فتاوی جمع کیے گئے ہیں جو نص سے ماخوذ ہیں اور امام ابو حنیفہ نے ان کی علل مستنبط کر کے قیاس سے کام لیا ہے اور پھر اصول و فروع کی ان پر بنیاد رکھ کر قواعد وضع کیے ہیں۔

دوسری کتاب امام محمد کی "کتاب الرد علی اہل مدینہ" ہے جسے طبقہ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب بھی بہت اہم ہے کیونکہ امام شافعی نے اس کو اپنی کتاب "الام" میں روایت کیا ہے۔ یہ کتاب ظاہر الروایۃ (آٹھ کتابیں، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی فقہ کا مرجع سمجھی جاتی ہے۔

دوسرا طبقہ 'النوادر': یہ کتابیں بھی اصحابِ مذہب سے مروی ہیں مگر ان کا درجہ کتبِ ستہ (ظاہر الروایۃ) کے بعد ہے۔

یہ یا تو امام محمد کی تصنیفات ہیں جیسے الکیسانیات، الہارونیات، الجرجانیات، الرقیات وغیرہ یا حسن بن زیاد وغیرہ کی تصنیفات ہیں چنانچہ علامہ ابن عابدین المتوفی ۱۲۵۲ھ فرماتے ہیں۔ من جملہ ان کتابوں کے "الامالی لابی یوسف بھی ہے۔ لفظ 'الامالی' اِملا کی جمع ہے اور املا کا طریقہ یہ تھا کہ مجتہد کے گرد تلامذہ قلم دوات اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ اپنی معلومات قلمبند کراتا جاتا تھا اور آخر وہ ایک کتاب بن جاتی، اس کو املا کہا جاتا ہے۔

کتابوں کی یہ قسم نوادر پہلی قسم اصول سے کم مرتبہ سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اصول اور نوادر میں تعارض ہو جائے تو اصول کی ترجیح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اصول مذہب کی اصل اور سند کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے۔

تیسرا طبقہ : الفتاوٰی والواقعات ان سے مراد وہ مسائل ہیں جو متاخرین میں سے ایمہ مجتہدین نے ایسے سلسلے میں مسائل مستنبط کیے جن کی نظیر متقدمین کے ہاں نہیں تھی۔ اس گروہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے تلامذہ اور ان کے مابعد کے علماء[1] شامل ہیں۔

طبقاتِ مسائل

چونکہ فقہ حنفی کی کتب کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے اسی بناء پر بعض نے کہا ہے کہ مذہب حنفیہ کے مسائل تین طبقات پر مشتمل ہیں۔ جو درج ذیل ہیں :

۱۔ طبقہ اولیٰ: مسائل اصول یعنی کتب ظاہر الروایۃ۔

۲۔ طبقہ ثانیہ : مسائل مذہب ہیں۔ جو غیر ظاہر الروایۃ کے ہیں۔

۳۔ طبقہ ثالثہ : یہ واقعات اور فتاوٰی ہیں جن کو امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگردوں نے بعد میں استنباط کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے شاگردوں سے امام محمد تالیف و تدوین کے معاملہ میں غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ حتیٰ کہ سِیَر کبیر کو ساٹھ جلدوں میں مکمل کیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ کی تصانیف نو سو نوے (۹۹۰) ہیں۔

قاضی ابو یوسف نے اصول و امالی میں مندرجہ ذیل کتب تصنیف کی ہیں :

کتاب الصلوٰۃ ، کتاب الزکوٰۃ ، کتاب الصیام ، کتاب الفرائض ، کتاب البیوع ، کتاب الحدود ، کتاب الوکالتہ ، کتاب الوصایا ، کتاب الصید والذبائح ، کتاب الغصب و

---

[1] ان اقسام ثلاثہ کے مجموعہ سے حنفی مذہب کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اگرچہ حقیقت میں چھ کتابیں ہی فقہ حنفی کی مرجع سمجھی جاتی ہیں۔ ۱۲

الاستبرا، کتاب اختلاف الامتصار، کتاب الرد علی مالک بن انس، کتاب الخراج، کتاب الجوامع، الامالی۔ امام ابو یوسف نے "اختلاف ابن ابی حنیفہ و ابن ابی لیلی بھی لکھی ہے جس میں ابو یوسف نے وہ مسائل جمع کیے جن میں امام صاحب نے ابن ابی لیلی سے اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الرد علی سیر الاوزاعی بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں امام ابو یوسف نے امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ کی ان مسائل میں تردید کی ہے جن میں وہ امام ابو حنیفہ سے اختلاف کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کے تلامذہ

امام ابو حنیفہ کے تلامذہ میں امام ابو یوسف، امام محمد اور امام حسن بن زیاد کے علاوہ بڑے بڑے فقہاء اور محدثین یہ ہیں:

۱۔ یحییٰ بن سعید قطان المتوفی ۱۹۸ھ امام ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں اور بلند پایہ کے محدث ہیں

۲۔ یحییٰ بن زکریا المتوفی ۱۸۲ھ امام ذہبی نے ان کو بہت بڑا محدث کہا ہے۔

۳۔ وکیع بن جراح المتوفی ۱۵۷ھ یہ ابو حنیفہ کے شاگرد اور امام احمد کے استاد ہیں۔

۴۔ یزید بن ہارون المتوفی ۲۰۶ھ۔ یہ بھی امام احمد کے شیوخ سے ہیں۔

۵۔ حفص بن غیاث المتوفی ۱۹۶ھ امام ابو حنیفہ شاگردوں میں سے حفص بن غیاث کو فرماتے تھے "تم ہی میرے دل کی تسکین ہو"۔

۶۔ ابو عاصم النبیل المتوفی ۲۱۲ھ۔ بخاری المتوفی ۲۵۶ھ اور مسلم المتوفی ۲۶۱ھ دونوں نے ابو عاصم النبیل سے روایت لی ہے۔ آپ کی توثیق پر اجماع ہے۔

۷۔ عبدالرزاق بن الہمام المتوفی ۲۱۱ھ۔ زیادہ تر آپ امام ابو حنیفہ کی صحبت میں ہی رہتے تھے۔

۸۔ داود الطائی المتوفی ۱۶۰ھ۔ خطیب بغدادی اور ذہبی فرماتے ہیں کہ حضرت

داؤد الطائی امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے۔

۹۔ زفر بن ہذیل المتوفی ۱۵۸ھ

۱۰۔ قاسم بن معن المتوفی ۱۷۵ھ

۱۱۔ علی بن مسہر المتوفی ۱۷۹ھ۔ بخاری اور مسلم میں ان کی روایات موجود ہیں۔

۱۲۔ حبان المتوفی ۱۷۲ھ۔ ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ میں ان کی روایات موجود ہیں۔

۱۳۔ امام مندل المتوفی ۱۶۸ھ۔ حضرت حبان کے بھائی ہیں۔ ان کے علاوہ ابوحنیفہ کے بیشمار تلامذہ راشدہ ہیں۔

فقہی اصطلاحات

قرآن اور سنّت کو جس مقصود کا مطالبہ تھا، ان طریقوں سے مطالبہ کرتے تھے اور کسی اسلوب کو دوسرے اسلوب پر قوت طلب میں کوئی فضیلت نہ تھی۔ فقہاء کی نظروں میں جب مطالبات متاثر ہونے لگے تو وہ اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے جو اس کی دلالت کریں اور وہ فرض، واجب، سنّت، مستحب وغیرہ ہیں۔ درج ذیل تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

- فرض اعتقادی: جو دلیل قطعی سے (یعنی ایسی دلیل سے جس میں کوئی شبہ نہ ہو) ثابت ہو اس کا منکر کافر ہے۔
- فرض عملی، گو ثبوت تو اس کا ایسا قطعی نہیں مگر نظر مجتہد میں بحکم دلائل شرعیہ یقین ہے۔ اگر یہ فرض کسی عبادت کے اندر داخل ہے تو اس کے رہ جانے سے وہ فرض ادا نہ ہوگا۔
- واجب اعتقادی، وہ کہ دلیل ظنی سے اس کی ضرورت ثابت ہو۔
- واجب عملی: کہ اگر یہ کسی عبادت میں واجب ہے تو اس کے سوا عبادت ناقص ہے
- سنّت مؤکدہ: وہ کہ جس کو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ہمیشہ کیا ہو۔ البتہ بیان

جواز کے واسطے کبھی ترک بھی فرمایا ہو، اس کا ترک موجب استحقاق عذاب ہے۔

- سنّت غیر مؤکدہ : وہ کہ نظر شرع میں مطلوب ہے کہ اس کے ترک کو ناپسند رکھا گیا ہے، مگر شارع علیہ السلام نے اس پر مواظبت اور ہمیشگی نہیں فرمائی۔
- مستحب: وہ کہ نظر شرع میں پسند ہے۔ اس کے کرنے پر ثواب ہے۔
- مباح: جس کا کرنا اور نہ کرنا دونوں مساوی ہیں۔
- حرام قطعی: یہ فرض کا مقابل ہے۔
- مکروہ تحریمی: یہ واجب کا مقابل ہے۔ مکروہ تحریمی سے عبادت ناقص ہو جاتی ہے جس کا اعادہ ضروری ہے۔
- اسائت: یہ سنّت مؤکدہ کا مقابل ہے۔ اس کا ارتکاب برا ہے۔

مکروہ تنزیہہ: یہ سنّت غیر مؤکدہ کا مقابل ہے۔ یہ شریعت کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

- خلاف اولیٰ: یہ مستحب کا مقابل ہے، اس کا نہ کرنا بہتر ہے۔

ادائیگی کے لحاظ سے فرض کی اور بھی دو (۲) قسمیں ہیں:

- فرض عین: جو کہ تمام افراد پر فرض ہے۔ ہر آدمی کو اپنی طرف سے فرض ادا کرنا ہو گا۔
- فرض کفایہ: کہ فرض تو تمام افراد پر ہی ہے لیکن بعض کی ادائیگی سے دوسروں سے بھی ادائیگی ہو جائے گی۔

علماء حنفیہ باطل اور فاسد کے درمیان بھی فرق کرتے ہیں اور ان کو فقہی اصطلاحات سے شمار کرتے ہیں:

- باطل کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔
- فاسد کا اثر ظاہر ہوتا ہے لیکن ناقص۔
- جو چیز کسی کے ساتھ متعلق ہو اگر اس میں وہ داخل ہے تو رکن ہے جیسا کہ رکوع نماز میں داخل ہے اگر خارج ہے تو پھر مؤثر ہے، تو اس کا نام علّت ہے جیسا کہ حلّت کیلئے

عقد نکاح علتہ ہے ۔ اگر مؤثر نہ ہو لیکن اس چیز کی طرف بعض دفعہ پہنچا دیتا ہے تو اس کو سبب کہتے ہیں۔ جیسا کہ وقت نماز کے لیے ہے ۔ اگر اس کی طرف پہنچاتے نہیں لیکن اس پر وہ چیز موقوف ہے تو اس کو شرط کہتے ہیں جیسا کہ وضو ہے ۔ اگر توقف نہ ہو تو علامت ہے مثلاً اذان ۔

○ شرط تین قسم پر ہے :

۱۔ شرط انعقاد : جس کے ساتھ چیز کا انعقاد ہو مثلاً تکبیر تحریمہ اور نیّت ۔

۲۔ شرط دوام : جو دائمی طور پر شرط بنے ۔ جیسے کہ طہارت نماز کے لیے ہے ۔

۳۔ جو وجود بقاء کے لیے شرط بنے نہ اس میں تقدم اور نہ ہی مقارنت شرط ہے ۔ جیسا کہ قرأت ہے ۔

○ اجتہاد دو قسم پر ہے :

۱۔ احکام کے ظاہر سے کوئی حکم اخذ کرنا جبکہ محل حکم ان احکام کے مطابق ہو ۔

۲۔ احکام کے مفہوم سے کوئی حکم اخذ کرنا جبکہ احکام کی علّت موجود ہو جو اس کی صراحت کرے یا اس سے مستنبط ہو اور کسی واقعہ میں وہ علّت پائی جائے اور حکم اس کو شامل نہ ہو ۔ اسی کو قیاس کہا جاتا ہے ۔

○ بعض علماء نے قیاس کی یہ تعریف کی ہے :

ایک شئی کو دوسری شئی پر حمل کرنا ، اس طرح کر اس کا حکم اس پر بسبب علّتِ مشترکہ کے جاری کیا جائے ۔

○ تنقیح مناط : جس نص کے مجموعہ اوصاف میں سے کسی ایک وصف کا علتہ ہونا مفہوم ہوتا ہو ، اس میں نظر و اجتہاد اس وصف کی تعیین کو تنقیح مناط کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ غور و فکر سے غیر متعلقہ اوصاف کو حذف کر کے باقی ایک وصف کو علتِ حکم قرار دیا جاتا ہے مثلاً رمضان کے مہینے میں ایک اعرابی کا اپنی عورت سے مجامعت کرنا روزہ باطل کرنے پر

کفارہ کا واجب کرنا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ ایجاب اس اعرابی کے ساتھ مختص نہیں ہے اور اور نہ ہی اس کا تعلق نفسِ جماع سے ہے بلکہ اس سلسلہ میں وارد شدہ نص پر غور و فکر کے بعد یہ کہا جائیگا کہ یہاں علّت حکم (ایجاب کفارہ کا سبب) عمداً افطار کرنا ہے۔ لہٰذا جو شخص رمضان شریف کے مہینے میں دن کو عمداً روزہ افطار کرے گا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسے اسی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ کیونکہ جماع کا اس واقعہ میں ہونا امر اتفاقی ہے ورنہ جیسے جماع مفطر ہے اسی طرح اکل و شرب بھی مفطر ہیں اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مناط صرف جماع ہے۔ بہر صورت تنقیح مناط نام ہے نص یا استنباط کے ذریعے اس وصف کی معرفت جو مناط حکم بنتی ہے۔

- تخریج مناط: جب شارع علیہ السلام صراحت دایما کے ذریعے کسی وصف کا علت ہونا ثابت ہو تو ایسی صورت میں اجتہاد سے اس وصف کے استنباط کا نام تخریج مناط ہے۔ جیسا کہ قتل عمد میں قصاص کی علّت عدوان ہے تاکہ دوسرے جزئیات کو اس پر قیاس کیا جائے۔
- تحقیق مناط: کسی علّت کے نص یا اجماع یا استنباط سے معلوم کر لینے کے بعد احاد (جزئیات) میں اس علّت کے موجود کی معرفت پر نظر و فکر سے کام لینے کا نام تحقیق مناط ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ تحریم خمر کی علّت اس کا مسکر ہونا ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا کہ آیا نبیذ بھی مسکر ہے یا نہیں۔ اس قسم کی تحقیق کو تحقیق مناط کہا جاتا ہے۔
- استحسان: بعض اوقات فقیہ کے سامنے وصف موثر موجود ہوتی ہے اور اس کے بالتبع حکم میں عمومیت ہوتی ہے لیکن بعض صورتوں اور بعض احوال میں ایک دوسرا وصف اس کا معارض آجاتا ہے اور پہلے وصف سے اثرات کے لحاظ سے قوی تر ہوتا ہے۔ لہٰذا فقیہ اس دوسرے وصف کے پیش نظر پہلے حکم سے عدول کر کے دوسرے

وصف (قوی) کے مطابق حکم لگا دیتا ہے۔ فقہاء حنفیہ اسے استحسان کہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ استحسان بھی قیاس ہی کی ایک قسم ہے اس میں قوی الاثر وصف دوسرے ضعیف الاثر وصف سے معارض ہوا ہے۔ لہٰذا اصول فقہ صرف چار ہی ہیں۔ علۃ خامسہ زائد نہیں ہوئی ہے۔

چونکہ یہاں پر ایک قیاس جلی دوسری قیاس خفی کے معارض ہوا ہے۔ لہٰذا اسکا نام بعض علماء نے استحسان قیاس بیان فرمایا ہے، مطلب واحد ہے۔

○ استحسان کی ایک دوسری قسم یہ ہے کہ استحسان کا سبب علّت خفیہ نہ ہو بلکہ مصادر شریعت یا ضروریاتِ دین میں سے کوئی چیز قیاس سے معارض ہو اور وہ استحسان کا باعث بنے۔ اس صورت میں قیاس سے معارض کوئی اثر یا اجماع یا ضرورتِ عامہ سے کوئی چیز ہوگی۔ لہٰذا استحسان کی تین قسمیں ہو جائیں گی۔

۱۔ استحسانِ سنّت: جیسا کہ کسی روزے دار کا بھول کر کھا پی لینا۔ قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ روزہ فاسد ہو جائے مگر امام ابوحنیفہ اثر اور سنّت کی بنا پر قیاس کو رد کرتے ہیں اور روزے کی صحت کا حکم لگاتے ہیں۔

۲۔ استحسان اجماع: جیسا کہ عقد استصناع (درزی کو کپڑا سلائی کے لیے دینا اور عقد کر لینا وغیرہ وغیرہ) کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے۔ حالانکہ قیاس کی رُو سے یہ عقد فاسد ہونا چاہیئے کیونکہ محل عقد معدوم ہے۔ یہاں پر قیاس چھوڑ دیا گیا ہے اور عقد کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔

۳۔ استحسان ضرورت: اس کی صورت یہ ہے کہ کسی ضرورت عامہ کی بنا پر مجتہد قیاس کے ترک پر مجبور ہو جائے مثلاً حوض اور کنوئیں کی تطہیر کا مسئلہ ہے کہ قیاس کی رو سے انکی تطہیر ممکن نہیں ہے۔ حوض یا کنوئیں کو پاک کرنے کے لیے اس پر پانی ڈالنا ناممکن ہے۔ اس طرح جو پانی حوض کے اندر ہے یا کنوئیں کے سوت سے نکلتا ہے

وہ بھی نجاست کے ساتھ متصل ہونے سے نجس ہوتا رہے گا اور ڈول بھی نجس پانی میں چلا جانے کے بعد نجس ہو جائے گا۔ لہٰذا قیاس کی رُو سے ان کی طہارت کسی صورت میں بھی ممکن نہیں مگر ضرورت عامہ کے تحت فقہاء نے قیاس کو نظرانداز کر دیا اور استحسان کی بنا پر طہارت کا فتویٰ دے دیا کیونکہ ضرورت کسی خطاب شرعی کے ساقط ہونے میں مؤثر قرار دی جاسکتی ہے۔ اس مسئلہ (کنویں اور حوض کی طہارت) کی طرف علامہ ابن اثیر جزری المتوفی ۶۰۶ھ ۔ صاحب النہایہ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔

علّت کی تعریف

علّت حکم میں خود مؤثر ہوتی ہے ۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ علّت ہی وجود حکم میں مؤثر ہوتی ہے تو لامحالہ وصف متعدّی ہوگا یعنی جہاں کہیں وہ متحقق ہو جائے گا، اس کا حکم بھی ثابت ہو جائے گا اور یہ حکم اپنے مقام تک منحصر نہیں ہوگا بلکہ وصف کی تاثیر کے بالتبع ثابت ہوتا رہے گا۔

علّت ہی قیاس کا مدار ہے۔ یہی اصل اور فرع میں مشترک ہوتی ہے۔ اسی کی وجہ سے اصل کا حکم فرع کے لیے واجب ہوتا ہے۔ علت کی تعریف میں علماء اصول نے اختلاف کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ علۃ معرف ہے یعنی حکم کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور تمام علل شرعی معرفات ہیں مؤثر نہیں کیونکہ درحقیقت مؤثر واجب الوجود تعالیٰ ہے۔ اگرچہ علامت بھی حکم کے وجود پر دلالت کرنے والی ہے مگر اس میں اور علّت میں بڑا فرق ہے اس لیے کہ احکام کو وجود علۃ سے حاصل ہوتا ہے اور علۃ سے ہی وہ واجب ہوتے ہیں اور علامت کو وجود کے احکام میں دخل نہیں ہوتا۔ جیسے اذان نماز کی علامت ہے اور زانی کا

محصن ہونا سنگسار کرنے کی علامت ہے مگر اذان کی وجہ سے نماز واجب نہیں ہوتی اور نہ ہی محصن ہونے کی وجہ سے سنگسار کرنا واجب ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ علۃ اثر کرنے والی ہے اور معلول کا وجود اس پر ہی موقوف ہے جیسا کہ دھوپ کا وجود سورج پر موقوف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ علّت شارع کے لیے حکم کے مشروع کرنے کا باعث ہے مگر یہ مشروع کرنا اس پر واجب نہیں ہوتا اور باعث سے مراد یہ ہے کہ علۃ ایسی حکمت پر مشتمل ہوتی ہے جس کی وجہ سے شارع امر کو مشروع کرتا ہے چنانچہ وجوب قصاص کی علّت قاتل کا مقتول کو ناحق قتل کرنا ہے اور قصاص میں بندوں کا نفع اور ان سے نقصان کو دفع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اس کے ہر کام میں حکمت مضمر ہے۔ ایسی علۃ کو علۃ مناسبہ بھی کہتے ہیں۔

علّت کے ثبوت کا طریقہ

اس بات کا ثبوت کہ (یہ وصف مؤثرہ علۃ ہے) یا قرآن سے معلوم ہوگا جیسا کہ قرآن پاک میں ہے کہ مریض اور مسافر کے لیے افطار رمضان میں مباح ہے۔ یہ افطار ان کے لیے مصلحت دینیہ کی وجہ سے ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں، اگر مسافر کسی اور واجب کی نیت کرے تو کر سکتا ہے کیونکہ وہاں یہ مصلحت شرعیہ سے سبکدوش ہو رہا ہے۔ یا حدیث سے۔ حدیث پاک میں ہے جو کروٹ پر سوئے اس پر وضو لازم ہے کیونکہ اس سے جوڑ سست ہو جاتے ہیں۔ اب حنفیہ اس کا تعدیہ استناد (سر اپنا دونوں زانوؤں پر رکھ کر سونا) اور اتکاء کی طرف بھی کرتے ہیں کہ ان پر بھی وضو واجب ہے کیونکہ علّت (سست ہونا) یہاں بھی متحقق ہے۔

یا وصف مؤثرہ اجماع سے معلوم ہوگی۔ جیسا کہ اجماع اس بات پر ہے کہ صغر علّت ہے۔ لہٰذا باپ کو چھوٹے بچّے کے مال کی ولایت حاصل ہوگی۔ اب حنفیہ اس کا تعدیہ چھوٹی بچّی کی طرف کریں گے کہ باپ کو اس کے نکاح کر دینے کا بحالت نابالغی میں بھی

حق ہو گا۔

طرد اور عکس یا دوران طرد کا معنی یہ ہے۔ جب وصف پائی جائے تو حکم پایا جائے اور عکس کا معنی جب وصف منتفی ہو جائے تو حکم بھی منتفی ہو جائے اور اسی کو دوران بھی کہتے ہیں۔ حنفیہ طرد اور عکس سے علۃ کو ثابت نہیں کرتے بلکہ شافعیہ طرد اور عکس سے علۃ کے ثبوت کے قائل ہیں۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر وصف کے پائے جانے سے حکم پایا جاتا ہے تو یہ امر اتفاقی ہے اور وصف گویا کہ شرط بن رہا ہے علۃ نہیں ہے۔ مثلاً خاوند نے بیوی کو کہا اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہے۔ اب عورت اگر حالت نکاح میں گھر میں داخل ہو گی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہاں حکم کا دوران وجودی طور پر مکان میں جانے کے ساتھ پایا جاتا ہے باوجودیکہ یہ شرط ہے علۃ نہیں ہے۔ صرف یہ بات ہے کہ وصف اور حکم میں لزوم ہے لیکن محض لزوم سے علۃ کا لزوم اور اثبات نہیں ہوتا اور عکس میں تو بات اور بھی واضح تر ہے کہ وہ عدم ہے۔ عدمی چیز میں صلاحیت علت کہاں ہوتی ہے۔ بہر نوع طرد اور عکس ثبوت علۃ کے لیے حنفیہ کے نزدیک کوئی ضروری اور لازمی چیز نہیں ہے۔

مناسب کی تعریف وصف کو جو حکم کے ساتھ مناسبت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وصف علۃ ہے۔ مناسب کی تعریف یہ ہے کہ وصف اس لحاظ سے ہو کہ حکم کا ترتب اس پر یا تو بوجہ منفعت ہو یا بوجہ دفع نقصان ہو جیسا کہ روزہ ایک بدنی عبادت اور ریاضت ہے۔ اس سے نفسِ امارہ اور خواہشات نفسانیہ کی تادیب ہے۔ اور مناسبت کے لیے شرط ہے کہ علل شرعیہ کے مطابق ہو۔ علتِ مناسبہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہ دونوں کے نزدیک شرط ہے لیکن امام شافعی صرف مناسبت اور ملایمت پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ تاثیر ظہور کے بھی قائل ہیں۔

تاثیر ظہور کی کئی صورتیں ہیں۔ اس میں ایک یہ کہ جنس علت کی تاثیر حکم متفقین میں ظاہر ہو

جیسا کہ ایک آدمی ایک دن اور ایک رات سے زیادہ بے ہوش رہا، اُس سے نمازیں ساقط ہوگئیں سبب بے ہوشی سقوطِ نماز کی علت ہے اس کی جنس جنون ہے۔ اس کو بھی اسقاطِ نماز میں تاثیر ہے۔

اخالہ امام شافعی علتِ مناسبہ کے بعد واجب العمل ہونے کے لیے صرف یہ فرماتے ہیں کہ دل میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ یہ وصف جامع فلاں حکم کی علت ہے۔ یہ تخییل قلبی علیۃ کی صحت کے لیے کافی ہے۔ یہی اخالہ ہے۔

یہ اخالہ حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک بھی حجت ہے۔ حنفیہ اخالہ کے قائل نہیں ہیں، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک بعد از مناسبت وجوب کے لیے مؤثر ہونا لازمی ہے۔

مصالحہ مرسلہ امام مالک مصلحت مرسلہ کے قائل ہیں۔ مصلحت مرسلہ تو ایسی مصلحت سے اخذ کرنے کو کہتے ہیں جس کی نفی یا اثبات پر خاص دلیل شرعی نہ ہو بلکہ صرف اس مصلحت کا ہونا ہی دلیل ہو۔ شوافع سے حجۃ الاسلام محمد بن محمد الغزالی المتوفی ۵۰۵ھ فرماتے ہیں کہ مصالحہ مرسلہ یہ ہیں کہ ان اوصاف کو جن کی وجہ سے اس وصف جامعہ کے حکم کی علت کا دل میں خیال واقع ہوا ہے علم ہوجائے اس وقت قابل دلیل ہوگی جبکہ وہ ضروریات سے ہوں اور قطعی ہوں اور کلی ہوں یعنی وہ غیر ضروری ہوں، نہ ظنی ہوں اور نہ ہی کسی ایک شخص کے ساتھ متفقہ ہوں۔ پھر مصلحتیں تین قسم پر ہیں۔

مصالحہ ضروریہ یہ پانچ چیزیں جن کی حفاظت لازمی ہے۔
۱۔ دین ، ۲۔ عقل ، ۳۔ نسب ، ۴۔ جان ، ۵۔ مال۔

مصالحہ حاجیہ یہ وہ مصلحتیں ہیں جن کا دار و مدار حاجت پر تو ہے لیکن ضروریات میں سے نہیں کہ ان کے سوا دین یا مال وغیرہ ہی ختم ہوجائے۔ البتہ انسان انکی طرف معاشیات میں محتاج ہے جیسا کہ بیع و تجارت و اجارہ وغیرہ۔

مصالحہ تحسینیہ یہ وہ مصلحتیں ہیں جن کا تعلق معاشرہ اور تہذیب اور ثقافت کے ساتھ ہے۔ مثلاً حرام جانور کھانے اور بری عادات سے پرہیز کرنا وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ ایسے قیاس کے قائل نہیں ہیں جن کی بنیاد مفاسد اور مصالح پر رکھی گئی ہے کیونکہ قیاس کی بنیاد قرآن و سنت اور اجماع پر ہے۔

فساد وضع یہ ہے جس وصف کو علۃ بنایا گیا ہے اس میں علت ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے شافعیہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت (زوجین) اگر کوئی مسلمان ہو جائے تو فوراً نکاح ختم ہو جاتا ہے کیونکہ صرف اسلام جدائی کا موجب بن جاتا ہے۔ گویا کہ اختلاف دین فساد نکاح کا باعث ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ قیاس ہی اپنی اصلی حقیقت اور وضع میں فاسد ہے کیونکہ علت مناسبہ ضروری ہے اور اسلام زوال ملک کے مناسب نہیں کیونکہ اسلام ملک اور حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ لہذا دوسرے کو بھی کہا جائے گا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر مسلمان ہو جائے تو نکاح باقی رکھا جائے گا۔ اگر مسلمان نہ ہوا تو پھر نکاح ختم ہو جائے گا اور یہ انقطاع نکاح گویا کہ اس کے انکار کی وجہ سے ہوا ہے۔

عدم انعکاس یہ ہے کہ حکم پایا گیا ہے علۃ موجود نہیں۔ شافعیہ اعتراض کریں گے کہ یہاں حکم تو ہے لیکن علت نہیں، لہذا حکم لگانا صحیح نہیں۔ حنفیہ کہیں گے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حکم کی اگر ایک علۃ نہیں پائی گئی تو یہ حکم دوسری علۃ کی وجہ سے متحقق ہو جائے گا

ممانعت یہ ہے کہ معلل جب دلیل پیش کرے تو معترض یہ کہے کہ اس دلیل کے کل مقدمات قابل قبول نہیں ہیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے؛ حکم کی وصف جامع جو بیان کی گئی ہے اس کی تاثیر غیر مسلّم ہے۔ مثلاً امام شافعی فرماتے ہیں کہ باکرہ (کنواری لڑکی) چونکہ نکاح کے معاملات سے واقف نہیں ہے لہذا نکاح میں ولی کی ولایت لازمی ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ بکارت (وصف) کی تاثیر کسی دوسرے مقام پر ظاہر نہیں ہوئی۔ جیسا کہ صغر کی تاثیر مال میں ظاہر ہو چکی ہے۔ لہذا وصف بکارت کی تاثیر

غیر مسلّم ہے۔ لہٰذا باکرہ بالغہ کے لیے ولایت ولی ضروری نہیں ہے۔

قول بالموجب معلل کی دلیل کو تسلیم کر لینا کہ جو اس نے وصف ثابت کیا ہے وہی علت ہے لیکن حکم کو نہ ماننا قول بالموجب ہے۔ اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

معلل اپنی دلیل میں کوئی مقدمہ چھوڑ دے مثلاً معلل یہ کہے کہ عبادت کے لیے نیت شرط ہے پس وضو کے لیے نیت شرط ہے۔ اب یہاں معلل نے مقدمہ صغریٰ چھوڑ دیا ہے کہ وضو عبادت ہے صرف کبریٰ کا ذکر کیا ہے لہٰذا حنفیہ قول بالموجب کرتے ہوئے کہیں گے جو تم نے ذکر کیا ہے وہ مسلّم ہے لیکن یہ کہاں سے لازم آیا کہ وضو کے لیے نیت شرط ہے۔

مناقضہ یہ ہے کہ علت تو پائی گئی ہے لیکن حکم نہیں پایا گیا مثلاً حنفیہ کہتے ہیں کہ سوائے مخرجین (جہاں سے بول و براز نکلتا ہے) کے بھی اگر بدن انسان سے خون نکلے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

شافعیہ نقض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدمی کے زخم سے جب اتنا قلیل مواد ظاہر ہو جو نہ پھیلے اور نہ بہے چاہیئے کہ حنفیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ جائے۔ اب یہاں علّت تو محقق ہے لیکن حکم (نقض وضو) نہیں پایا گیا۔ حنفیہ جواباً کہتے ہیں کہ اس جزئیہ میں خروج ہی متحقق نہیں ہوا بلکہ یہ ظہور ہے خروج میں سیلان ضروری ہے جو کہ یہاں مفقود ہے، علّۃ تو خروج تھی نہ کہ ظہور۔ چونکہ اس صورت مذکورہ میں خروج نہیں ہوا۔ لہٰذا حکم بھی متحقق نہیں ہوا۔ یہاں یہ صورت نہیں ہے کہ حکم نہیں علتہ ہے بلکہ ہر دونوں ہی نہیں۔ "ہدایہ کتاب الطہارۃ" میں مزید تفصیل دیکھئے۔

معارضہ علماء اصول معارضہ اور مناقضہ میں فرق کرتے ہیں۔ مناقضہ سے خود دلیل ہی باطل ہو جاتی ہے۔ معارضہ سے ثبوت حکم منع کیا جاتا ہے دلیل منع ہو یا نہ، اور مستدل (استدلال کرنے والا) کے مدعٰی کی نقیض پر اگر دلالت ہو جائے یا مستدل کے دعویٰ کے خلاف ثابت ہو جائے تو اس کو معارضہ کہتے ہیں۔ مثال:

امام شافعی فرماتے ہیں کہ مسح کرنا وضو میں فرض ہے اس کو تین بار کرنا مسنون ہے۔ جیسے کہ دیگر فرائض وضو یعنی ہاتھ وغیرہ تین بار دھوئے جاتے ہیں۔ حنفیہ معارضہ کرتے ہیں کہ سر کا مسح تین بار کرنا مسنون نہیں ہے جیساکہ موزہ کا مسح اور تیمم کا مسح تین بار نہیں کیا جاتا۔ یہ معارضہ مستدل کے حکم کی ضد کے ساتھ ہے کیونکہ جو حکم مستدل نے فرع میں ثابت کیا ہے حنفیہ نے اس کی ضد ثابت کر دی ہے۔

قیاس مع الفارق اگر فرع اصل کے ساتھ مماثل نہیں ہے تو ایسا قیاس باطل ہے۔ اسکو قیاس مع الفارق کہتے ہیں۔ جیساکہ یہ کہا جائے کہ وضو میں نیت فرض ہے کیونکہ تیمم میں نیت فرض ہے۔ دونوں میں علت جامعہ طہارت ہے۔ حنفیہ کہیں گے کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ پانی بالطبع پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے اور ہر وقت پاک کرنے والا ہے بخلاف مٹی کے کہ وہ بوقت ضرورت پاک کرتی ہے لہذا تیمم میں نیت کی ضرورت ہو گی اور وضو میں نہ ہو گی۔

عدم القائل بالفصل یہ ہے کہ جب ایک ثابت ہو تو دوسرا بھی ثابت ہو گا کیونکہ ان میں فرق کا قائل کوئی نہیں۔ یا دونوں مسئلے مخالف کے نزدیک ثابت ہوں گے یا منتفی ہوں گے۔ تیسرے قول کا کوئی بھی قائل نہیں ہو گا۔ یعنی یہ نہیں کہے گا کہ دونوں میں سے ایک ثابت ہے اور دوسرا منتفی ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مرد اور عورت سے کسی ایک کو جنون، جذام، برص (مثلاً) ہو جائے تو نکاح فسخ کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔

امام شافعی کے نزدیک حق فسخ ثابت ہے۔ اب جب ہی جنون، جذام، برص، کسی ایک کو ہو گا تو ابوحنیفہ اختیار فسخ ثابت نہیں ہوتے دیں گے اور امام شافعی ثابت کریں گے۔ یہاں ان ایمہ سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ ان میں سے بعض عیبوں کی وجہ سے فسخ نکاح کا اختیار ہے اور بعض عیوب کی وجہ سے نہیں۔ پس اس کو ہی عدم القائل بالفصل کہتے ہیں۔

تخریج تخریج سے مراد ان واقعات و احکام کا استنباط ہے جن کے بارے میں ایمہ مذاہب فقہ سے کوئی رائے یا حکم منقول نہیں۔ اصحاب تخریج کا یہ اجتہاد حدود مذہب فقہی کے اندر رہ کر قواعد و اصول عامہ پر مبنی ہوتا ہے۔

ترجیح ترجیح کا مفہوم یہ ہے کہ ایمہ مذاہب فقہیہ کے اقوال مختلفہ میں سے کسی قول کو راجح بیان کیا جائے یا جو مختلف روایات ان سے منقول ہوں ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دیجائے یہ لوگ[1] آثار اور روایات سے شناسا ہوتے ہیں۔ یہ کسی ایسے مسئلے میں استنباط احکام نہیں کر سکتے جس کے بارے میں پہلے سے کوئی نص موجود نہ ہو نہ یہ منصوص علیہ احکام کے خلاف فتویٰ دینے کے مجاز ہیں۔ اصحاب تخریج اور اصحاب ترجیح کے بارے میں طبقات فقہاء کے سلسلے میں بھی گفتگو ہو چکی ہے اور ہم پہلے طبقات فقہا میں بیان کر چکے ہیں کہ اصحاب تخریج اجتہاد پر قدرت نہیں رکھتے۔ مطلب اس کا یہ ہے۔ خاص طور پر ان کا یہ فعل استنباط مستقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں جو تخریج کے مفہوم میں بیان کیا ہے کہ اصحاب تخریج کا یہ اجتہاد: اس کا معنی یہ ہے کہ اصول اور ماخذ کا ضبط پھر مبہمات کی تشریح، یہ بھی فروعی احکام کے استنباط سے کم نہیں ہے۔

عرفِ عام سے مراد وہ رواج ہے جو شرع کے احکام سے نہ ٹکراتا ہو اور عوام اس پر عامل ہوں۔ فقہاء ایسے عرف کو تسلیم کرتے ہیں اور اس پر فتویٰ دیتے ہیں عرف کی تخریج میں بہت اہمیت ہے کیونکہ تخریج اصول عامہ مستنبطہ پر مبنی ہوتی ہے اور ان ملحقہ احکام پر جن سے وہ فروع مستخرج ہوں جو ایمہ سابقین کے عرف سے مشابہ ہوں۔ یہ ایمہ اکثر مسائل میں عرف کی بنیاد پر احکام صادر کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ میں ایسے بہت سے مسائل نظر آئیں گے جو عرف عام یا عرف خاص پر مبنی ہیں چنانچہ کتاب البیوع" یا کتاب اجارات" میں اکثر یہ عبارتیں نظر سے گزریں گی ماورالنہر کا عرف اس طرح ہے۔ اہل روم کا یہ عرف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتہادی مسائل

---

[1] اصحاب ترجیح۔ ۱۲۔

میں عرف کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ اکثر و بیشتر صرف اسی چیز پر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی موثر حیثیت نہ ہو تو بھی یہ ایک قیاس کو دوسرے قیاس پر ترجیح دینے کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔

ترجیح مختلف روایات میں

مختلف روایات[1] میں ترجیح دینے کے لیے سب سے پہلے ان کتابوں کا درجہ متعین کرنا ہو گا جن میں یہ روایات موجود ہیں۔ اگر کوئی روایت "ظاہر الروایۃ" میں ہو تو یہ زیادہ قابلِ اعتماد سمجھی جائے گی اور اس کے علاوہ دوسری روایات کا اعتبار نہیں ہو گا۔ بشرطیکہ پہلی روایت میں کسی طرح کا تعارض نہ پایا جائے۔ چنانچہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "ظاہر الروایۃ" میں جو روایت نہ ہو وہ صرف اس صورت میں قبول کی جائے گی کہ وہ اصول سے موافق ہو۔ علاوہ ازیں "ظاہر الروایۃ" کے دوسری روایات صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی جب ظاہر الروایۃ سے اس کی تائید بھی ہوتی ہو یعنی اس کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو اور وہ اصول ظاہر الروایۃ کے اصول تخریج پر مبنی ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو بلکہ وہ روایت مخالف اصول ہو تو اسے دو وجوہ سے ضعیف قرار دیا جائے گا۔ ضعف کا ایک سبب سند اور روایت ہے۔ دوسرا اس کا شاذ ہونا کیونکہ مذہب کے اصول عامہ سے یہ صورت مطابق نہیں ہے۔ اور اگر دونوں روایتیں یکساں طور پر قوی ہوں اور کسی اصول سے ٹکراتی نہ ہوں تو پھر مقتضائے حالات یا زیادہ قوی ہونے یا کسی دوسرے سبب سے ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے گی۔ اگر پھر بھی ترجیح نہ دی جا سکے تو پھر معلوم کیا جائے گا کہ آیا ایک روایت دوسری سے زمانی تقدم رکھتی ہے۔ کیونکہ دوسرا قول زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ پہلے قول سے رجوع کا شاہد ہوتا ہے لیکن اگر اس کا بھی پتہ نہ چلے تو پھر اس مسئلہ میں امام کے دو قول تسلیم کیے جائیں گے۔ اور پھر ان دونوں میں سے کسی ایک کو قوی دلیل سے ترجیح دی جائے گی۔

---

[1] بحوالہ امام ابو حنیفہ، ابو زہرہ۔

اقوالِ مختلفہ میں ترجیح دینے کی صورت

اس کے دو طریقے ہیں :

۱۔ کبھی دلیل کی قوت سے ترجیح کا عمل کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ضرورت وقت یا عرف عام کی مدد سے ترجیح دی جاتی ہے۔

۲۔ کبھی قائل کی شخصیت ترجیح کا فیصلہ کرتی ہے۔ قائل کی شخصیت کی صورت میں ترجیح دینے کا طریقہ یہ ہے کہ جب ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں امام ابویوسف اور امام محمد کسی مسئلے میں ایک ہی رائے رکھتے ہوں تو اسے معتبر اور قابل ترجیح سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی وقتی ضرورت یا عرف عام کے باعث اصول موضوعہ و معتبرہ کی بنیاد پر اختلاف ہو جائے تو یہ دوسری بات ہے اس صورت میں رائے کی بنیاد قیاس ظنی تصور کی جائے گی۔ جب امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں میں سے کوئی ایک کسی مسئلہ میں ایک ہی رائے رکھتا ہو تو اسے ترجیح دی جائے گی اور اگر یہ تینوں باہم مختلف الرائے ہوں تو ابوحنیفہ کی رائے پر فتویٰ دیا جائیگا

امام مذہب کی حیثیت

کیونکہ امام کی حیثیت یہ ہے کہ وہ امام مذہب ہیں۔ اسی لیے جہاں بھی اختلاف ، ضرورت ، عرف ، اصول یا دلیل قوی پر مبنی نہ ہوگا وہاں امام مذہب ہی کا قول معتبر ہوگا۔ ولہذا علّامہ خیرالدّین رملی المتوفی ۱۰۸۱ھ (استاذ صاحب درمختار) فرماتے ہیں :

المقرر عندنا انه لا یفتی ولا یعمل الا بقول الامام الاعظم ولا یعدل عنه الی قولهما او قول احدهما او غیرهما الا بالضرورة۔

ہمارے نزدیک یہ بات مقرر اور منضبط ہو چکی ہے کہ فتویٰ امام ابوحنیفہ کے قول پر ہوگا۔ ہاں جہاں کہیں ضرورت ہو تو پھر صاحبین وغیرہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا ورنہ نہیں۔

اگر یہ صورت ہو کہ امام ایک طرف ہو اور ابویوسف اور امام محمد ایک طرف ہوں تو اگر مفتی مجتہد فی المذہب ہے تو فریقین میں جس کے قول کو مدلل اور وزنی محسوس کرے گا، اسے ترجیح دے گا۔ اگر

مفتی مجتہد فی المذہب نہ ہو تو عبداللہ بن مبارک کی رائے یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ ہوگا

بعض دوسرے علماء کا قول ہے:

"مفتی کو اختیار ہے جس قول کو چاہے ترجیح دے دے۔"

قاضی خاں لکھتے ہیں کہ اگر ہمارے مشایخ کے مابین کوئی مسئلہ مختلف فیہ ہو تو امام ابوحنیفہ کے ساتھ ان کے جس شاگرد کی رائے ہوگی وہ قبول کر لی جائے گی اور ظاہر ہے کہ وہ قولِ امام ابوحنیفہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں قبول رائے کی تمام شرائط موجود ہیں اور دلائل بھی تائید میں ہیں۔

البتہ جب امام ابویوسف اور امام محمد ابوحنیفہ سے اختلاف کریں تو اگر یہ اختلاف عصر و زماں کے باعث ہے جیسا کہ قضا بظاہر عدالت تو اس صورت میں تغیر احوال کے باعث صاحبین کا فتویٰ قبول کر لیا جائے گا۔ اسی طرح مزارعت اور معاملات وغیرہ میں صاحبین کا قول اختیار کر لیا جائے گا کیونکہ متاخرین کا اس پر اجماع ہے اور ان مسائل کے علاوہ اگر اختلافی صورت پیش آئے تو مفتی مجتہد ترجیح دینے میں با اختیار ہے اور اپنی صوابدید پر عمل کر لے گا۔

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی رائے پر فتویٰ ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ میں نظر و فکر کا اختلاف

امام ابوحنیفہ کے شاگردوں نے بہت سے جزوی مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن عابدین کا خیال ہے کہ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کے اقوال در اصل امام صاحب کے ہی اقوال ہیں کیونکہ امام صاحب نے انہیں حکم دیا تھا کہ میرے ان اقوال کو درست سمجھو جن کے ساتھ کوئی دلیل بھی ہو امام صاحب سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو یہی میرا مذہب ہے۔

ابن عابدین فرماتے ہیں:

جب امام نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا تھا کہ میرے وہ اقوال قبول کرو جن پر کوئی دلیل ہے پس ان کے اقوال گویا کہ امام کے اقوال ہوئے۔ کیونکہ یہ اقوال انہی قواعد کے اساس پر قائم

ہیں جو امام ابو حنیفہ نے مرتب کیے تھے۔

اجتہادی مسائل میں نصوص کا مطالبہ کی نفی اور مولوی عبد الحئی لکھنوی کا مغالطہ

مولوی عبد الحئی لکھنوی المتوفی ۱۳۰۴ھ مسئلہ ترتیب نماز قضا اور محاذات اور نماز سرّی میں قرأت خلف الامام اور رفع الیدین کے متعلق لکھتے ہیں کہ حنفیہ کے پاس ان مسائل میں کوئی دلیل نہیں۔ چونکہ حنفیہ نماز قضا میں ترتیب اور صفوں کے درمیان بھی ترتیب نماز سرّی میں خلف الامام جائز نہیں ہے اور اسیطرح عند الرکوع رفع یدین نہیں ہے کے قائل ہیں۔

مولوی عبد الحئی لکھتے ہیں کے حنفیہ کے پاس کوئی دلیل نہیں ۔

مولوی عبد الحئی نے متعدد مسائل میں غلطی کی ہے باوجودیکہ حنفی ہونے کے مدعی ہیں پھر خود ہی کہتے ہیں کہ حنفیہ کے پاس (یعنی امام ابو حنیفہ کے پاس) کوئی دلیل نہیں ہے۔ مولوی عبد الحئی کو اتنا علم بھی نہیں ہے کہ اجتہادیات میں امام سے نصوص کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا

سید انور شاہ کاشمیری دیوبندی المتوفی ۱۳۵۲ھ فیض الباری صفحہ ۱۵۱ جلد ۲ پر لکھتے ہیں:

قال ابو حنیفۃ و مالک رحمھما اللہ تعالیٰ ان الترتیب مستحق و قال عبد الحئی انہ لا دلیل للحنفیۃ علی وجوب الترتیب کما قال فی مسئلہ المحاذاۃ ۔

پھر انور شاہ کہتے ہیں کہ عبد الحئی کا اجتہادیات میں نصوص کا مطالبہ صراط مستقیم سے عدول ہے یعنی عبد الحئی غلط راستہ پر گامزن ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے یوم خندق، خندق میں نمازیں قضا علی الترتیب ادا فرمائی تھیں۔ یہ اتفاقی مسئلہ ہے۔ ترتیب کو واجب کہنا یہ امام کا اجتہاد ہے۔

کما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم لم یصف النساء الا خلف الصفوف حتی انہ اقام العجوز مرۃ خلفہ وجعل لھا صفا وحدھا مع

انہ قال من صلی خلف الصف وحدہ فلا صلوٰۃ لہ (بالمعنی) فہل
کان ہذا التاخیر لان محاذاتہا یا الرجال مفسدۃ لصلوتہم
والامر آخر فہو الفیا من مدارک الاجتہاد فحکم وجدان
امامنا بالوجوب فی الموضعین ولا یسوغک الاعتراض علیہ
نعم الوائیت بحدیث یدل علی انہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قضی
فوائتہ غیر مترتبۃ او اقام النساء حذاء الرجال ولو مرۃ
لکان کذالک مکان القول ذا سعتہ اما اذا لم ینقل عنہ بخلافہ
فای بأس فی حمل عملہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

علی الوجوب تلخیص کلام یہ ہے کہ ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جب نمازیں قضا کی جائیں تو ان میں ترتیب رکھی جائے ۔ مولوی عبدالحیٔ کہتا ہے وجوب ترتیب پر امام ابوحنیفہ کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جیسا کہ ابوحنیفہ کے پاس مسئلہ محاذاۃ میں بھی کوئی دلیل نہیں ہے ۔

انور شاہ کہتے ہیں کہ عبدالحیٔ کا اجتہادیات میں نصوص کا مطالبہ غلط ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے دن جو نمازیں قضا فرمائی تھیں ان کو ترتیب کے ساتھ قضا کیا تھا ۔ یہ اتفاقی مسئلہ ہے ۔ ترتیب کو واجب کہنا یہ امام کا اجتہاد ہے ۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو آخری صف میں کھڑا کیا ہے ۔ جبکہ ایک عورت تھی تو پھر بھی اس کو آخری صف میں کھڑا کیا باوجودیکہ صف واحد میں ایک کو کھڑے ہونے سے منع بھی فرمایا ۔

فرمایا :

اس کی نماز نہیں جو صف میں اکیلا کھڑا ہوتا ہے ۔

پس عورتوں کو پیچھے کھڑا کرنا صرف اسی لیے تھا کہ مردوں کے محاذی (مقابل) کھڑے ہونے سے مردوں کی نماز فاسد نہ ہو پس یہی مدارک اجتہاد ہے ۔ ہمارے امام ابوحنیفہ نے دونوں جگہ یعنی ترتیب اور مسئلہ محاذاۃ میں وجوب کا حکم فرمایا ۔ تجھے (عبدالحیٔ) امام پر اعتراض کی گنجائش

نہیں۔ البتہ اگر تم حدیث پاک پیش کرتے کہ حضور نے قضا نمازیں بلا ترتیب پڑھی ہیں یا عورتوں کو مردوں کے مقابل کھڑا کیا ہے تو پھر تم اعتراض کر سکتے لیکن حدیث منقول نہیں لہٰذا تمہارا اعتراض غلط ہے اور امام نے جو وجوب ترتیب اور مسئلہ محاذاۃ کا قول کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اسی طرح عدم قرأت خلف الامام نماز سری میں اور عدم رفع یدین عند الرکوع میں بھی عبد الحئی امام ابوحنیفہ سے نص کا مطالبہ کرتا ہے۔

لکھتا ہے کہ حنفیہ کے پاس کوئی دلیل ہی نہیں حالانکہ اجتہادی مسائل میں نص کا مطالبہ امام سے جائز نہیں۔ گویا کہ عبد الحئی کو ابوحنیفہ پر اعتماد نہیں ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ امام مستقل اور مجتہد مطلق سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب امام ابوحنیفہ کی مزار اقدس پر صبح کی نماز پڑھائی نہ بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور نہ ہی رفع یدین عند الرکوع کیا اور نہ قنوت پڑھی۔

پھر فرمایا مجھے ادب ملحوظ ہے لیکن مولوی عبد الحئی کو ادب ملحوظ خاطر نہیں۔ کہتا ہے کہ ابوحنیفہ کے پاس ان مسائل میں کوئی دلیل ہی نہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہ تابعی ہیں۔ آپ بہت بڑی شان کے مالک ہیں۔ بڑے بڑے ایمہ اور محققین اور علماء نے آپ کی تعریف اور شان میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے:

عقود المرجان، قلائد عقود الدرر مصنفہ امام احمد بن محمد الطحاوی المتوفی ۳۲۱ھ۔

مناقب النعمان مصنفہ محمد بن احمد بن شعیب المتوفی ۳۵۷ھ۔ مناد

مناقب النعمان مصنفہ ابو العباس احمد بن الصلت المتوفی ۳۰۸ھ۔

شقائق النعمان مصنفہ علامہ زمخشری المتوفی ۵۳۰ھ۔

مناقب النعمان مصنفہ موفق الدین بن احمد المتوفی ۵۶۸ھ (زمخشری کے شاگرد)

مناقب النعمان مصنفہ امام ظہیر الدین المرغینانی المتوفی ۵۰۶ھ

مناقب النعمان مصنفہ امام محمد بن محمد کروری المتوفی ۸۶۸ھ ۔

کتاب الانتہا مصنفہ قاضی عبدالبر المتوفی ۴۶۲ھ ۔

مناقب ابی حنیفہ مصنفہ حافظ شمس الدین ذہبی ۔

البستان فی مناقب النعمان مصنفہ عبدالقادر قریشی المتوفی ۷۷۵ھ ۔

تبییض الصحیفہ مصنفہ علامہ سیوطی ۔

نظم الجمان مصنفہ شیخ صارم الدین ابراہیم بن محمد بن دقماق المتوفی ۸۰۹ھ ۔

مناقب الامام الاعظم مصنفہ مولانا محمد آفندی قاضی بغداد المتوفی ۱۱۳۶ھ ۔

مناقب الامام الاعظم مصنفہ مستقیم زادہ سلیمان سعدالدین آفندی المتوفی ۱۱۶۸ھ ۔

ان کے علاوہ اور بے شمار کتابیں جو امام کی تعریف اور توصیف میں لکھی گئی ہیں ، مقلد بحیثیت مقلد کو اپنے امام پر اور اس کے اقوال پر کلی طور پر اعتماد ہونا چاہیئے اور مقلد بالخصوص اجتہادی مسائل میں امام سے نصوص (صراحتہ) کا مطالبہ نہیں کر سکتا ۔

فقہاء حنفیہ کے طبقات

علماء اور فقہائے حنفیہ کے دو طبقات ہیں :

۱۔ پہلا طبقہ عراقیہ کا ہے ان سے مشہور امام جرجانی اور علامہ قدوری اور علامہ جصاص ہیں ۔

۲۔ دوسرا طبقہ ماوراء النہر کا ہے جن سے مشہور صاحب بدائع اور فخر الاسلام امام کرخی اور امام سرخسی اور صاحب کنز اور صدر شریعت عبداللہ بن مسعود ابن الی البخاری المتوفی ۷۴۷ھ اور علامہ محمد بن محمد بن عمر الاخیبکثی الحسامی المتوفی ۶۴۴ھ وغیرہ ہیں اور عراقیہ نقل مذہب میں زیادہ مضبوط ہیں اور علمائے ماوراء النہر کا زیادہ شغل فروع اور اجتہادیات کیساتھ ہے

خاص اور عام کی تعریف

خاص وہ لفظ ہے جو منفرد طور پر صرف کسی ایک معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو ۔ یعنی وہ لفظ جو کسی ایک مخصوص معنی پر دلالت کرے اور معنیٰ مقصودی میں کسی طرح کی شرکت قبول نہ کرے عام اس سے کہ وہ معنے جنسی ہو جیسا کہ حیوان

یا نوعی ہو جیسے انسان اور رجل یا شخص ہو جیسا کہ زید الغرض جب معنے مقصود ایک ایک ہو اس میں تعداد اور اشتراک نہ ہو تو خاص کہلائے گا اور عام وہ لفظ ہے جو جمع کے معنے کو متضمن ہو خواہ صیغہ جمع کا ہو جیسے زیدون اور مسلمون یا صیغہ جمع کا نہ ہو مگر معنے عموم پر دلالت کرتا ہے مثلاً اسماء موصولہ اور اسماء شرط اور قوم، جن، انس وغیرہ جو معنٰے جمع پر دلالت کرتے ہیں مناطقہ یوں تعریف کرتے ہیں :

عام وہ اسم ہے جو بہت سی ایسی چیزوں پر دلالت کرے جو بلحاظ تعداد کے ایک دوسرے سے متغائر ہوں مگر بلحاظ معنٰے ایک ہوں جیسے لفظ حیوان اور انسان یا سیاہ و سفید یا زید اور بکر اور خالد ۔

یہ احاد الفاظ اپنے عدد اور اشخاص کے اعتبار سے متغائر ہیں لیکن معنٰے انسانیت میں مشترک ہیں اور جماعت انسان میں سے ہر ایک ان کا مدلول بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یعنی ان میں سے کسی ایک کو مبتدا اور انسان کو خبر بنانا بلکل صحیح ہے مثلاً الابیض انسان والاسود انسان والمرءۃ انسان و زید انسان وغیرہ کہنا صحیح ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معنٰے انسانیت میں سب مشترک ہیں ورنہ ہر ایک کے متعلق انسانیت کی خبر دینا صحیح نہ ہوگا۔

خاص کی تعریف یہ ہے جو عام کے بعض افراد پر دلالت کرے ۔ جیسے ابیض کی نسبت انسان کی طرف یا رجل کی نسبت انسان کی جانب ۔ لہٰذا یہ انسان کے لحاظ سے خاص کہلائے گا ۔

اس تعریف کی بنا پر ایک ہی لفظ اپنی ذات کے اعتبار سے عام ہو سکتا ہے اور دوسرے اعتبار سے

خاص۔ مثلاً رجل کا لفظ باعتبار اپنی ذات کے عام ہے کیونکہ بہت سے ایسے متغائر اشخاص پر بولا جاتا ہے۔ جو معنی واحد (انسانیت) میں شریک ہیں مگر باعتبار انسان کے خاص ہے، اسیطرح انسان بلحاظ حیوان کے خاص ہے۔

اہلِ اصول اور مناطقہ کی تعریف میں فرق

یہ بات اب وضاحت طلب نہیں رہی کیونکہ اصولیہ کے نزدیک اشخاص کی ہر جمع (مثلاً زیدون) ہمیشہ عام کے ذیل میں شامل ہوگی کیونکہ اس پر عام کی تعریف صادق آتی ہے مگر اہلِ منطق کے نزدیک خاص کے تحت آئے گی بوجہ اس بات کے کہ یہ جمع ایسے اعداد پر دلالت نہیں کرتی جو بلحاظ اشخاص کے دو اور بلحاظ معنی کے متحد ہوں۔ علمائے اصول حنفیہ کے نزدیک عام خواہ سنّت میں وارد ہو یا قرآن میں قطعی الدلالۃ ہوتا ہے۔ جب عام قطعی الدلالۃ ہے تو احادیث (خبر احاد) سے اس کی تخصیص جائز نہیں ہو سکتی کیونکہ قطعی الثبوت ہونے کے بعد وہ قطعی الدلالۃ بھی ہے اور احادیث احاد اگرچہ قطعی الدلالۃ ہوتی ہیں لیکن ثبوت کے لحاظ سے ظنی ہوتی ہیں لیکن نہ تو وہ عموم قرآن سے معارض ہو سکتی ہیں اور نہ ہی اس کے بعض احکام کو منسوخ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے حنفیہ قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں کہتے ہیں قرآن پاک نے عمومی طور پر قرأت مایتیسر من القرآن کا حکم فرمایا ہے جس سے مطلق قرأت کہیں سے ہو فرض ہے۔ اگر سورت فاتحہ کو بھی فرض قرار دیا جائے تو یہ خبر واحد کے ساتھ تخصیص ہے جو کہ جائز نہیں ہے لہذا مطلق قرأت قرآن سے فرض ہوگی اور خبر واحد سے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہوگا۔

متقابلات

جس کی مراد واضح ہو اس کے معنی میں تاویل گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو پھر یہ وضاحت اور ظہور محض الفاظ سے ہے اس کو ظاہر کہتے ہیں اگر ظہور الفاظ کے ساتھ سیاق کلام کے ساتھ بھی ظہور رہا ہے تو اس کو نص کہتے ہیں۔ اگر تاویل کی گنجایش نہیں تو پھر اس میں نسخ کا احتمال ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کو مفسر کہتے ہیں اگر نہیں تو محکم ہے۔ ان

چار قسموں کے مقابلے میں بلحاظ خفا چار اور قسمیں ہیں (اسی لیے ان کو متقابلات کہتے ہیں)

کیونکہ جس کلام کے معنی میں پوشیدگی ہے یہ پوشیدگی کسی عارضہ کی وجہ سے ہوئی یا محض الفاظ میں ہی خفا ہے۔ اوّل کو خفی کہتے ہیں اور دوسرا جس کے الفاظ میں اشکال ہو یا تو ایسا اشکال ہے جو قرآن میں غور کرنے سے دور ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو اس کو مشکل کہتے ہیں، اگر تامّل اور غور سے دور نہیں ہو سکتا تو پھر اس اشکال کے دور کرنے میں متکلم کی جانب سے انکشاف کی امید ہے یا نہیں۔

اگر انکشاف کی امید ہے تو اس کو مجمل کہتے ہیں۔ اگر نہیں تو اس کو متشابہ کہتے ہیں۔

جو لوگ قراۃ خلف الامام کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ آیت کریمہ ماتیسر من القران میں "ما" جو ہے یہ کلمہ مجملہ ہے اور حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یقراء بفاتحۃ الکتاب (ابوداؤد) اس کی تفصیل ہے۔ لہٰذا سورۃ فاتحہ خلف الامام پڑھنی لازم اور فرض ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سوال اصول کے عدم معرفت کی بنا پر اٹھایا گیا ہے۔ کیونکہ کلمۂ "ما" الفاظ عموم سے ہے یہ مجمل نہیں ہے۔ اگر آیت مجمل ہوتی تو قبل از بیان اس پر عمل واجب نہ ہوتا۔ حالانکہ بلا توقف اس پر عمل فرض ہے۔ معلوم ہوا کہ "ما" مجملہ نہیں بلکہ عامہ ہے جس کی تخصیص خبر واحد سے جائز ہی نہیں

عموم بلوی

جس میں عوام مبتلا ہوں اور ترک میں تنگی اور حرج لازم آئے۔ جیسا کہ یہ طہارت اور نجاست میں معتبر ہے اسی طرح حلت اور حرمت میں بھی اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ المتوفی ۱۳۴۰ھ فتاوٰی رضویہ ص ۴۹ میں لکھتے ہیں:

اور عموم بلوی نجاست میں باعث تخفیف ہے

حتی فی موضع النص القطعی یعنی نص قطعی میں بھی عموم بلوی مؤثر ہو گا۔ بلکہ احکام شرعیت میں فرماتے ہیں:

ولا یخفی علی خادم الفقه ان هذا کما هو جار فی باب الطهارت والنجاست کذالك فی باب الحرمة والاباحته۔

خادم فقہ پر یہ بات مخفی نہیں کہ عموم بلویٰ جیسے کہ باب طہارت و نجاست میں
جاری ہوتا ہے ایسے ہی حرمت اور اباحت میں بھی جاری ہوتا ہے۔

حافظ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد فرماتے ہیں کہ متقدمین اور متاخرین

متقدمین اور متاخرین کے درمیان فرق یہ ہے کہ تین سو سال تک کا زمانہ متقدمین کا زمانہ ہے۔
اس کے بعد متاخرین کا زمانہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ متقدمین ہمارے فقہاء سے وہ ہیں:
جنہوں نے ایمہ ثلاثہ (ابو حنیفہ، ابو یوسف، امام محمد) کا زمانہ پایا ہے اور جنہوں نے نہیں پایا وہ
متاخرین ہیں۔

آئینہ اسماء

۱۔ حسن کا لفظ جب فقہ حنفی میں مطلقاً ذکر کیا جائے تو امام صاحب کے شاگرد حسن بن زیاد مراد ہوں گے۔ اگر کتب تفسیر میں مطلقاً حسن نام آئے تو حسن بصری مراد ہوں گے۔
(بحوالہ غایۃ البیان مصنفہ امیر کاتب الاتقانی المتوفی ۷۵۸ھ)

۲۔ جب ہماری کتابوں میں "فضلی" آئے تو ابو بکر محمد بن فضل الکماری البخاری المتوفی ۳۸۱ھ مراد ہوں گے۔

۳۔ اگر مطلق امام کا ذکر آئے تو ابو حنیفہ ہوں گے یہی مراد صاحب مذہب سے ہو گی اور صاحبین سے مراد ابو یوسف اور امام محمد ہیں اور شیخین سے مراد ابو حنیفہ اور ابو یوسف ہیں اور طرفین سے مراد امام محمد ابو حنیفہ ہوں گے۔ اگر امام ثانی ہو تو ابو یوسف اگر امام ربانی بولا جائے تو امام محمد ہوں گے۔ اگر ایمہ ثلاثہ بولا جائے تو ابو حنیفہ، ابو یوسف، امام محمد اور اگر ایمہ اربعہ ہوں تو امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد مراد ہوتے ہیں۔

۴۔ اگر کتب حنفیہ میں مطلقاً شمس الایمہ استعمال ہو تو شمس الایمہ سرخسی مراد ہوں گے۔ دوسروں کے ساتھ قید ہو گی مثلاً شمس الایمہ حلوانی، شمس الایمہ بکر بن محمد وغیرہ (بحوالہ

کتائب اعلام الاخیار مصنفہ محمود بن سلیمان کفوی المتوفی ۹۹۰ھ)

۵۔ علامہ عمر بن نجیم المصری صاحب وقف النہر المتوفی ۱۰۰۵ھ فرماتے ہیں کتب فقہ حنفی میں جو لفظ 'مشائخ' آتا ہے اس سے مراد وہ ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کا زمانہ نہیں پایا

کتب غیر معتبرہ

بعض وہ کتابیں ہیں جن پر علمائے محققین اعتماد نہیں کرتے اور نہ ہی ان کو قابل فتویٰ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ شرح مختصر الوصایا۔ اس کے مصنف شمس الدین محمد مفتی بخارا المتوفی ۹۶۲ھ قہستانی ہیں اور قہستانی کی شرح مختصر الوقایہ زاہدی معتزلی کی طرف مستند ہونے کی وجہ سے غیر معتمد علیہ ہے۔

۲۔ شرح مختصر لابی مکارم۔ ابو مکارم خود رجل مجہول ہے لہذا اس کی کتاب بھی درجہ جہالت میں ہونے کی وجہ سے ساقط ہے

۳۔ قنیہ اور الحاوی اور مجتبیٰ شرح مختصر القدوری۔ ان کا مصنف نجم الدین مختار بن محمود الزاہدی المعتزلی المتوفی ۶۵۸ھ ہے۔ زاہدی نقل روایات ضعیفہ میں مشہور و معروف ہے۔

۴۔ سراج وہاج شرح مختصر القدوری، اس کا مؤلف ابوبکر بن علی الحدادی المتوفی ۸۰۰ھ ہے ان کا قول بالخصوص اس وقت غیر معتبر ہوگا جبکہ یہ اصول موضوعہ اور قواعد معتبرہ کی مخالفت کریں یا وہ روایت ذکر کریں جن کو کتب معتبرہ اور معتمدہ نے ذکر نہیں کیا۔ گویا کہ ان کے تفردات بھی قبول نہیں کیے جائیں گے اور ثقہ کے خلاف روایات بھی غیر مقبول ہوں گی۔

(عمدۃ الرعایہ ص ۱۲)

---

[1] علامہ حسن بن عمار شرنبلالی المتوفی ۱۰۶۹ھ فرماتے ہیں کہ قہستانی پر اعتماد کر لینا چاہیے کیونکہ وہ مذہب امام کا ناقل ہے لیکن ابن عابدین نے علامہ حسن بن عمار پر سخت تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ قہستانی قابل اعتماد نہیں ہے۔ ۱۲

فتوٰی کے الفاظ یعنی وہ الفاظ جن سے یہ معلوم ہو کہ یہ قول مفتٰی بہ ہیں۔ وہ یہ ہیں:
وعلیہ الفتوٰی، وبہ یفتی، وبہ یعتمد، وبہ ناخذ
وعلیہ الاعتماد، وعلیہ عمل الیوم، وھو الصحیح، وھو الاصح، و
ھو الظاھر، وھو الاظھر، وھو المختار، وعلیہ فتوٰی من مشایخنا،
وھو الاشبہ، وھو الاوجہ۔

علامہ محمد بن محمد بن شہاب الخوارزمی البزازی المتوفی ۸۲۷ھ فرماتے ہیں کہ اشبہ کا معنی درایت کے لحاظ سے یہ منصوص کے زیادہ مشابہ اور راجح ہے۔ لہذا اس پر فتوٰی ہوگا۔

علامہ خیر الدین رملی فتاوٰی خیریہ میں فرماتے ہیں کہ فتوٰی کے بعض لفظ بعض سے زیادہ مضبوط اور پختہ ہیں۔ مثلاً فتوٰی کا لفظ صحیح، اصح اور اشبہ سے زیادہ وقیع ہے اور وبہ یفتی کا لفظ فتوٰی علیہ سے اور اصح سے زیادہ مضبوط ہے صحیح اور احوط زیادہ قوی ہے احتیاط کے لفظ سے اور علامہ ابراہیم حلبی المتوفی ۹۵۶ھ لکھتے ہیں کہ جب ایک امام لفظ "صحیح" استعمال کرے اور دوسرا "اصح" تو فتوٰی 'صحیح' پر ہوگا۔ کیونکہ صحیح پر دونوں کا اتفاق ہے۔ متفقہ قول قابلِ فتوٰی ہوتا ہے۔

لفظ قالوا کی تشریح اور توضیح فقہاء کرام قالوا (انہوں نے کہا) کا لفظ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں اختلاف ہو۔ علامہ حسام الدین حسین المتوفی ۷۱۴ھ نے نہایہ شرح ہدایہ کتاب الغصب میں اور علامہ محمد بن محمد بن محمود المتوفی ۷۸۶ھ نے عنایہ میں اور محدث بدر الدین عینی المتوفی ۸۵۵ھ نے بنایہ میں اور علامہ ابن ہمام فتح القدیر کتاب الصوم میں فرماتے ہیں کہ قالوا کا اشارہ ضعف کی طرف ہوتا ہے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ، حواشی کشاف میں لکھتے ہیں کہ قالوا کے ساتھ ضعف اور کمزوری کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

علامہ ابن عابدین رد المحتار ص ۴۴۵ جلد ۵ میں فرماتے ہیں:

لفظۃ قالوا تذکر فیما فیہ خلاف

یعنی لفظ قالوا وہاں بولا جاتا ہے جہاں اختلاف ہو۔

اسی وجہ سے جو مسئلہ قالوا کا مقولہ ہوگا یعنی جہاں قالوا بولا جائے گا وہ قول مفتی بہ نہیں ہوگا۔ وہابیہ اور دیابنہ کہتے ہیں کہ قاضی خاں نے کہا ہے :

رجل تزوج امرأۃ بغیر شہود فقال الرجل والمرءۃ خدا را وپیغمبر را گواہ کردیم قالوا یکون کفرا لانہ اعتقد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب وھو ما کان یعلم الغیب حین کان فی الاحیاء فکیف بعد الموت۔

یعنی ایک مرد نے ایک عورت سے بغیر گواہوں کے نکاح کیا پس مرد اور عورت نے کہا کہ خدا اور رسول کو ہم نے گواہ بنایا۔ کہتے ہیں کہ یہ کفر ہوگا اس لیے کہ اس نے اعتقاد کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ زندگی میں بھی غیب نہیں جانتے تھے۔ پس بعد وفات کیونکر جان سکتے ہیں۔

وہابیہ ، دیابنہ اور مودودیہ کہتے ہیں کہ جو حضور علیہ السلام کو عالم الغیب سمجھتا ہے وہ کافر ہے کیونکہ حضور غیب نہیں جانتے ، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکاح پر گواہ نہیں بن سکتے۔ ہم اہلسنت والجماعت اس کا جواب دیتے ہیں :

قاضی خاں کے کلام سے تو لازم آئے گا کہ جو خدا تعالیٰ کو عالم الغیب جانے گا وہ بھی کافر ہو جائیگا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو بھی نکاح پر گواہ بنایا جائے تو نکاح نہیں ہوگا۔ اب خدا کو بھی غیب نہ ہوگا۔ قاضی خاں کے قول کے مطابق تمام وہابیہ اور دیابنہ کافر ہوں گے کیونکہ وہابیہ خدا کو عالم الغیب جانتے ہیں جیسا کہ اہلسنت والجماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب جانتے ہیں اور قاضی خاں نے خدا کے گواہ نہ ہونے پر بھی نفی (تصریح) کر دی ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی خدا کو بھی نکاح پر گواہ بنائے گا تو نکاح نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ (اصل مبحث) قاضی خاں

کی عبارت میں لفظ قالوا ہے جوکہ قاضی خاں کے نزدیک بھی غیر پسندیدہ ہے ۔

علّامہ ابراہیم حلبی غنیۃ المستملی میں لکھتے ہیں :

کلام قاضی خاں یشیر الی عدم اختیارہ لہ حیث قال قالوا لا یصلی علیہ فی القعدۃ الاخیرۃ ففی قولہ قالوا اشارۃ الی عدم استحسانہ لہٗ والی انہ غیر مروی عن الائمۃ کما قلنا فان ذالک متعارف فی عباراتھم ۔

قاضی خاں کا کلام ان کی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انہوں نے کہا قالوا الخرہ پس اُن کے قالوا کہتے میں اشارہ ہے کہ یہ قول غیر مستحسن اور غیر پسندیدہ ہے اور یہ اماموں سے بھی مروی نہیں ہے ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کیونکہ یہ فقہاء کی عبارات متعارف اور مشہور ہے ۔

معلوم ہوا کہ قاضی خاں کی عبارت خود قاضی خان کے نزدیک غیر مستحسن ہے اور غیر مروی و ضعیف و مرجوح ہے ۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ فتویٰ دینا اور حکم لگانا حد درجہ کی جہالت ہے ۔ دیکھئے درمختار صہ۳۰ جلد ا میں ہے :

ان الحکم والفتیا بالقول المرجوح جھل وخرق للاجماع

اور جماع بے شک ضعیف اور مرجوح قول کے ساتھ حکم کرنا اور فتویٰ دینا جہالت اور خلاف اجماع ہے ۔

اب گویا کہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو عالم الغیب جانتا ہے اس کو وہابیہ کا کافر کہنا حد درجہ جہالت و سفاہت اور حماقت ہے ۔

علّامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار جلد ۲ صہ۲۷۷ پر لکھتے ہیں ،

جو حضور علیہ السّلام کو عالم الغیب جانتا ہے وہ کافر نہیں ہوگا ۔

لان الاشیاء تعرض علی روح النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی تمام چیزیں روح مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم پر پیش کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام چیزوں کو جانتے ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم عالم غیب ہوئے تو اب اگر کوئی حضور علیہ السلام کو نکاح پر گواہ بناتا ہے تو اس کو اس وجہ سے کافر نہیں کہنا چاہئیے کہ اس نے حضور علیہ السلام کو عالم الغیب سمجھا ہے اور اس کا نکاح اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حضور علیہ السلام کو عالم الغیب سمجھتا ہے۔ پھر تو چاہیئے کہ جو اللہ تعالیٰ کو گواہ رکھے تو نکاح ہو جائے کیونکہ وہابیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے حالانکہ نکاح پھر بھی نہیں ہوتا۔

نکاح نہ ہونے کی وجہ وہ نہیں جو دیابنہ اور وہابیہ نے سمجھی ہے بلکہ معاملات کا تعلق باہمی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے معاملات میں عمومی طور پر شہادت کا تعین کر دیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

اے ایمان والو! جب کسی مدت مقررہ کے لیے تم باہمی قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو پھر اپنے مردوں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

چونکہ یہ حکم عام ہے اسی کے ماتحت ہی فقہاء نے معاہدۂ نکاح کے لیے دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کی شہادت رکھی ہے۔

شافعیہ کے نزدیک گواہ دونوں مرد ہوں گے۔ جب تعین شہادت کر دیا گیا ہے تو اب ایسی شہادت کے سوا نکاح کا انعقاد ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر نکاح کی اجازت سوائے شہادت معینہ کے دی جائے تو پھر لاقانونیت کی مرض اور وبا پھیل جائے۔ ہر مرد اور عورت آوارگی اختیار کرے حسب ونسب و کفو اور برادری وغیرہ کا ہرگز خیال نہ رکھا جائے بلکہ ہر آدمی یہ کہہ دے گا کہ میرا نکاح فلاں عورت کے ساتھ ہو گیا ہے۔ ہمارے درمیان اللہ اور اس کا رسول گواہ ہے۔ تمدنی حالات کلی طور پر تباہ ہو جائیں۔ آوارگی کا دور دورہ اور معاشرہ اور ثقافت اور تہذیب میں غیر معمولی بگاڑ پیدا ہو جائے۔ لہٰذا شریعت اسلامیہ نے انتظامی امور اور مصالحہ تحسینیہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے شہادت

اور گواہوں کی صورت کا تقرر کر دیا ہے۔

لفظ "جواز" کی تحقیق

امام نووی شافعی شرح مہذب میں فرماتے ہیں کہ جواز کبھی بمعنی صحت کے ہوتا ہے اور کبھی بمعنی حلال کے۔ اسی وجہ سے فقہاء صلوٰۃ مکروہ پر لفظ جواز اور صحت استعمال کرتے ہیں۔ جس سے مراد ان کی صحت متقابلہ بطلان کے ہے۔ نفی کراہت اور قصد اباحت ان کا مقصود نہیں ہے۔ بدیں وجہ اکثر شارحین نے جواز اور صحت کی تفسیر جواز مع الکراہت کے ساتھ کر دی ہے۔

امام شمس الدین محمد بن محمد الشہیر بابن امیر حاج المتوفی ۸۷۹ھ (امیر حاج کے ساتھ مشہور ہیں) فرماتے ہیں کہ کبھی جو شرعاً ممنوع نہ ہو اس پر جواز کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اب جواز میں عمومیت پیدا ہو جائے گی۔ مباح، مکروہ، مندوب، واجب کو شامل ہو جائے گا۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ بھی جواز کی تفسیر عموماً یہی کرتے ہیں جو کہ امام شمس الدین امیر حاج نے کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جواز کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ جس کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہ فرمایا ہو۔ (فتاویٰ افریقہ ص ۹۷)

لفظ "لا بأس" کا مفہوم

فقہاء اپنی عبارات میں لفظ "لا بأس" بھی استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ یہ کام جائز ہے اور مباح ہے اس میں اتنی شدت اور سختی نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ لا بأس کا زیادہ تر استعمال مباح میں ہوتا ہے اور جس کا ترک بہتر ہو اس میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

لا بأس من البوس ای لا شدۃ علیہ من جھۃ الشرع۔

یعنی لا بأس کا لفظ بوس سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی شدت اور سختی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں شرع کی طرف سے کوئی شدت اور سختی نہیں ہے۔ یعنی جہاں فقہاء

نے لا بأس کا استعمال کیا ہے یہ مسئلہ مباح ہے۔ شریعت نے اس میں سختی اور ممانعت نہیں کی علامہ شامی یہ بھی لکھتے ہیں کہ یا لا بأس کا لفظ البأس[1] سے ماخوذ ہے۔ اب معنی یہ بنے گا کہ اس کام کے کرنے والے کو نہ ہی گناہ ہو گا اور نہ ہی اس کو کوئی اجر و ثواب ہو گا۔ کیونکہ یہ کام اُس کے لیے مباح ہے مثلاً:

عن ابی حنیفة انه قال لا بأس بالفرو من السباع کلها وغیر ذالك من المیتة المدبوغة والمذکاة وقال ذکاتها دباغها۔

(فتاویٰ عالمگیریہ جلد ۵ صفحہ ۳۳۳)

یعنی امام ابو حنیفہ سے روایت ہے کہ سباع (شیر وغیرہ) کی کھال کے فرو (ملبوسات) دباغت کے بعد استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں اور کھال (دھونے) دباغت سے پاک ہو جاتی ہے۔

اب یہاں لا بأس کا مفہوم یہی ہے کہ مذکورہ کھالوں کے ملبوسات استعمال کرنے مباح اور جائز ہیں۔ ان میں شریعت کی طرف سے کوئی ممانعت اور سختی نہیں ہے۔

لفظ ینبغی اس لفظ کا معنی لائق اور مناسب کیا جاتا ہے لیکن متاخرین کے عرف میں غالباً مستحب پر بولا جاتا ہے اور متاخرین اس میں عمومیت رکھتے ہوئے واجب پر بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن عابدین نے ردالمختار میں بیان کیا ہے۔

اصل ہر چیز میں اباحت ہے شریعت کا یہ ضابطہ اور قاعدہ کلیہ ہے الاصل فی الاشیاء الاباحة۔ تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مباح ہیں یعنی ہر چیز مباح اور حلال ہے۔ ہاں اگر کسی چیز کو شریعت منع کر دے تو وہ حرام

---

[1] البأس جرأت کو کہتے ہیں۔ لا بأس یعنی اس کے کرنے میں کوئی جرأت نہیں ہے کیونکہ یہ امر مشروع اور جائز ہے۔ ۱۲

ہے یا منع ہے - یہ قاعدہ قرآن اور سنّت اور اقوال فقہاء سے مستنبط ہے - قرآن پاک میں ہے:

یا ایّھا الذین آمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم
و ان تسئلو عنھا حین ینزل القرآن تبد لکم عفا اللہ عنھا۔

لے ایمان والو ایسی باتیں نہ پوچھو کہ جو تم پر ظاہر کی جاویں تو تم کو بری لگیں اور اگر
ان کو اس وقت پوچھو گے کہ قرآن اتر رہا ہے تو ظاہر کر دی جاویں گی اللہ ان کو معاف
کر چکا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کا کچھ بیان نہ ہوا ہو نہ حلال ہونے کا نہ حرام ہونے کا تو وہ معافی اور اباحت کے حکم میں ہے - حدیث پاک میں ہے:

الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ماحرم اللہ فی کتابہ و ما
سکت عنہ فھو مما عفی عنہ - (مشکوٰۃ المصابیح)

حلال وہ جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ جس کو اللہ نے اپنی
کتاب میں حرام کیا اور جس سے خاموشی فرمائی وہ معاف -

حدیث سے ثابت ہوا کہ چیزیں تین طرح کی ہیں - ایک وہ جن کا حلال ہونا صراحتہً قرآن میں مذکور ہے - دوسرے وہ جن کی حرمت صراحتہً آگئی - تیسرے وہ جن سے خاموشی فرمائی یہ معاف ہے - علّامہ شامی فرماتے ہیں:

المختار ان الاصل الاباحتہ عند الجمہور من الحنفیہ والشافعیہ
جمہور حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہی قاعدہ ہے کہ اصل مباح ہوتا ہے -

شامی جلد ۵ صہ۲۵۵ میں ہے کہ حرمت اور کراہت کے اثبات میں احتیاط نہیں ہے کیونکہ یہ تو دلیل کے محتاج ہیں -

بل فی القول بالاباحتہ اللتی ھی الاصل
بلکہ احتیاط اباحت میں ہے جو کہ اصل ہے -

یہاں سے بھی ثابت ہوا کہ اباحت اصل ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فتاویٰ رضویہ صفحہ ۵۵ میں لکھتے ہیں:

شرع مطہر کی اصل کلی ہے کہ جو امر مقاصد شرع سے مطابق ہو محمود ہے اور جو مخالف ہو مردود اور حکم مطلق اس کے تمام افراد میں جاری و ساری جب تک کسی خاص خصوصیت سے نہی شرعی وارد نہ ہو تو بعد ثبوت حسن مطلق حسن مقید ہر کسی دلیل کی حاجت نہیں بلکہ حسن مطلق ہے۔ اس پر دلیل قاطع اور باقاعدہ مناظرہ اثبات ممانعت ذمہ مانع معہذا اصل اشیاء میں اباحت ہیں تو قائل جواز متمسک با اصل ہے کہ اصلاً دلیل کی حاجت نہیں رکھتا۔

اعلیٰ حضرت کی عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ اصل اشیاء میں مباح ہے۔ اسی قاعدہ اور ضابطہ کیا تھ فقہاء نے بے شمار جزئیات کا حل پیش کیا ہے۔ وہابیہ اور دیابنہ کہتے ہیں کہ میلاد شریف اور عرس پاک اور گیارہویں کا ثبوت پیش کرو؟

قطع نظر دلائل کے ہم اہلسنّت کہیں گے کہ ہر چیز میں اباحت ہے۔ کوئی چیز حرام اور ممنوع نہ ہوگی۔ جب تک شریعت اس کو حرام یا منع نہ کرے بلکہ ہم وہابیہ کو کہیں گے کہ بتاؤ: کہاں میلاد، عرس، گیارہویں، تیجا، دسواں، چالیسواں حرام لکھا ہوا ہے۔ جب یہ حرام نہیں تو اس قاعدہ کے ساتھ (جو قرآن و سنّت اور اقوال فقہاء سے مستنبط ہے) میلاد، عرس، گیارہویں، وغیرہ جائز اور مباح ہیں۔ اگر وہابیہ اعتراض کریں کہ مباح میلاد، عرس، گیارہویں کو ہم بھی مانتے ہیں لیکن اہل السنۃ والجماعۃ اس مباح کو بہ نیت قربۃ (ثواب) کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان میں بدعت آجاتی ہے۔ لہٰذا یہ بدعت ہیں تو ہم جواباً کہیں گے کہ یہ تمہاری بات غلط بلکہ شریعت مطہرہ پر افتراء عظیم ہے کیونکہ مباح کو بہ نیت قربت کرنا بدعت نہیں بناتا بلکہ مباح بہ نیت قربت کرنا اس کو قربت بنا دیتا ہے اور ہر قربت طاعت ہے اور طاعت حق ہے اور حق کو بدعت کہنا جہالت عظیم ہے۔ دیکھئے علّامہ شامی فرماتے ہیں:

اما المباحات فتختلف صفتها باعتبار ما قصدت لاجله فاذا

قصد به التقوی علی الطاعات او التوصل الیها کانت عبادۃ ۔

مباح کی صفتیں باعتبار مقصود کے مختلف ہیں ۔ جب مباح کے ساتھ تقویٰ علی الطاعۃ مقصود ہو یا اس کی طرف وسیلہ مقصود ہو تو پھر یہی مباح عبادت بن جائیگا ۔

وہابیہ جو ان امور (میلاد وغیرہ) کو منع کرتے ہیں ۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز جواباً فرماتے ہیں :

ادنیٰ درجہ منع کا کراہت ہے اور کراہت کے ثبوت کے لیے دلیل خاص کی ضرورت ہے اور بلا دلیل شرعی منع کرنا شریعت پر افتراء اور تہمت ہے ۔

ردالمختار صد ۶۴۳ ج میں ہے :

لا یلزم منه ان یکون مکروها الا بنهی خاص ان الکراهۃ حکم شرعی فلا بد له من دلیل ۔

بحرالرائق جلد ۲ صد ۱۷۶ میں ہے :

لا یلزم من ترک المستحب ثبوت الکراهۃ اذ لا بد لها من دلیل خاص ۔

یعنی ثبوت کراہت کے لیے دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ کراہت حکم شرعی ہے اور حکم کے لیے دلیل کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔

وہابیہ جواز کے لیے تو دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن جو حکم ہے یعنی کراہت اس کے لیے دلیل کو ضروری تصور نہیں کرتے ۔ (نہج السلامۃ صد ۱۵)

الغرض ہر چیز میں اصل اباحت ہے جس کے لیے دلیل کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ ضابطہ قرآن اور سنت اور اقوال فقہا سے مستنبطہ ہے ۔ اس ضابطہ کو فقہا اور محدثین اور مفسرین نے کئی مقامات پر استعمال کیا ہے ۔

بدعت اور اس کی تقسیم

بدعت کا لغوی معنی نئی چیز ہے - امام نووی شافعی بدعت کا لغوی معنی لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

بدعت وہ کام ہے جو بغیر گزری مثال کے کیا جائے اور اصطلاح شریعت میں بدعت کا معنی یہ ہے کہ وہ اعتقاد یا وہ عمل جو کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ حیات ظاہری میں نہ ہوں بعد میں ایجاد ہوئے -

علمائے محققین فرماتے ہیں - بدعت دو قسم پر ہے - سیئہ ، حسنہ - امام ابوبکر احمد بن حسین البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ نے اپنی سند کے ساتھ امام شافعی سے روایت کی ہے :

احدث وخالف کتابا او سنته او اجماعا او اثرا فهو البدعته الضلالة وما احدث من الخير ولم يخالف من ذالك فهو البدعته المحمودة -

جو بات قرآن و سنت اور اجماع کے مخالف ہو وہی بدعت سیئہ اور ضلالت (گمراہی) ہے اور جو بات اچھی پیدا ہوتی ہے لیکن مخالف نہیں پس وہ بدعت حسنہ اور محمودہ (قابل تعریف) ہے -

امام غزالی فرماتے ہیں :

انما المحذور بدعته تراغم سنته ماموراً بها ولا يمنع ذالك من كونه محدثا فكم من محدث حسن -

یعنی منع وہ بدعت ہے جو کسی ایسی سنت کو مٹا دے جس کے قائم رکھنے کا ہم کو حکم کیا گیا ہے اور یہ منع نہیں کیا جائے گا کہ یہ بات نئی ہے کیونکہ بہت سی نئی باتیں نکلی ہوئی بہتر ہیں -

معلوم ہوا کہ ہر نئی چیز بدعت ضلالہ اور گمراہی نہیں ہے - وہابیہ اور دیابنہ بدعت کا معنی کرنے میں غلطی کرتے ہیں - کہتے ہیں :

البدعة مالم یکن فی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی جو چیز حضور علیہ السلام کے زمانے میں نہ تھی وہی بدعت ہے اور پھر کہتے ہیں کہ ہر بدعت ضلالہ ہے حالانکہ ہر بدعت ضلالہ نہیں ہے۔ جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے کہ بدعت دو قسم ہے بدعت ضلالہ بھی اور بدعت حسنہ (محمودہ) بھی۔

بدعت ضلالہ کی تعریف یہ ہے:

ما احدث علی خلاف الحق المتلقی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم او عمل او حال بنوع شبهته

ہم کو جو دلائل شرع کتاب وسنّت و اجماع، قیاس وغیرہ امور حقہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچے ہیں ان کے خلاف اور ان کے مٹانے والی جو چیز ایجاد ہو گی وہ بدعت ضلالہ ہے۔
(انوار الساطعہ[1] ص ۴۸)

ہر بدعت ضلالہ نہیں بلکہ بدعت ضلالہ وہ ہے جو قرآن وسنّت و اجماع و قیاس اور امور حقہ کے مخالف ہو۔ وہابیہ تو بدعت کو امور عامہ سے سمجھتے ہیں۔ ہر نئی چیز کو بدعت ضلالہ کہہ دیتے ہیں۔ وہابیہ کے نزدیک مدارس عربیہ (وہابیہ)، خوبصورت مساجد، صد سالہ جشن دیوبند تحریک چلانے کے لیے جلسے جلوس اور ہزار ہا نئی چیزیں جو لوگوں کے تعامل میں ہیں بلکہ یہ لوگ خود بھی عامل ہیں اور بدعت ضلالہ میں یہ چیزیں بھی ان کے نزدیک شمار ہوں گی اور ان کے مرتکب گمراہ ہوں گے۔ لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بدعت ضلالہ نہیں بلکہ وہ بدعت جو امور حقہ کے منافی اور مخالف ہو ضلالہ ہے۔ اسکے علاوہ حسنہ ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی سنہ ۱۰۵۲ھ فرماتے ہیں:

دآنچہ موافق اصول وقواعد سنّت اوست وقیاس کردہ شدہ اسبت آں را بدعت

---

[1] مصنفہ حضرت مولانا عبدالسمیع المتوفی سنہ ۱۳۱۸ھ۔ ۱۲

حسنہ گویند و آنچہ مخالف آں باشد باعث ضلالت گویند۔"

جو بدعت کہ اصول اور قوانین اور سنّت کے موافق ہے اور اس سے قیاس کی ہوئی ہے اس کو بدعت حسنہ کہتے ہیں اور جو اس کے خلاف ہے اس کو بدعت گمراہی کہتے ہیں۔

جب یہ معلوم ہوگیا کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں بدعت سیئہ اور بدعت حسنہ تو پھر بدعت سیئہ کی دو قسمیں ہیں۔ مکروہ ، حرام۔

مکروہ ، حرام۔

بدعت حسنہ کی تین قسمیں ہیں،

بدعت جائز ، بدعت مستحب ، بدعت واجبہ۔

ملّا علی قاری الحنفی لکھتے ہیں،

البدعة اما واجبة کتعلم النحو وتدوین اصول الفقه واما محرمة کمذهب الجبریة واما مندوبة کاحداث الروابط والمدارس وکل احسان لم یعهد فی الصدر الاول وکالتراویح ای بالجماعة العامة واما مکروهة کزخرفة المساجد واما مباحة کالمصافحة عقیب الصبح والتوسع بلذیذ الماکل والمشارب یدعة۔

یا تو واجب ہے جیسے علم نحو کا سیکھنا اور اصول فقہ کا جمع کرنا اور یا حرام ہے جیسے جبریہ کا مذہب اور یا مستحب ہے جیسے مسافر خانوں اور مدرسوں کا ایجاد کرنا اور ہر وہ اچھی بات جو پہلے زمانہ میں نہ تھی اور جیسے عام جماعت سے تراویح پڑھنا اور یا مکروہ ہے جیسا کہ مسجدوں کو فخریہ زینت دینا اور یا جائز ہے جیسے فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا اور عمدہ عمدہ کھانوں اور شربتوں میں وسعت کرنا۔

اور یہ خیال کر لینا کہ جو بدعت ہوتی ہے اس میں حسن کیسے آسکتا ہے، یہ بھی غلط ہے۔ دیکھو امام شافعی علی القاری علامہ شامی، امام غزالی اور دیگر فقہائے نے بدعت کو حسنہ تسلیم کیا ہے اور

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تراویح کی باقاعدہ جماعت مقرر فرما کر فرمایا:

نعمۃ البدعۃ ھٰذہٖ۔ (یہ تو بہت اچھی بدعت ہے)

اب حضرت عمر فاروق نے اس کو بدعت فرمایا ہے حالانکہ اس میں حسن بھی ہے۔ اسی لیے تو علی القاری نے بدعت مستحبہ میں اس کو شمار کیا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ایجادات صحابہ کرام کو ہم سنّت صحابہ سے تصوّر کرتے ہیں ورنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بدعت کا لفظ تراویح کی جماعت (مقرر کردہ) پہ استعمال فرمادیا ہے اور جو بعض اکابرین نے فرمایا ہے کہ بدعت میں حسن نہیں ہوتا۔ اس سے مراد بدعت سیئہ یعنی جو امور حقہ کے منافی اور مخالف بدعت ہے اس میں حسن نہیں ہوتا نہ کہ اکابرین بدعت حسنہ کے منکر ہیں بلکہ وہ بدعت جو ماحی السنّۃ ہے۔ خلفاء اربعہ (ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان ذوالنورین، علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا منصب اجتہاد سے ارفع اور بلند ہے اور تشریع سے نیچے ہے کیونکہ شارع علیہ السّلام نے ان کی اقتداء کا خصوصی اور امتیازی حکم فرمایا ہے۔ اسی منصب کے تحت ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیس تراویح کا قیام مع الجماعت اور حضرت عثمان کی ندائے ثالث (اذان ثالث) کی زیادتی داخل ہے۔ حضرت عمر فاروق کا لفظ بدعت استعمال فرمانا ہی بدعت حسنہ کے وجود کے لیے کافی ہے۔ پھر تمام فقہا اور محدثین بدعت حسنہ اور سیئہ کے قائل ہیں۔

وہابیہ اور دیابنہ کا یہ کہنا کہ ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے صریح غلطی ہے بلکہ بعض بدعتیں واجب ہیں بعض جائز اور بعض مستحب۔

مفتی کے لوازمات دراصل فتویٰ دینا مجتہد کا کام ہے کہ سائل کے سوال کا جواب کتاب، سنّت، اجماع، قیاس سے وہی دے سکتا ہے۔ افتاء کا دوسرا مرتبہ نقل ہے یعنی صاحب مذہب سے جو بات ثابت ہے سائل کے جواب میں اسے بیان کردینا اس کا کام ہے۔ یہ حقیقۃً فتویٰ دینا نہ ہوا بلکہ مستفتی (سوال کرنے والے) کے لیے مفتی (مجتہد) کا قول نقل کردینا ہوا کہ وہ اس پر عمل کرے (بہار الشریعۃ بحوالہ فتاویٰ عالمگیری)

مفتی ناقل کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ قول مجتہد کو مشہور متداول اول و معتبر کتابوں سے اخذ کرے، غیر مشہور کتب سے نقل نہ کرے۔

قال العلی القاری من القواعد الکلیۃ ان نقل المسائل الفقہیۃ لا یجوز الا من الکتب المتداولۃ لعدم الاعتماد علی غیرھا۔

علی القاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قواعد کلیہ سے ہے کہ مسائل فقہیہ وغیرہ کو مشہور اور معتبر کتابوں سے نقل کرنا چاہیئے کیونکہ دیگر کتب پر اعتماد ہی نہیں ہے۔

جو شخص فتوٰی دینے کا اہل ہو اس کے لیے فتوٰی دینے میں کوئی حرج نہیں۔ صاحب بہار شریعت لکھتے ہیں:

بلکہ فتوٰی دینا لوگوں کو دین کی بات بتانا ہے اور یہ خود ایک ضروری چیز ہے کیونکہ کتمان علم حرام ہے۔ حاکم اسلام پر لازم ہے کہ اس کا تجسس کرے کہ کون فتوٰی دینے کے قابل ہے اور کون نہیں اور جو نااہل ہو اسے اس کام سے روک دے کہ ایسے فتوٰی سے طرح طرح کی خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔ (بحوالہ فتاوٰی عالمگیری)

فاسق مفتی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اکثر متاخرین کی رائے یہ ہے کہ نہیں ہو سکتا کیونکہ فتوٰی امور دینیہ سے ہے اور فاسق کی بات دیانات میں غیر معتبر ہے۔ فاسق سے فتوٰی پوچھنا ناجائز اور اسکے جواب پر اعتماد نہ کرے کہ علم شریعت ایک نور ہے جو تقوٰی کرنے والوں پر فائض ہوتا ہے جو فسق و فجور میں مبتلا ہوتا ہے اس سے محروم رہتا ہے۔ (در مختار)

مفتی یہ بھی خیال رکھے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول پر فتوٰی دے کیونکہ امام کا قول مقدم ہے پھر امام ابو یوسف پھر امام محمد اور امام زفر اور حسن بن زیاد کے قول پر فتوٰی دے۔ (عمدۃ الرعایہ صہ ۱۲)

البتہ جہاں اصحاب فتوٰی اور اصحاب ترجیح نے امام اعظم کے علاوہ دوسرے قول پر فتوٰی دیا ہو یا ترجیح دی ہو تو جس پر فتوٰی یا ترجیح ہے اس کے موافق فتوٰی دیا جائے گا۔ (بحوالہ

ردالمحتار)

علامہ شامی لکھتے ہیں کہ مفتی پر یہ بھی لازم ہے کہ سائل سے واقعہ کی تحقیق کرلے ۔ مفتی اپنی طرف سے شقیں نکال کر سائل کے سامنے بیان نہ کرے مثلاً یہ صورت ہے تو یہ ہے اور یہ ہے تو یہ حکم ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو صورت سائل کے موافق ہوتی ہے اسے اختیار کرلیتا ہے اور گواہوں سے ثابت کرنے کی اگر سائل کو ضرورت ہوتی ہے تو گواہ بھی بنالیتا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ نزاعی معاملات میں اس وقت فتوٰی دے جب فریقین کو طلب کرلے اور ہرایک کے بیان دوسرے کی موجودگی میں لے اور جو حق پر ہو اس کو فتوٰی دے دوسرے کو نہ دے ۔ علامہ شامی یہ بھی لکھتے ہیں :

مفتی کو بیدار مغز اور ہوشیار ہونا چاہیئے ۔غفلت برتنا مفتی کے لیے ٹھیک نہیں ۔کیونکہ اس زمانہ میں اکثر لوگ حیلہ سازی سے واقعات کی صورت تبدیل کرکے فتوٰی حاصل کرلیتے ہیں اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ فلاں مفتی نے مجھے فتوٰی دیا ہے ۔

علامہ شامی نے نہایت تجربہ اور مزاولہ کی بات لکھی ہے ۔ مجھے خود متعدد مرتبہ ایسے واقعات کا سامنا ہوا ہے ۔ سائل بڑی مکاری اور چرب زبانی سے غلط بیانی کرکے فتوٰی لے لیتے ہیں بعد میں دوسرا فریق پیش ہوجاتا ہے معاملہ نہایت پیچیدہ ہوجاتا ہے ۔ لہٰذا نزاعی معاملات بالخصوص نکاح اور طلاق کے مسائل میں مفتی کو یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ دونوں فریق جب حاضر ہوجائیں تو پھر فتوٰی دیا جائے ۔

فتاوٰی عالمگیریہ میں ہے کہ مفتی کو متحمل المزاج ہونا چاہیئے اگر مفتی سے غلطی ہوجائے تو اپنی غلطی میں رجوع کرنے سے ہرگز دریغ نہ کرے ۔ یہ نہ خیال کرے کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے ۔ کیونکہ غلط فتوٰی دے کر رجوع نہ کرنا خواہ بوجہ حیا ہو یا بوجہ تکبر قطعاً حرام ہے ۔ لہٰذا اپنی غلطی کا اعتراف کرے ۔ فتوٰی کو ختم کرنے کے بعد واللہ تعالیٰ اعلم یا اس کے مثل دوسرے الفاظ مفتی کو تحریر کردینے چاہئیں ۔

کتاب العقائد

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ماتریدیہ اور اشاعرہ میں کیا فرق ہے۔ کیا ان کا باہمی کوئی اختلاف بھی ہے یا نہیں۔ جواب باحوالہ تحریر فرمائیں۔

حافظ غلام محمد از منگلا کالونی

الجواب بعونہ تعالیٰ

اہلسنّت والجماعت کے دو گروہ ہیں۔ ایک اشاعرہ اور دوسرا ماتریدیہ۔ یہ دونوں فرقے اصول دین اور اعتقادات میں متفق ہیں۔ اشاعرہ کو اشاعرہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ منسوب ابوالحسن علی بن اسماعیل بن اسحاق بن اسماعیل بن عبداللہ بن بلال بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف ہیں اور الشیخ ابومنصور محمد بن محمد بن محمود السمرقندی ماتریدی المتوفی ۳۳۲ھ کی جو اعتقاد میں پیروی کرتے ہیں ان کو ماتریدیہ کہتے ہیں۔ چونکہ ابوالحسن اشعری المتوفی ۳۲۴ھ اور حضرت الشیخ ابومنصور ماتریدی (دونوں نے) مسائل اعتقادیہ میں بڑی تحقیق کی ہے۔ اس لیے مذہب اہلسنّت والجماعت گویا کہ ان میں ہی محصور ہو گیا۔ پھر امام ابوحنیفہ کے اصحاب اپنے آپ کو ماتریدیہ کہلانے لگے اور ایمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی، امام احمد) کے متبعین اور مقلدین نے اپنا نام اشعریہ رکھا اور حقیقت میں دونوں جماعتوں کا مسلک وہی ہے جو صحابہ،

تابعین اور مجتہدین سے ثابت ہے۔

علامہ نسفی "عمدہ" میں اور ابو عثمان اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن احمد بن اسماعیل صابونی المتوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالحسن اور ابو منصور ماتریدی کا بارہ مسائل میں آپس میں اختلاف ہے۔

پہلا مسئلہ تکوین کا ہے۔ تکوین کا معنی اخراج المعدوم من العدم الی الوجود یعنی معدوم چیز کو عدم سے وجود کی طرف نکالنا ہے۔ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ تکوین اللہ تعالیٰ کی صفت ازلی ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اشعری کہتے ہیں کہ تکوین صفت حادث ہے اور غیر قائم بذاتہ تعالیٰ ہے اور کہتے ہیں کہ تکوین صفات فعلیہ سے ہے نہ کہ صفات ذاتیہ سے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ صفاتِ ذاتیہ وہ ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں اور صفات فعلیہ تمام حادث ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کلام اللہ سُنا نہیں جاتا جو کچھ سُنا گیا ہے وہ کلام اللہ پر دال ہے (دلالت کرنے والا) اشعری کہتے ہیں کہ کلام اللہ ہی مسموع (سُنا گیا) ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بلا واسطہ کلام الٰہی کو ہی سُنا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم ازل سے موصوف بصفت حکمت ہے (حکمت سے مراد خواہ علم ہو یا احکام)، اشعریہ کہتے ہیں کہ اگر حکمت سے مراد علم ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ازلی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔ اگر احکام مراد ہیں تو یہ صفت حادث ہے پھر یہ قبیلہ تکوین سے ہو گی۔ کیونکہ صفات فعلیہ بتمامہ حادث ہیں۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کے لیے ارادہ کرنے والا ہے، جوہراً وعرضاً، طاعۃً ومعصیۃً مگر طاعت اس کی مشیت اور ارادہ اور قضا اور قدر اور رضا اور محبت اور اس کے امر سے واقع ہوتی ہے اور معصیت اس کی مشیت اور ارادہ اور اس کی قضا و قدر کے ساتھ ظہور پکڑتی ہے نہ کہ اس کی رضا و محبت اور اس کے امر سے واقع ہوتی ہے۔

اشعریہ کہتے ہیں کہ خدا کی رضا و محبت جمیع کائنات کو شامل ہے۔ چنانچہ اس کا ارادہ بجمیع کائنات کو شامل ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ ابوالحسن اشعری اور حضرت ابو منصور ماتریدی

کا اس مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے۔

پانچواں مسئلہ : ماتریدیہ کے نزدیک تکلیف مالا یطاق جائز نہیں ہے۔ ہاں مالا یطاق کی تحمیل جائز ہے۔ اشعریہ دونوں کو جائز کہتے ہیں۔

چھٹا مسئلہ ایمان بالتوحید کا ہے یہ دونوں کے نزدیک بالاتفاق فرض ہے مگر ماتریدیہ کہتے ہیں کہ عقل ایک آلہ ہے جس سے چیزوں کی اچھائی اور برائی معلوم ہوتی ہے اور اسی سے ہی وجوبِ ایمان اور شکر منعم معلوم ہوتا ہے اور فرماتے ہیں کہ حقیقت میں معرف اور موجب ایمان خدائے تعالیٰ ہے لیکن بواسطۂ عقل۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے مخلوق کی جہالت باعث عذر نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ رسل کو مبعوث نہ فرماتے تب بھی عقول کے ذریعہ واجب تعالیٰ کی معرفت مخلوق پر واجب تھی (مسلم الثبوت[1])

اشعریہ کہتے ہیں گو بعض چیزوں کی برائی اور اچھائی عقل سے معلوم ہوسکتی ہے لیکن کوئی چیز عقل کی وجہ سے واجب اور محرم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ عقل باعث تکلیف نہیں ہے بلکہ تکلیف کا مدار سماع اور نقل پر ہے۔

ساتواں مسئلہ : ماتریدیہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ سعید شقی ہوجائے اور شقی سعید ہوجائے اور اشعریہ کہتے ہیں کہ سعادت اور شقاوت کا مدار خاتمہ پر ہے۔ موجودہ حالت میں کسی کی شقاوت و سعادت پر حکم قطعی نہیں کیا جاسکتا اسی لیے اشعریہ کہتے ہیں کہ انا مومن ان شاء اللہ کہنا جائز ہے اور ماتریدیہ کہتے ہیں ولا ینبغی ان یقول ان شاء اللہ تعالیٰ (عقائد نسفی) کہ انا مومن ان شاء اللہ تعالیٰ کہنا نہیں چاہیئے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کا نزاع لفظی ہے کیونکہ جو شخص اپنے ایمان میں کسی قسم کا شک نہیں سمجھتا وہ بالیقین کہہ سکتا ہے انا مومن حقاً۔ جو یہ کہتا ہے کہ انجام اور خاتمہ معلوم نہیں وہ

---

[1] محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ ۔ ۱۲

انشاء اللہ بھی کہہ سکتا ہے۔

آٹھواں مسئلہ: ماتریدیہ کہتے ہیں کہ کفر سے درگزر کرنا عقلاً جائز نہیں ہے۔ اشعریہ کہتے ہیں کہ عقلاً جائز ہے۔

ناواں مسئلہ: ماتریدیہ کہتے ہیں کہ مومن کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا اور کافروں کا جنّت میں داخل ہونا عقلاً اور شرعاً جائز نہیں ہے۔ اشعریہ کہتے ہیں عقلاً جائز ہے اگرچہ شرع اس کے خلاف وارد ہے۔

دسواں مسئلہ: بعض ماتریدیہ کہتے ہیں کہ اسم اور مسمّٰی واحد ہیں اور بعض اشاعرہ کہتے ہیں کہ اسم، تسمیہ اور مسمّٰی کے غیر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسم کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ بعض عین مسمّٰی ہیں۔

۲۔ بعض غیر مسمّٰی ہیں۔

۳۔ بعض نہ عین مسمّٰی ہیں اور نہ غیر مسمّٰی ہیں اور اس میں سب کا اتفاق ہے کہ تسمیہ غیر مسمّٰی ہے اور تسمیہ کا معنی ما قامت بہ المسمّٰی ہے۔

گیارہواں مسئلہ: ماتریدیہ کہتے ہیں کہ نبوّت اور رسالت میں مذکر ہونا شرط ہے۔ عورت نبی اور رسول نہیں ہو سکتی۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ مذکر ہونا شرط نہیں ہے۔

بارہواں مسئلہ: ماتریدیہ اس کے قائل ہیں کہ بندہ کا فعل کسب ہے اور اللہ تعالیٰ کا فعل خلق ہے نہ کہ کسب۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ کے فعل کو ایجاد حق کہا جائے گا لیکن بندہ کے کسب کو مجازاً فعل کہا جاتا ہے۔

بہرصورت اشاعرہ اور ماتریدیہ دونوں اہل سنّت والجماعت ہیں ان کے معتقدات ایک ہی ہیں۔ جن مسائل اعتقادیہ میں ان کا باہمی اختلاف ہے وہ مندرجہ بالا بارہ مسائل ہیں جن کو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصّواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس حدیث پاک کے متعلق کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

ستفترق امتی ثلاثۃ سبعین کلہم فی النّار الا واحدۃ۔

عنقریب میری امت کے تہتّر فرقے ہو جائیں گے۔ تمام دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک جماعت کے وہ جنّت میں جائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر تمام فرقے (سوائے ایک کے) ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، کبھی بھی نہیں نکلیں گے تو یہ آیات اور احادیث کے مخالف ہے کیونکہ کوئی بھی مدّعی اسلام فرقہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ اگر یہ مطلب ہے کہ یہ فرقے کچھ وقت کے لیے دوزخ میں داخل ہوں گے تو اب یہ لازم آئے گا جو فرقہ نجات پانے والا ہے اس میں سے کوئی بھی دوزخ میں داخل نہ ہو۔ حالانکہ احادیث قطعیہ میں وارد ہے کہ مؤمن گنہ گار بھی کچھ وقت کے لیے دوزخ میں جائے گا۔ آپ اس حدیث کا صحیح مفہوم مذہب اہلسنّت والجماعت کے مطابق تحریر فرمائیں۔

المستفتی حافظ غلام محی الدّین۔ منگلا کالونی۔ ۲۱ $\frac{۵}{۷}$

الجواب بعونہ تعالیٰ

اس حدیث پر جو آپ نے سوال اٹھایا ہے۔ یہ سوال نیا نہیں بلکہ یہ ایک قدیم اور پرانا سوال ہے۔ علمائے متکلمین اور اشاعرہ اہلسنّت والجماعت نے اس کے کئی جوابات کتب عقائد اور ان کی شروح میں تحریر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کلہم فی النّار (وہ تمام دوزخ میں ہیں) قضیہ محصورہ موجبہ کلیہ ہے اور کل افرادی ہے۔ علّامہ محبّ اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ "سلم العلوم" میں لکھتے ہیں کہ کل تین قسم پر ہے:

الاوّل ان الکل بمعنی الکلی مثل کل انسان نوع وبمعنی الکل المجموعی کل انسان لا یسعہ ھذہ الدار وبمعنی الکل

الافرادی والفرق بین المفہومات الثلاثۃ ظاہر۔

یعنی پہلا کل بمعنی کلی ہے جیسا کہ ہر انسان نوع ہے اور دوسرا بمعنی کل مجموعی ہے، جیسا کہ مجموعہ انسان کو یہ دار گنجائش نہیں رکھتی اور تیسرا کل بمعنی افرادی ہے اور ان تینوں کے درمیان فرق ظاہر ہے۔

وجہ ظاہر یہ ہے کہ کل بمعنی کلی کا انقسام جزئیات کی طرف ہوتا ہے اور کل مجموعی کا انقسام اجزاء کی طرف ہوتا ہے اور کلی جزئی پر حمل ہوتی ہے اور کل جزء پر حمل نہیں ہوتا۔ اسی لیے جزئی اور جزء میں کافی حد تک فرق ہوتا ہے کہ جزئی پر کلی حمل ہوتی ہے۔ جیسا کہ زید جزئی ہے اس پر کلی (انسان) صادق آتی ہے۔ کہتے ہیں زید انسان چونکہ کل جزء پر حمل نہیں ہوتا اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے۔ الید انسان اور کل افرادی میں حکم ہر فرد پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ کلھم فی النار یعنی ان کا ہر ہر فرد دوزخ میں ہے بخلاف کل کلی کے اس میں فرد نہیں ہوتے اور کل مجموعی میں ہر شخص پر حکم نہیں ہوتا بلکہ مجموعہ اشخاص پر ہوتا ہے۔ بعض علماء نے ان تینوں کے درمیان یوں فرق بیان کیا ہے کہ کل بمعنی الکلی۔ کل افرادی کا جزء ہے اور کل افرادی پھر کل مجموعی کا جزء ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جزء کل کے ضرور مغائر ہوا کرتا ہے لہذا اس مسلک کے مطابق بھی ان تینوں میں ہر واحد دوسرے کا غیر ہوگا۔ جب تینوں کے درمیان فرق ہے تو حدیث پاک میں نہ کل کلی ہے اور نہ ہی کل مجموعی ہے بلکہ کل افرادی ہے جس میں حکم ہر ہر فرد پر ہوگا اور حدیث کا ترجمہ یہ بنے گا:

کل واحد من افراد کل فرقۃ فی النار۔ کہ ہر فرقہ کا ہر ہر فرد دوزخ

کہ ہر فرقہ کا ہر ہر فرد دوزخ میں ہے۔

گویا کہ یہ جملہ کلھم فی النار ایجاب کلی کے حکم میں ہے اور حدیث میں جو استثنا الا واحدۃ کی ہے وہ رفع ایجاب کلی ہے اور رفع ایجاب کلی علی تقدیر صدق جزئی کے بھی متصور ہے۔ اب معنی یہ بنے گا کہ ہر ہر فرد اس فرقہ کا داخل نہ ہوگا گو بعض افراد بوجہ تقصیرات اور

کوتاہی اعمال داخل فی النار ہوں گے ۔ اب دونوں کے درمیان فرق یہ ہوگا کہ فرقہ ناجیہ کے ہر ہر فرد دوزخ میں داخل نہیں ہوں گے ۔ اور فرقہ غیر ناجیہ کلھم فی النار داخل ہونگے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں مراد دخول من حیث الاعتقاد ہے یعنی باعتبار اعتقاد یعنی فرقہ ناجیہ داہل السنۃ والجماعۃ ہرگز اعتقاد کے لحاظ سے داخل نہ ہوگا اگرچہ اعمال کی کوتاہی سے دخول فی النار ہو جائے ۔ چونکہ حدیث میں دخول فی النار من حیث الاعتقاد مراد ہے اسی وجہ سے شارع علیہ السلام نے فرقہ ناجیہ کی جہاں تعریف بیان فرمائی ہے وہاں اعتقاد ہی مراد ہے ۔ فرمایا :

الذین ھم علی ما انا علیہ واصحابی ۔

فرقہ ناجیہ وہ ہے جو میرے اور اصحاب کے راستہ پر چلے ۔

یعنی جو میرے اور اصحاب کے تعلیمات اور معتقدات ہیں وہی فرقہ ناجیہ کے ہوں گے ۔ اسی حدیث کے اوّل میں فرمایا یہود کے اکہتر فرقے ہوئے اور نصاریٰ کے بہتر ہوئے اور میری امت کے تہتر ہوں گے ۔ یہ افتراق بھی عقائد کے لحاظ سے ہے لہٰذا حدیث مسئولہ کا مطلب یہی ہے کہ فرقہ ناجیہ اعتقاد کے لحاظ سے دوزخ میں داخل نہیں ہوگا ۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے ۔ یہاں ہمارے ہاں ایک وہابی مولوی کہتا ہے : خدا کو جھوٹ بولنے پر قدرت ہے کیونکہ جھوٹ ایک شئی ہے ، اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اور انسان جھوٹ پر قادر ہے ۔ اگر خدا نہ ہو تو خدا کی قدرت کیا بندے سے بھی کم ہے ۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے ۔ آپ تفصیلی جواب معہ حوالہ کتب لکھ کر مشکور فرمائیں ۔

سائل مولوی محمد شریف ساقی ۔ نارو دال ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

جھوٹ بولنا عیب ہے جیسا کہ چوری یا زنا وغیرہ کرنا عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ جو سوال میں ایک وہابی ملّاں کا ذکر کیا گیا ہے یہ تو تمام وہابیہ اور دیابنہ کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ (امکان کذب) پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مولوی خلیل احمد انبیٹھوی المتوفی ۱۳۴۶ھ نے براہین قاطعہ لکھی اور مولوی محمود الحسن المتوفی ۱۳۳۹ھ نے جہد المقل میں لکھا کہ خدا جھوٹ بولنے پر قادر ہے حالانکہ وہابیہ اور دیابنہ کا یہ قول نصوص قطعیہ اور مفسرین و محدثین اور متکلمین و فقہا کے بالکل صریح خلاف ہے اور اہل السنّت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر ہرگز ہرگز قادر نہیں ہے کیونکہ مستحیلات اور ممتنعات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نیچے داخل ہی نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں :

ومن اصدق من اللہ حدیثا ومن اصدق من اللہ قیلا ۔

اور اللہ تعالیٰ تمام باتوں میں سچا ہے اور (قولہ الحق) اور خدا کا کلام برحق اور سچا ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کذب اور جھوٹ کی قباحت بیان کی ہے۔ فرمایا : کہ

لعنت کرے خدا جھوٹوں پر ۔

امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ مسلمان کو خدا تعالیٰ پر جھوٹ کا گمان کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس سے انسان دائرہ ایمان سے نکل جاتا ہے۔ سورت یوسف اور ومن اصدق من اللہ حدیثا کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

فاذا کان امکان الصدق قائما کان امتناع الکذب حاصلاً لا محالۃ

جب امکان صدق (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) قائم ہوا تو ضرور امتناع کذب حاصل ہوگیا۔

پس امتناع کذب سے امکان کذب محال ہوگیا۔ شرح فقہ اکبر میں ہے :

والکذب علیه تعالیٰ محال کہ باری تعالیٰ کا کذب محال ہے اور شرح عقائد جلالیہ

میں ہے : وامکان المحال محال کہ محال کا امکان بھی محال ہے ۔

اب وہابیہ اللہ تعالیٰ کے لیے کذب کو ممکن کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ محال ہے۔ محال

کا ممکن ہونا ہی محال ہے لہٰذا کذب باری تعالیٰ محال ہے ۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے :

یکفر اذا وصف اللہ تعالیٰ بمالا یلیق بہ او نسبہ ۔

کہ اللہ تعالیٰ کو نالائق بات کے ساتھ وصف کرنا یا نقصان سے نسبۃ کرنا

کفر ہے ۔

قاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر المتوفی ۶۸۵ھ تفسیر بیضاوی میں لکھتے ہیں :

لا یتطرق الکذب الی خبرہ بوجہ لانہ نقص وھو علی اللہ محال ۔

کہ اللہ کی خبر میں کسی طرح کا بھی کذب نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ عیب ہے جو کہ

اللہ تعالیٰ پر محال ہے ۔

بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی المتوفی ۱۲۲۵ھ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

کی خبروں میں کسی وجہ سے بھی کذب نہیں ہے کیونکہ یہ نقصان ہے اور خدا تعالیٰ پر محال ہے ۔

ولا یوصف اللہ تعالیٰ بالقدرۃ علی الظلم والسفہۃ والکذب لان

المحال لا یدخل تحت القدرۃ ۔

کہ اللہ تعالیٰ ظلم اور سفاہت اور کذب پر قادر ہونے سے موصوف نہیں

ہے کیونکہ محال اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہی نہیں ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت صرف ممکنات کو شامل ہے اور جھوٹ محال ہے ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس پر

قادر ہی نہیں ہے ۔

امام رازی مزید لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

وَاما اصحابنا فدلیلھم انہ تعالیٰ لو کان کاذبا لکان کذبہ قدیما

لو امتنع زوال كذبه للامتناع العدم على القديم ولو امتنع زوال كذبه قديما لامتنع ان يصدق لكنه، غير ممتنع لانا نعلم بالضرورة ان كل من علم شيئا فانه لا يمتنع عليه ان يحكم عليه بحكم مطابق للمحكوم عليه والعلم بهذه الصفة ضروري فاذا كان امكان الصدق قائما كان امتناع الكذب حاصلاً لا محالة فثبت انه لا بد من القطع بكونه تعالى صادقا۔

اور ہمارے علماء (اہل السنّۃ والجماعۃ) کی دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کاذب ہوتا تو اس کا کذب قدیم ہوتا تو پھر اس کا زوال ممتنع ہوتا کیونکہ قدیم پر زوال نہیں آتا اور جب اس کے کذبِ قدیم کا زوال منع ہوتا تو اس کا صدق ممتنع ہوتا۔ لیکن اس کا صدق ممتنع نہیں ہے اس لیے کہ ہم یقیناً جانتے ہیں کہ جو شخص کسی چیز کا عالم ہوتا ہے تو اس پر محکوم علیہ کے موافق حکم کرنا ممتنع نہیں ہوتا اور یہ امر یقینی ہے پس جب امکان صدق قائم ہوا تو ضرور امتناع کذب حاصل ہو گیا۔ پس یقیناً ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ صادق ہے۔

اور یہ خیال کرنا کہ اگر اللہ تعالیٰ جھوٹ پر قادر نہ ہوا تو پھر وہ عاجز ہو گا یہ بھی غلط ہے کیونکہ القدرۃ لا تتعلق بالواجبات والمستحیلات ولا یلزم منہ عجز لانہا لیست من وظیفتہا

قدرت واجب اور محال کے ساتھ متعلق ہی نہیں ہے اور اس سے عجز بھی لازم نہیں آتا کیونکہ یہ قدرت کا وظیفہ ہی نہیں۔

اسی لیے مفسرین نے ان اللہ علیٰ کلِّ شیئٍ قدیر کا معنی یہ کیا ہے کہ جس کو اللہ چاہے (یعنی ممکنات) پر قادر ہے۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں، ان اللہ علی کل شیئ (شاءہٗ) قدیر۔

محمد بن محمد بن مصطفیٰ بن احمد المتوفی ۹۸۲ھ تفسیر ابی السعود میں فرماتے ہیں:

شئ مصدر شاء اطلق علی المفعول واکتفی فی ذالك باعتبار تعلق المشیئة -

کہ شئ مصدر بمعنی مفعول ہے اور اس پر کفایت کی ہے کہ مشیت کا تعلق اس سے ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کا ہونا چاہتا ہے (ممکن) وہ اس کی قدرت کے نیچے داخل ہے اور شرعاً اور عقلاً ہرگز یہ ثابت نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کذب کو چاہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کذب باری تعالیٰ محال ہے ممکن نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ان پر قادر ہی نہیں یا ادباً اس طرح کہہ لیجئے کہ مستحیلات اور ممتنعات (کذب، جہل، سفاہت وغیرہ) کی ناقابلیت کی وجہ سے قدرت ان سے متعلق ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قدرت کے نیچے داخل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا کہاں لازم آیا اور وہابیہ کا یہ کہنا کہ پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کم ہو گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ مخلوقات کے صفات اگر خالق میں نہ ہوں تو اس سے خالق کی قدرت میں کمی یا نقصان لازم نہیں آتا۔ دیکھئے توالد اور تناسل (بچے پیدا کرنا) یہ وہابی کا ایک قابل ستائش فعل ہے اور یہ صفت اللہ تعالیٰ میں نہیں ہے۔ کیا اس وہابی کی قدرت اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہو جائے گی۔ مذہب اہل السنۃ والجماعۃ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ نہیں بولتا اور نہ ہی اس پر قادر ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب -

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی کی کتاب "حسام الحرمین" میں دیوبندی علماء قاسم نانوتوی، اشرف علی تھانوی، خلیل احمد انبیٹھوی، رشید احمد گنگوہی کی گستاخانہ عبارات پر ان کی جو تکفیر کی گئی ہے کیا وہ حق اور صحیح ہے اور حضرت امیر الملت علیہ الرحمۃ اور حضرت سراج الملت مسلک اعلیٰ حضرت

اور حسام الحرمین سے متفق تھے یا کہ نہیں ۔ بینوا توا جروا ۔

المستفتی : محمد شہباز ۔ نیو پاکستان ریفریجریشن
سروس ریجنٹ سینما روڈ ۔ گوجرانوالا

الجواب بعونہ تعالیٰ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے مسئولہ صورت میں مذکور علمائے دیوبند قاسم نانوتوی، اشرف علی تھانوی، خلیل احمد انبیٹھوی، رشید احمد گنگوہی کی تکفیر صرف "حسام الحرمین" میں ہی نہیں کی بلکہ اکثر تصانیف میں جزوی طور پر اور وہابیہ وہابیہ کی کلی طور پر تکفیر کی ہے جو کہ حق پر مبنی ہے ۔

آپ نے الملفوظ صد ۱۲۴ جلد اوّل اور فتاویٰ افریقہ میں لکھا ہے کہ ان کے کفر میں جو شک کرے وہ خود کافر ہے اور جو انہیں کافر نہ کہے، جو ان کا پاس یا لحاظ رکھے، جو ان کے استادی رشتے، رشتہ داری یا دوستی کا خیال کرے وہ بھی انھیں میں سے ہے انھیں کی طرح کافر ہے ۔ قیامت میں ان کے ساتھ ایک رسّی میں باندھا جائے گا ۔

من شک فی کفرہٖ وعذابہ فقد کفر ۔

اعلیٰ حضرت قدوۃ السالکین ۔ زبدۃ العارفین حاجی الحرمین والشریفین امیر الملّت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ ہمیشہ نجدیت ، وہابیت اور دیوبندیت کے خلاف جہاد فرماتے رہے ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی جب تشریف لے جاتے تو وہابی امام کے پیچھے نماز ادا نہیں فرماتے تھے ، ان کی دعوتیں قبول نہیں فرماتے تھے ۔ (سیرت امیر الملۃ صد ۱۳۵)

یہی مسلک حضرت حاوی الفروع والاصول ، جامع معقول والمنقول ، سراج الملّت پیر سید محمد حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا ۔ لہٰذا ان کی تکفیر جو اعلیٰ حضرت نے فرمائی ہے وہ صحیح اور مذہب اہل السنّت والجماعت کے عین مطابق

ہے ۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

مندرجہ بالا فتوٰی کی تصدیق امام المدققین ، رئیس المحققین ، بیہقی وقت ، پیر طریقت ، علامہ سید اختر حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں کی ،

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی مولانا الشاہ احمد رضا خاں صاحب نے جو کچھ اپنی کتابوں میں وہابیہ اور دیابنہ کے متعلق لکھا ہے وہ صحیح ہے اور یہی اہل السنّت والجماعت کا مسلک ہے اور جس کا مسلک اور عقیدہ اس کے خلاف ہے وہ اپنے عقیدہ پر نظر ثانی کرے ۔

سید اختر حسین شاہ جماعتی

علی پور شریف ضلع سیالکوٹ ۔

تصدیق عالی جناب صاحبزادہ سید افضل حسین شاہ صاحب جماعتی سجادہ نشین

ناظم اعلیٰ مدرسہ نقشبندیہ علی پور شریف ۔ ۱۲

الجواب صحیح ۔ سید افضل حسین شاہ جماعتی ۔ علی پور شریف ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو صحیح العقیدہ سنی بریلوی کہتا ہے ، یہ کہ بعد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تمام صحابیوں سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو افضل کہتا ہے اس کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ۔ اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔ اور کہتا ہے کہ ہزار ہا غوث ہوں تو امیر معاویہ کی شان کو نہیں پہنچ سکتے کیونکہ وہ صحابی رسول ہیں ۔ ہزار ہا پیران پیر ہوں تو کسی صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے ۔

المستفتی

مولوی غلام مصطفیٰ امام جامع مسجد ڈھلم بلگن

ڈاک خانہ خاص تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں جو مسئول عنہ کا عقیدہ لکھا گیا ہے وہ بعینہٖ اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ ہے، یہی اہل السنّت والجماعت کو عقیدہ رکھنا چاہیئے۔

شرح عقائد نسفیہ میں ہے:

وافضل البشر بعد نبینا ابوبکرن الصدیق ثم عمر فاروق ثم عثمان ذی النورین ثم علی المرتضٰی علی ھذا وجدنا السلف والظاھر انہ لولم یکن لھم دلیل علی ذالک لما حکموا بذالک۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد حضرت[1] ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ آپ کے بعد حضرت عمر[2] فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے بعد حضرت عثمان[3] ذی النورین رضی اللہ عنہ آپ کے بعد حضرت علی[4] المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہی عقیدہ ہمارے تمام اسلاف واہل السنّت والجماعت کا ہے۔ یہ خلفاء اربعہ عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں اس کے بعد باقی عشرہ مبشرہ یہ چھ ہیں،

حضرت[1] طلحہ، حضرت[2] زبیر، سعید[3] بن زید، عبد[4] الرحمٰن بن عوف، سعد[5] ابن ابی وقاص، عبیدہ[6] بن الجراح رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی رسول کاتب وحی ہیں، حافظ الدنیا ابن حجر فرماتے ہیں کہ امیر معاویہ کاتب وحی تھے (تقریب التہذیب ص ۲۵۷)

حضرت عبداللہ بن مبارک سے سوال کیا گیا کہ معاویہ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیز۔ تو آپ نے کہا کہ معاویہ کے گھوڑے کی غبار بھی عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ (نبراس ص ۵۵۰)

غیر صحابی خواہ ولی ہو، غوث ہو، قطب ہو صحابی رسول کے مقام تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت معاویہ کی شان تمام اولیاء کرام سے افضل واعلیٰ ہے۔ یہی عقیدہ اہل السنّۃ والجماعۃ کا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں : کیا قبل از وحی حضور علیہ السلام کو ایمان کے متعلق پتہ تھا ؟ اگر تھا تو پھر اس آیت کا مطلب کیا ہے ؛

وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب و لا الایمان ۔

" اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف روح اپنے امر سے ۔ نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے ۔

قرآن میں تو علم ایمان کی نفی ہے ۔ بینوا و توجروا ۔

ایک سائل : فقیر محمد ۔ قلعہ سوبھا سنگھ

الجواب بعونہ تعالیٰ

قرآن پاک نے علم کی نفی نہیں کی بلکہ درایت کی نفی کی ہے ۔ جیسا کہ فرمایا ما کنت تدری اور ما کنت تعلم نہیں فرمایا اور درایت کی نفی سے علم کی نفی نہیں ہوتی ۔ کیونکہ درایت کہتے ہیں المعرفۃ المدرکۃ بضرب من الختل ، یعنی کسی چیز کو ظن و تخمین سے یا اٹکل پچو سے جاننا ۔

تاج العروس میں اس کا معنی یہ لکھا گیا ہے :

دریۃ و دریت بہ ، علمتہ او علمتہ بضرب من الحیلۃ و لذا لا یطلق علی اللہ تعالیٰ ۔

یعنی حیلہ سے کسی چیز کے جاننے کو درایت کہتے ہیں ۔ اسی لیے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا جاتا ۔ ثابت ہوا کہ علم اور درایت میں فرق ہے ۔ اگر درایت کی نفی ہوئی تو علم کی نفی نہ ہوگی لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اور ایمان کا علم ہوگا ۔

سائل نے چونکہ علم اور درایت میں فرق نہیں سمجھا لہٰذا یہ کہہ دیا کہ قرآن نے علم کی نفی کی ہے ۔ علم کی نفی نہیں کی ۔ تمام انبیاء کرام کو بعثت سے پہلے ایمان و کتاب کا علم ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں وَ آتیناہ الحکم جیسا کہ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ ہم نے انہیں علم و حکمت سے مشرف فرمایا۔ حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق آپ کی عمر تین سال تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں ہی اعلان فرمایا

انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا این ماکنت۔

یعنی میں اللہ کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور اس نے مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں بھی میں ہوں ۔

حضرت یوسف علیہ السلام ابھی کمسن ہی تھے کہ آپ کے بھائیوں نے آپ کو کنویں میں ڈالا۔ اس وقت انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ مژدہ سنایا تھا کہ :

واوحینا الیہ لتنبئنھم بامرھم ھذا

یعنی ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ آپ انہیں ان کے اس فعل پر آگاہ کریں گے ۔

اگر ان حضرات انبیاء علیہم السلام کو بچپن ہی میں ان امور پر آگاہی بخش دی گئی تھی اور ان سے وہ محیر العقول کارنامے صادر ہوئے جو صرف اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کا ہی ثمر ہو سکتے ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ کیسے فرض کر لیا جائے کہ حضور کو ایمان اور کتاب کے متعلق علم نہ تھا ۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں، صحیح یہ ہے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی اس بات سے معصوم ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات سے جاہل ہوں یا ان میں سے کسی بات میں ان کو شک ہو بکثرت ایسی احادیث و آثار موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء بچپن میں ہی ان عیوب سے پاک ہوتے ہیں ۔

ونشأتھم علی التوحید والایمان

اور ان کی نشوونما توحید اور ایمان پر ہوتی ہے ۔

بلکہ معرفت کے انوار ان پر ضوفشاں رہتے ہیں ۔ سعادت ارجمندی کے الطاف کی مہک سے وہ معطر رہتے ہیں ۔ جنہوں نے ان کی سیرتوں کا مطالعہ کیا ہے ۔ ان کے نزدیک یہ امر مسلمہ ہے ۔

علامہ قرطبی نے تصریح کردی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تخلیق اور پیدائش اور نشوونما ہی ایمان اور توحید پر ہے اور یہ امر مسلّمہ ہے۔ لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال کرنا کہ آپ کو ایمان اور کتاب کے متعلق علم نہیں تھا۔ نہایت ہی غلط اور گندہ عقیدہ ہے۔ قرآن نے درایت کی نفی کی ہے معنی آیت کریمہ کا یہ ہے کہ آپ نے حیلہ اور ظن سے کتاب اور ایمان کو نہیں جانا (ملخصاً ضیاء القرآن) بلکہ آپ کو کتاب اور ایمان کا علم تو خدائے تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے جو کہ مبنی بر یقین و حق ہے جس کا ظن اور حیلہ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

قبلہ مفتی صاحب۔ علی پور شریف،

سلام مسنون

ایک مسئلہ خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر اس کے متعلق تحریر فرمائیں کہ کلمہ طیبہ میں واؤ عاطفہ نہیں ہے اور کلمہ شہادت میں واؤ حرف عاطفہ ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

ایک طالب علم

اسلامیہ کالج نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

کلمہ طیبہ: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے درمیان واؤ عاطفہ اگر ہوتی تو یہ وہم بھی ہو سکتا تھا کہ اس کا عطف مستثنیٰ یعنی اللہ پر پڑے۔ جس سے توحید اور رسالت میں اشتراک ہو۔ حالانکہ مقصد یہاں پر توحید تھی جس میں کسی قسم کا اشتراک لازم نہ آئے۔ لہذا ایک جملہ (محمد رسول اللہ) کا دوسرے جملہ (لا الہ الا اللہ) پر عطف نہیں کیا گیا اور کلمہ شہادت یعنی اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ میں یہ وہم نہیں پڑتا کہ عطف واشھد کا مستثنیٰ (الا اللہ) پر پڑے۔ کیونکہ واشھد جملہ فعلیہ ہے۔ اس کا عطف پہلے اشھد پر ہوگا جو کہ بھی جملہ فعلیہ ہے۔

علامہ عبدالواحد لکھتے ہیں :

الظاھر ان الواوُ للتشریك فی الاصل والجملة الاولیٰ فی الکلمة الطیبة بالنفی والاثبات ناطقة بالوحدانیة اللتی لاشرکة فیھا اصلاً والجملةِ الثانیة مبتداء وخبر مثبتیة للرسالة فلم یعطف علی الاولیٰ بل استونف بہا علی ان العطف یوھم عطفه علی المستثنیٰ وھو اسم اللہ ففصل لدفع ایھام خلاف المقصود فان المقصود من النفی والاثبات ھوالتوحید وفی العطف ایھام التشریك بتوسم العطف علی المستثنیٰ فلم یعطف واما کلمة الشھادة اعنی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھدان محمدًا رسول اللہ فلا یتوھم العطف فیھا علی المستثنیٰ لیوھم خلاف المقصود اذفیھا عطف الجملة الفعلیة اعنی اشھد علی الجملة الفعلیه اعنی اشھد فیحسن العطف للتناسب قال فی المطول ومن محسنات الوصل تناسب الجملتین فی الاسمیة والفعلیة ای فی کونھما اسمیتین اوفعلیتین وتناسب الفعلین فی المضی والمضارعة انتھٰی۔ فظھر الفرق بین کلمة الشھادة وبین الکلمة الطیبة من حیث جواز العطف ۔ (فتاویٰ واحدی ص)

ظاہر یہ ہے کہ واوُ اصل میں اشتراک اور وصل کے لیے ہے ۔ کلمہ طیبہ میں نفی (لاالٰہ) اور اثبات (الا اللہ) سے وحدانیت سے ثابت ہے اور توحید میں کسی قسم کی شرکت نہیں ہے اور محمد رسول اللہ مبتدا اور خبر ہے جس سے رسالت ثابت ہے ۔ لہٰذا جملہ ثانیہ محمد رسول اللہ کا پہلے جملہ لاالٰہ الا اللہ پر عطف ڈالا گیا بلکہ جملہ ثانیہ (محمد رسول اللہ) مستانف ہے (نئی کلام) کیونکہ حرف عطف سے یہ وہم ہوتا ہے کہ مستثنیٰ (اللہ) پر عطف ہے پس عطف کو چھوڑ دیا تاکہ خلاف مقصود کا وہم مندفع ہو کیونکہ نفی

اثبات (لا الہ الا اللہ) سے مقصود توحید ہے اور عطف میں شرکت کا وہم ہے کہ مستثنیٰ (لفظ اللہ) پہ عطف نہ پڑے۔ پس عطف نہیں کیا گیا اور کلمہ شہادت میں یہ وہم نہیں ہوتا کہ عطف مستثنیٰ پر پڑے اور خلاف مقصود لازم آئے کیونکہ واشہد جملہ فعلیہ کا عطف ہے۔ جملہ فعلیہ پر وجہ مناسبت ہوگا۔ علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ جب دو جملے فعلیہ ہوں یا اسمیہ ہوں تو عطف مناسب ہوتا ہے۔ کلمہ شہادت اور کلمہ طیبہ کے درمیان فرق ظاہر ہوا کہ عطف کلمہ شہادت میں جائز ہے اور کلمہ طیبہ میں جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں اگر واؤ لائی جائے تو خلاف مقصود کا وہم ہوتا ہے کیونکہ عطف، لفظ اللہ پر واقع ہوگا۔ لازم آئے گا کہ توحید میں شرکت ہو جو کہ ناجائز ہے اور کلمہ شہادت میں یہ وہم لازم نہیں آتا کیونکہ واشہد ان محمداً رسول اللہ میں پہلے اشہد جملہ فعلیہ ہے اور علمائے فن کے قاعدہ مناسبہ کے مطابق جملہ فعلیہ کا عطف جملہ فعلیہ پر ہوتا ہے نہ کہ مستثنیٰ پر۔ لہٰذا کلمہ طیبہ میں واؤ نہیں لائی گئی اور کلمہ شہادت میں اس کو لایا گیا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

مفتی غلام رسول

علی پور شریف

کتاب العلم

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ اسباب علم کیا ہیں اور وحی کا کیا معنی ہے اور اسکی کتنی قسمیں ہیں۔ مدلل با حوالہ جواب بیان فرمایا جائے؟

مشتاق احمد سندھی از اسلامیہ کالج نارووال

الجواب بعونہ تعالیٰ

وحی کا اصل معنی اعلام (خبردار کرنا) فی الخفا ہے۔ علامہ حافظ بدر الدین عینی المتوفی ۸۵۵ھ عمدۃ القاری ص۱۸ ج۱ میں لکھتے ہیں:

والوحی فی الاصل الاعلام فی خفا۔ قال الجوھری[1] الوحی الکتاب۔

جوہری لکھتے ہیں کہ معنی وحی کا کتاب ہے۔ اس کا معنی اشارہ، کتابۃ، رسالۃ، الہام اور کلام خفی بھی ہے۔ وحی کا معنی تفہیم بھی ہے اور اصطلاح شرعیۃ میں وہ کلام منزل ہے (یعنی جو انبیاء سے کسی نبی پر نازل کی جائے) اور وحی کی تین قسمیں ہیں اور وحی آنے کی سات صورتیں ہیں۔

وحی کی پہلی قسم کلام قدیم کا سننا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے سنا۔

---

[1] ابو نصر اسماعیل جوہری المتوفی ۳۹۵ھ۔ ۱۲۔

دوسری قسم وحی رسالۃ بواسطہ ملک ہے۔

تیسری وحی تلقی بالقلب ہے یعنی قلب اور دل میں ڈالنا۔ جیساکہ حدیث پاک میں ہے

ان روح القدس نفث فی روعی ای فی نفسی۔

جبریل نے میرے نفس میں ڈالا اور پھونکا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ تیسری قسم حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف بھی ہوتی تھی اور وحی کی سات صورتیں یہ ہیں:

۱۔ صورت منامی (نیند) ہے۔

۲۔ صلصلۃ الجرس ہے۔

۳۔ نفس فی روعہ یا الوحی ہے۔ یعنی وحی کے ساتھ دل میں ڈالنا اور پھونکنا۔

۴۔ جبریل مرد کی شکل میں آئے جیساکہ حضرت دحیہ کی شکل میں آتے تھے۔

۵۔ جبریل کو اپنی اصلی شکل پر دیکھیں، جبریل کو چھ سو بازو عطا فرمائے گئے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ آپ سے ہم کلام من وراء حجاب ہو یا بیداری میں۔ جیساکہ معراج کی رات میں ہوا۔ یا نیند میں جیساکہ حدیث پاک میں ہے:

اتانی ربی فی احسن صورۃ (میرا رب میرے پاس اچھی سورت میں آیا)

۷۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام وحی لے کر آئیں۔

جیساکہ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ حضرت اسرافیل تین سال زمانۂ نبوت میں حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے۔ تین سال کے بعد حضرت جبریل حاضر ہوئے اور قرآن پاک کا نزول ہوا۔ دس سال قرآن مکہ میں اترا اور دس سال مدینہ منورہ میں نازل ہوا اور تریسٹھ سال کی عمر مبارک میں عالم برزخ کی طرف

لہ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ وحی کی سات صورتیں علامہ عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد سہیلی المتوفی ۵۸۱ھ نے بیان کی ہیں۔ ۱۲۔

تشریف لے گئے اگرچہ واقدی[1] نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت جبریل کے علاوہ کوئی بھی نبی کریم علیہ السلام کے ساتھ مقارن نہیں ہوا لیکن علامہ عینی فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ اکثر وحی جبریل سے متعلق ہے لہذا واقدی کا انکار غیر معتبر ہے اور سائل کا پہلا سوال اسباب علم کے متعلق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علم کے حصول کے تین سبب ہیں۔ علامہ نسفی لکھتے ہیں :

واسباب العلم ثلاثة الحواس السليمة والخبر الصادق والعقل ۔

یعنی مخلوق کے لیے اسباب علم تین ہیں۔ حواس سلیمہ اور خبر مطابق واقع کے اور عقل۔ ان تینوں کے ذریعے مخلوقات کو علم ہوتا ہے۔ علامہ تفتازانی فر

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ استقرار اور تلاش کے بعد یہ تین ہی علم کے سبب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ علم اگر امر خارجی سے ہوا تو وہ خبر صادق ہے۔ اگر علم آلہ ادراکیہ سے ہوا تو عقل ہے اگر آلہ غیر مدرکہ ہو تو حواس ہیں اور حواس پانچ ہیں :

قوت سامعہ، قوت باصرہ، قوت شامہ، قوت ذائقہ، قوت لامسہ۔

اور عقل کا معنی یہ ہے کہ وہ نفس کے لیے ایک قوت ہے جو اسے علوم اور ادراکات کے لیے مستعد کرتی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لوگ کہتے ہیں، پیر اور مرشد علم غیب جانتا ہے پیران عظام کس حد تک غیب جانتے ہیں۔ کتابوں کے حوالوں سے تحریر کریں کہ پیر غائب جانتے ہیں یا نہیں۔

ایک سائل از گوجرانوالا

---

[1] محمد بن عمر واقدی المتوفی ۲۰۷ھ۔ ۱۲

الجواب بعونہ تعالیٰ

اولیاء کرام علم غیب جانتے ہیں۔ یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے۔ رئیس الحنفیہ علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

النفوس الزکیۃ القدسیۃ اذا تجردت عن العلائق البدنیۃ عرجت واتصلت بالملاء الاعلیٰ ولم یبق لہ حجاب فتری الکل کالمشاھد بنفسہا او باخبار الملک لہا۔ (مرقاۃ ج۲، باب الصلوٰۃ علی النبی)

پاک و صاف نفس جبکہ بدنی علاقوں سے خالی ہو جاتے ہیں تو ترقی کر کے بزم بالا سے مل جاتے ہیں اور ان پر کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔ پس وہ تمام چیزوں کو مثل محسوس و حاضر کے دیکھتے ہیں یا تو خود یا فرشتہ کی خبر دینے سے۔

علامہ محمد بن عبد الباقی زرقانی المتوفی ۱۱۲۲ھ فرماتے ہیں:

قال فی لطائف المنن اطلاع العبد علی غیب من غیوب اللہ بدلیل خبر اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ لا یستغرب وھو معنی کنت الذی یبصر بہ فمن الحق بصرہ فاطلاعہ علی الغیب لا یستغرب۔ (شرح مواھب لدنیہ ج صـ۲۲)

لطائف المنن میں فرمایا کہ کامل بندے (اولیاء اللہ) اللہ کے غیبوں میں سے کسی غیب پر مطلع ہو جانا عجیب نہیں۔ اس حدیث کی وجہ سے کہ مؤمن کی دانائی سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور یہی اس حدیث کے معنی ہیں کہ رب فرماتا ہے کہ میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ پس اس کا دیکھنا حق کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا غیب پر مطلع ہونا کچھ عجیب بات نہیں۔

حضرت امام شعرانی فرماتے ہیں:

للمجتہدین القدم فی علوم الغیب

علوم غیبیہ میں مجتہدین کا علم مضبوط ہے۔ (الیواقیت والجواہر)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ المتوفی ۵۶۱ھ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال رضی اللہ عنه یا ابطال یا ابطال۔ ھلموا وخذوا عن ھذا البحر الذی لا ساحل له وعزۃ ربی ان السعداء والاشقیاء یعرضون علی وان بؤبؤۃ عینی فی اللوح المحفوظ وانا غائص فی بحار علم اللہ (بحوالہ زبدۃ الاسرار)

اے بہادرو، اے فرزندو! آؤ اس دریا سے کچھ لے لو جس کا کنارہ ہی نہیں ہے۔ قسم ہے اپنے رب کی کہ تحقیق نیک بخت اور بدبخت لوگ مجھ پر پیش کیے جاتے ہیں اور ہمارا گوشہ چشم لوح محفوظ میں رہتا ہے اور میں اللہ کے علم کے سمندروں میں غوطے لگا رہا ہوں۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اولیاء کرام غیب جانتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ کس حد تک غائب جانتے ہیں۔ اس کے متعلق سنیئے:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ فرماتے ہیں:

اطلاع بر لوح محفوظ و دیدن نقوش نیز از بعضے اولیاء بتواتر منقول است۔ (تفسیر عزیزی پ ۲۹)

لوح محفوظ کی خبر رکھنا اور اس کی تحریر دیکھنا بعض اولیاء اللہ سے بھی بطریق تواتر منقول ہے۔

امام شعرانی فرماتے ہیں:

واما شیخنا السید علی الخواص رضی اللہ تعالی عنه فسمعته یقول لا

ؒ امام عبدالوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ (بحوالہ جامع کرامات مصنفہ یوسف نبہانی المتوفی ۱۳۵۰ھ ۱۲۰

یکمل الرجل عندنا حتی یعلم حرکات مریدہ فی انتقالہ فی الا صلاب و

ھو من یوم الست الی استقرارہ فی الجنۃ او فی النار ۔ (کبریت احمر)

ہم نے اپنے شیخ سید علی خواص رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ ہمارے نزدیک اس وقت تک کوئی مرد کامل نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے مرید کی حرکات نسبی کو نہ جان لے ۔ یوم میثاق سے لے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک کو ۔

معلوم ہوا کہ اولیاء کرام تمام غیب بلکہ لوح محفوظ سے اور جو اس پر تحریر ہے آگاہ ہیں ۔ اور ولایت کے کمال سے یہی ہے کہ شیخ اپنے مرید کے تمام حالات و واقعات نسبی سے واقف ہو ۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

حافظ الحدیث سیدی احمد سجلماسی کہیں تشریف لے جاتے تھے ۔ راہ میں اتفاقاً آپ کی نظر ایک نہایت حسینہ عورت پر پڑگئی ۔ یہ نظر اول تھی ۔ بلا قصد تھی ۔ دوبارہ پھر آپ کی نظر اٹھ گئی ۔ اب دیکھا کہ پہلو میں حضرت سیّدی غوث الوقت عبد العزیز دباغ رضی اللہ عنہ آپ کے پیر و مرشد تشریف فرما ہیں اور فرماتے ہیں : احمد عالم ہوکر اور احمد کی دو بیویاں تھیں ۔ حضرت عبد العزیز نے فرمایا : رات کو تم نے ایک بیوی کے جاگتے ہوئے دوسری سے ہم بستری کی یہ نہیں چاہیئے ۔

عرض کیا حضور ! وہ تو سوتی تھی ۔ فرمایا سوتی نہ تھی ، سونے میں جان ڈال لی تھی ۔ عرض کیا حضور کو کیسے علم ہوا ۔ فرمایا جہاں وہ سو رہی تھی کوئی اور پلنگ بھی تھا ؟ عرض کیا : ہاں ایک پلنگ خالی تھا ۔ فرمایا اس پر میں تھا تو گویا کہ کسی وقت بھی شیخ اپنے مرید سے جدا نہیں ہوتا ہر آن ساتھ ہے ۔ بہر کیف ثابت ہوا کہ اولیاء کرام غیب جانتے ہیں اور مرشد برحق اپنے مرید کے تمام حالات سے واقف ہوتا ہے ۔ ہر وقت مرید کے ساتھ رہتا ہے اور مرید کو گناہ کرنے سے روکتا ہے ۔ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصّواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں، ہمارے گاؤں میں ایک مولوی صاحب وعظ کیلئے گئے۔ انہوں نے کہا کہ فلاں حدیث منسوخ ہے۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ نسخ کا کیا معنی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ نسخ کا معنی تبدیلی حکم ہے۔ ہم نے کہا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم تبدیل نہیں ہوتے۔ لہٰذا آپ نسخ کا صحیح مفہوم تحریر فرمائیں تاکہ لوگوں کو بتایا جائے۔

عبدالرشید۔ چک شیر محمد ضلع گجرات۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نسخ کا معنی شرعی تبدیلی حکم نہیں ہے بلکہ نسخ کا لغوی معنی نقل کرنا، دور کرنا، زائل کرنا وغیرہ ہے اور اصطلاح شریعت میں اس کا معنی یہ ہے کہ کسی عملی حکم کی مدت کی انتہا بیان کرنا ہے جو کہ تمام شرائط کو جامع ہو۔ کیونکہ واقعات اور قصص میں نسخ نہیں ہوتا۔ نیز امور قطعیہ میں نسخ ممکن نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ موجود ہے اس کا نسخ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح امور حسیہ میں نسخ نہیں ہو سکتا مثلاً دن کی روشنی اور رات کی تاریکی۔ اسی طرح دعاؤں میں اور ان احکام میں جو اپنی ذاتی حیثیت سے واجب ہیں مثلاً آمنوا، لا تشرکو۔ اسی طرح ان احکام میں بھی نسخ نہیں جو دائمی اور ابدی ہیں، جیسے کہ لا تقبلوا لہم شہادۃ ابدا اور ان احکام میں بھی جن کا وقت مقرر ہے۔ اس وقت معین سے پہلے نسخ نہیں ہوں گے جیسا کہ فاعفوا، واصفحوا، حتی یاتی اللہ بامرہٖ بلکہ نسخ صرف ان احکام میں ہو سکتا ہے جو عملی ہوں اور وجود و عدم دونوں کا احتمال رکھتے ہوں نہ دائمی ہوں اور نہ کسی وقت کے ساتھ مخصوص کیے گئے ہوں یعنی احکام مطلقہ اور عامہ میں نسخ ہوگا۔ ان میں یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ اور مکلف اور صورت متحد نہ ہوں بلکہ تینوں میں اختلاف ہو یا بعض میں مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں جس شخص کو جس صورت کے ساتھ ایک کام کا حکم دیا ہے یہ ناممکن ہے۔ اسی زمانہ میں اسی شخص کو اسی صورت میں منع کر دیا جائے بلکہ نسخ میں یا زمانہ بدلے گا یا وہ شخص یا صورت یا تینوں۔

نسخ شرعی کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا، اللہ کو انجام معلوم نہ تھا پھر خدا کی رائے اس کے خلاف قائم ہوئی۔ اس لیے پہلے حکم کو خدا نے ختم کر دیا یا پہلے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا پھر اس کو تینوں باتوں میں اتحاد کے باوجود منسوخ کر دیا بلکہ نسخ کا مطلب صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر منسوخ کر دیا جائے گا۔ پھر جب وہ وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرا حکم فرما دیتے ہیں جس سے کسی حکم کا ختم ہونا معلوم ہو جاتا ہے تو درحقیقت یہ صرف پہلے حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے مگر چونکہ لوگوں کے سامنے پہلے حکم میں مدت حکم کو بیان نہیں کیا گیا تھا اس لیے دوسرا حکم لوگ اپنی کوتاہی فہم کی بنا پر خیال کر لیتے ہیں کہ حکم میں تبدیلی ہوئی ہے۔ حالانکہ حکم اول تبدیل نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نسخ کے معنی صرف یہ ہیں کہ کسی حکم کے بدلے یہ اعلان ہو کہ اس حکم کی مدت ختم ہو چکی ہے یا اس میں عموم و اطلاق کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔

ابو مسلم اصفہانی معتزلی المتوفی ۳۲۲ھ صاحب جامع التاویل نسخ کا قایل نہیں ہے۔ پھر نسخ کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ نسخ قرآن بالقرآن، ۲۔ نسخ سنۃ بالسنۃ، ۳۔ نسخ سنۃ بالقرآن، ۴۔ نسخ قرآن بالسنۃ۔

نسخ کی پہلی قسم نسخ قرآن بالقرآن میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ مثلاً الزانیۃ لا ینکحھا الازان منسوخ ہے وانکحوا الایامیٰ کے ساتھ۔

چونکہ ابو مسلم اصفہانی نسخ کا قائل نہیں لہذا اس کے نزدیک قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔

دوسری قسم نسخ سنۃ بالسنۃ میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایک حدیث دوسری حدیث کو منسوخ کر سکتی ہے۔ متواتر حدیث کی ناسخ متواتر حدیث ہی ہو گی۔ ایک خبر واحد کو دوسری خبر واحد یا متواتر منسوخ کر دے گی۔ مثلاً میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کرتا تھا اب ان کی

زیارت کیا کرو۔ (مسلم[1]، ابوداؤد، ترمذی[2]، ابن ماجہ[3])

دوسری دونوں قسموں میں اختلاف ہے۔

تیسری اور چوتھی دونوں قسموں میں اختلاف ہے۔

نسخ سنۃ بالقرآن۔ جمہور کے نزدیک قرآن حدیث کو منسوخ کر سکتا ہے۔ دیکھئے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ پہنچے تو چند ماہ بیت المقدس کی طرف رخ انور فرما کر نماز ادا کرتے رہے مگر قرآن میں ایسی کوئی نص موجود نہیں جس میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا ہو پھر اس کو آیۃ فول وجھك شطر المسجد الحرام نے منسوخ کر دیا۔ امام شافعی کے نزدیک قرآن حدیث کو منسوخ نہیں کر سکتا۔

نسخ قرآن بالسنۃ۔ آیا حدیث کسی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں علماء کے دو مذہب ہیں۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک حدیث متواتر یا مشہور قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے اور خبر واحد نہیں کر سکتی۔ اس کو ہم نے متقابلات کی بحث میں بھی بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر حنفیہ کہتے ہیں کہ موزوں کے مسح پر مشتمل حدیث مشہور نے اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے جس میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ سنت قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔

بہر نوع نسخ کا معنی تبدیلی حکم ہرگز نہیں ہے بلکہ نسخ کا معنی انتہاء مدت حکم ہے۔ اب یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اقوال اور کلمات تبدیل نہیں ہوتے۔ نسخ کا گویا کہ ان کیسا تھ

---

[1] مسلم بن حجاج قشیری المتوفی سنہ ۲۶۱ھ۔ ۱۲

[2] محمد بن عیسیٰ ترمذی المتوفی سنہ ۲۷۹ھ۔ ۱۲

[3] محمد بن یزید بن ماجہ المتوفی سنہ ۲۷۳ھ۔ ۱۲

کسی قسم کا تعلق ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں قول اور کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں اور وعدوں میں نسخ نہیں ہوتا کیونکہ خلف وعدہ محال ہے۔ ان اللہ لا یخلف المیعاد نص قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت جناب استاذ العلماء مولانا صاحب

دامت برکاتہم العالیہ

سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ حدیث اختلاف امتی رحمۃ لوگوں کے درمیان مشہور ہے لیکن امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ہے لیکن اس کے مخرج کے متعلق ذکر نہیں گیا۔ آپ نے اگر اس حدیث کے متعلق کہیں دیکھا ہے کہ اس کی فلاں محدث نے بمعہ سند تخریج کی ہے تو اس کتاب کا حوالہ تحریر فرمائیں۔

قاضی محمد اعظم فاضل عربی۔ سی۔ ایم۔ ایچ۔ سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ سیوطی نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

لعلہ خرج فی بعض کتب الحفاظ اللتی لم تنقل الینا۔ (جامع صغیر)

شاید یہ حدیث بعض کتابوں میں تخریج کی گئی ہو جو ہم تک نہیں پہنچی۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں کہ امام سیوطی فن حدیث میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ آپ نے کتاب جمع الجوامع تالیف فرمائی اور اس کی نسبت خود ہی لکھا کہ میں نے ارادہ کیا کہ اس میں تمام احادیث نبویہ جمع کردوں لیکن باوجود اس کے حدیث اختلاف امتی رحمۃ کے مخرج بتانے پر قادر نہیں ہو سکے۔ علامہ مناوی صاحب تیسیر شرح جامع صغیر نے اس حدیث اختلاف امتی رحمۃ کی تخریج بتائی ہے کہ امام بیہقی نے مدخل میں اور امام فردوس بن شہر دار دیلمی المتوفی ۵۰۹ھ

نے مسند الفردوس میں بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کی ہے اور اس کی سند پر صرف امام سیوطی کو ہی نہیں بلکہ اکثر ائمہ کو اطلاع نہیں ہوئی ہے اسی لیے تو حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں ؛

زعم کثیر من الایمۃ انہ لا اصل لہ ۔

بہت سے اماموں نے یہی زعم کیا کہ اس کے لیے کوئی سند نہیں ۔

پھر حافظ ابن حجر نے خود بعض تخریجیں ذکر کی ہیں ۔ حدیث " اختلاف امتی رحمۃ " صحیح السند ہے ۔ اگرچہ بعض ایمہ کو اس کی سند پر اطلاع نہیں ہو سکی ۔ اسی لیے ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جب بعض احادیث جن کو مشایخ نے ذکر کیا ہے ہم نہ پائیں لعل قصور نظرنا اخفاھما (شاید ہماری نظر کی کوتاہیوں نے ان احادیث کو ہم سے چھپالیا ہے) ابن ہمام واقع کی نفی نہیں فرماتے بلکہ عدم اطلاع کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ باوجودیکہ ابن ہمام درجہ اجتہاد تک پہنچے ہوئے ہیں ۔ حدیث " اختلاف امتی رحمۃ " پر اگرچہ تخریج کے لحاظ سے امام سیوطی مطلع نہیں ہوئے ۔ لیکن حدیث صحیح السند ہے جیسا کہ امام بیہقی اور دیلمی نے بیان کیا ہے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

کتاب الطہارۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عورتیں حالت ناپاکی (حیض ونفاس وغیرہ) میں کلمہ پڑھ سکتی ہیں اور کوئی چیز نیاز وغیرہ کی استعمال کر سکتی ہے یا نہیں۔

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالیٰ

وضو کے بعد ذکر اور دعاؤں کو بحالت ناپاکی پڑھنا شرعاً جائز ہے۔ شرح وقایہ ج۱ ص۱۳۰ میں ہے:

وسائر الادعیۃ والاذکار لا بأس بہا۔

فتاوی عالمگیریہ ج۱ ص۳۸ میں ہے:

ویجوز للجنب والحائض الدعوات وجواب الاذان ونحو ذالک کذا فی السراجیہ۔

درمختار میں ہے:

فالوضوء لمطلق الذکر مندوب وترکہ خلاف الاولی وھو مرجع

صورت مسئولہ میں بحالت ناپاکی عورتوں کا وضو کر کے ذکر کے طریقہ پر کلمہ یا دعا پڑھنا جائز ہے اور حالت نجاست میں ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانا بھی درست ہے۔ در مختار میں ہی ہے:

لا یکرہ اکلہ و شربہ بعد غسل ید و فم۔

وضو کر لینے کے بعد اگر بزرگانِ دین کا تبرک اور نیاز کھالی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا مرد اپنی بیوی کو اس کے فوت ہونے کے بعد غسل دے سکتا ہے اور اس کو اس کیلئے دیکھنا جائز ہے یا نہیں۔

المستفتی: خالد محمود صدیقی - جھنگ۔

الجواب بعونہ تعالی

مرد کے لیے اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں ہے۔ ہاں اس کو دیکھنا منع نہیں ہے اور اگر مرد مر جائے تو عورت کے لیے جائز ہے کہ اس کو غسل دے۔ اس لیے کہ جب بیوی فوت ہو گئی تو نکاح باقی نہیں رہا۔ اب مرد اس کے لیے اجنبی ہے اور اجنبی مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورت کو غسل دے اس لیے کہ مرد کے فوت ہونے سے نکاح فاسد نہیں ہوتا بلکہ علی حالہ ہوتا ہے۔ اسی لیے تو چار ماہ دس دن عدت وفات ہے۔ (مراقی الفلاح)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ میت کے پاس اس کو غسل دینے سے پہلے قرآن پاک پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا و توا جروا۔

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالی

میت کو غسل دینے سے پہلے اس کے پاس تلاوت قرآن پاک مکروہ اور ناجائز ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے:

تکرہ قرأۃ القرآن عندہ حتی یغسل تنزیہا للقرآن عن نجاسۃ الحدث بالموت او الخبث فانہ یزول عن المسلم بالغسل تکریما لہ بخلاف الکافر۔

میت کے پاس اس کو نہلانے سے پہلے قرآن پاک کا پڑھنا مکروہ ہے۔ مقصود اس سے قرآن کی حفاظت ہے۔ اس حدث سے جو موت سے واقع ہوئی ہے یا خبث سے یعنی ظاہری نجاست سے۔ کیونکہ جب مسلمان کو غسل دیا جاتا ہے تو بوجہ اس کی عزت اس کا حدث زائل ہو جاتا ہے بخلاف کافر کے اس کی نجاست بعد از غسل بھی زائل نہیں ہوتی چونکہ میت کو بوجہ موت حدث لاحق ہو جاتی ہے لہذا جب تک غسل نہ دیا جائے وہاں تلاوت قرآن کے لیے حفاظ وغیرہ کو نہ بٹھایا جائے بلکہ غسل کے بعد قرآن پاک پڑھایا جائے۔ یہی مفتی بہ قول ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آدمی جب مرنے لگے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ عورتیں جو مخصوص ایام (حیض ونفاس) میں مبتلا ہوں ان کو باہر نکال دینا چاہیئے۔ کیا یہ ٹھیک ہے کہ ان کو باہر نکال دیا جائے یا وہ گھر میں ہی رہیں۔

غلام محی الدین۔ منگلا ڈیم کالونی۔

الجواب بعونہ تعالی

فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ بہترین صورت یہی ہے کہ ان مذکورہ مستورات (حیض اور نفاس والیاں) کو باہر نکال دیا جائے بشرطیکہ ان کے نکالنے میں کوئی تنگی نہ ہو۔ اگر کوئی باہر جانے میں ان کے لیے مانع ہے تو پھر گھر میں ہی رہیں۔ اگر مانع کوئی نہیں ہے تو پھر باہر چلی جائیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الصّلوٰۃ

باب الاذان

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک نوجوان اذان دینے لگا جب وہ اذان دے چکا تو ایک آدمی نے اس کو کہا تم اذان نہ دیا کرو۔ تمہاری شادی نہیں ہوگی۔ کیونکہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اذان دیتے تھے، ان کا نکاح نہیں ہوا۔ آپ تحریر فرمائیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا ہے یا نہیں اور اس آدمی کا اس نوجوان کو منع کرنا کیسا ہے۔ بینوا و توجروا۔

صوفی محمد طفیل نقشبندی جماعتی۔ نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اس آدمی نے غلط کہا ہے کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تھا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ نے اپنی مثنوی شریف میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا تھا۔ (مثنوی ص ۲۶۹)

حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب میں فرماتے ہیں:

حضرت بلال بن رباح حضور علیہ السلام کے مؤذن تھے اور امام ابن مندہ[1] فرماتے ہیں

---

[1] ابن مندہ ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ بن مندہ المتوفی ۳۰۱ھ ۱۲

کہ حضرت بلال کی وفات ۱۸ھ میں ہوئی اور حلب شہر میں دفن کیے گئے۔ حضرت بلال مؤذن تھے۔ آپ نے نکاح کیا ہے اور نوجوان کو یہ کہنا کہ اذان نہ دو، تمہاری شادی نہیں ہوگی بے بنیاد بات ہے بلکہ احادیث مقدسہ میں مؤذنوں کے لیے کافی حد تک ثواب اور فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اذان دینے کے بعد درود پاک الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔

ایک سائل جہلم

الجواب بعونہ تعالیٰ

جائز ہے۔ قرآن پاک نے مطلقاً حکم درود شریف پڑھنے کا فرمایا ہے۔ کسی وقت یا زمانہ کے ساتھ مقید نہیں کیا اور بوقت اذان مؤذن وضو کرتا ہے۔ کپڑے اس کے پاک ہوتے ہیں جگہ پاک ہوتی ہے۔ اندریں وقت درود پاک پڑھنا خواہ قبل از اذان ہو یا بعد از اذان باعث ثواب ہے۔

حضرت امام شعرانی اپنی کتاب "کشف الغمہ" ص۸۰ میں لکھتے ہیں:

قال شیخنا رضی اللہ عنہ لم یکن التسلیم الذی یفعلہ المؤذنون فی ایام حیواتہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا الخلفاء الراشدین قال کان فی ایام الروافض بمصر شرعوا التسلیم علی الخلیفۃ ووزرائہ بعد الا ان الذان توفی الحاکم بامراتہ وولو اختہ فسلموا علیہا وعلی وزرائہا من النساء فلما تولی الملک العادل صلاح الدین بن ایوب[1]

---

[1] صلاح الدین بن ایوب المتوفی ۵۸۹ھ۔ ۱۲

فابطل هذہ البدع وامر المؤذنین بالصلوٰۃ والتسلیم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدل تلک البدعۃ وامر بہا اھل الامصار و القرٰی فجزاہ اللہ خیراً۔

ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنا وہ جو مؤذنین کرتے ہیں یہ حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں نہ تھا۔ فرمایا مصر میں روافض کے زمانہ میں خلیفہ اور اس کے وزرا پر اذان کے بعد سلام کہنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ حاکم وقت نے اللہ کی مشیت سے وفات پائی اور لوگوں نے اس کی بہن کو والی بنا دیا تو انہوں نے اس پر اور اس کے وزرا پر جو عورتیں تھیں سلام کہنا شروع کیا۔ پس جب صلاح الدین ابن ایوب ملک عادل والی ہوئے تو انہوں نے ان بدعات کو باطل کیا اور اس کے بدلے آپ نے مؤذنین کو حکم دیا کہ وہ نبی کریم پر صلوٰۃ و سلام پڑھیں اور تمام شہروں اور قریٰ میں حکم نامہ جاری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا فرماوے۔

صاحب در مختار صہ ۳۶۲ میں فرماتے ہیں:

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربیع الآخر سنۃ سبع مائۃ واحدی و ثمانین فی عشا لیلۃ الاثنین ثم یوم الجمعۃ ثم بعد عشر سنین حدث فی الکل الا المغرب وھو بدعۃ حسنۃ۔

معلوم ہوا کہ بعد از اذان صلوٰۃ و سلام پڑھنا بدعت حسنہ اور جائز ہے۔ بدعت حسنہ کی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں اور پھر بالخصوص الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ صحابہ کرام سے بھی منقول ہے۔ لہٰذا یہ درود پاک پڑھنا جائز ہے۔

علامہ خفاجی نسیم الریاض صہ ۴۵۴ ج ۳ میں لکھتے ہیں:

والمنقول انھم کانوا یقولون فی تحیۃ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

منقول ہے کہ صحابہ کرام حضور پر تحیہ پیش کرتے ہوئے کہتے تھے الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ۔

یہ صرف وہابیہ نے مشہور کر رکھا ہے کہ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کا ثبوت نہیں ہے حالانکہ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کو اسی طرح سلام عرض کرتے تھے اور یہ ایسا درود ہے جس میں صلوٰۃ وسلام دونوں موجود ہیں۔ لہٰذا اس کے پڑھنے سے قرآن پر بھی عمل ہوگا کیونکہ قرآن پاک نے دونوں کے پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ وہابیہ کہتے ہیں کہ درود ابراہیمی میں زیادہ ثواب ہے۔ جواباً عرض ہے کہ قرآن میں دو حکم ہیں،

صلّوا علیہ وسلّموا۔

حضور پر صلوٰۃ وسلام پڑھو۔ درود ابراہیمی میں صرف صلوٰۃ کا ذکر ہے سلام کا نہیں۔ لہٰذا درود ابراہیمی پڑھنے سے قرآن کریم کے اس حکم پر عمل نہیں ہوگا۔ البتہ جب الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھیں گے تو صلوٰۃ اور سلام دونوں پر عمل ہو جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ نماز میں درود ابراہیمی کیوں پڑھا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نماز میں پہلے السلام علیک ایہا النبی میں سلام ہو چکا ہے لہٰذا اب اللہم صل میں صلوٰۃ ہو جائیگی دونوں کا نماز میں اجتماع ہو گیا۔ اگر نماز سے خارج درود ابراہیمی پڑھا گیا تو پھر صرف صلوٰۃ ہی ہو گی سلام نہیں ہوگا اور صرف صلوٰۃ پر اکتفاء کو علماء نے مکروہ لکھا ہے۔ دیکھئے علامہ نووی فرماتے ہیں؛

وقد نص العلماء علی کراھۃ الاقتصار علی الصلوٰۃ علیہ صلی اللہ علیہ وسلّم من غیر تسلیم۔

علماء نے تصریح کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر بغیر سلام کے صرف صلوٰۃ پڑھنا مکروہ ہے اس کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جو کہ ابن مسعود سے مروی ہے:

اقبل رجل حتی جلس بین یدی النبی صلی اللہ علیہ وسلّم ونحن عندہٗ فقال یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اما السلام علیک

فقد عرفناہ فکیف نصلی علیک اذا نحن صلینا فی صلوٰتنا صلی اللہ علیک قال فصمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی احببنا ان الرجل لم یسئلہ فقال اذا انتم صلیتم علی فقولوا اللھم صلی علی محمد الخ۔

(مسند احمد ج ۴ ص ۱۱۹)

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سامنے آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ سلام کو تو ہم نے سمجھ لیا ہے اب فرمایئے کہ ہم نماز میں آپ پر صلوٰۃ کیسے پڑھیں۔ حضور خاموش ہوئے یہاں تک کہ ہم نے سوچا وہ سوال ہی نہ کرتا۔ پھر حضور نے فرمایا جب نماز میں تم صلوٰۃ پڑھتے ہو تو یوں پڑھنا:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ الخ۔

حدیث کے الفاظ پر غور کریں۔ اس سائل نے عرض کی:

اذا نحن صلینا فی صلواتنا۔ (کہ ہم نماز کی حالت میں آپ پر صلوٰۃ کیسے پڑھیں)

گویا کہ درود ابراہیمی کا اختصاص نماز کے ساتھ ہے۔ نماز کے علاوہ جب درود پڑھا جائے تو وہ درود پڑھنا چاہیئے جس میں صلوٰۃ وسلام جمع ہوں۔ یہ دونوں الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ میں متحقق ہیں۔ لہذا یہ ہی پڑھنا چاہیئے۔ وہابیہ صرف ندا سے گھبراتے ہیں وہ ندا تو السلام علیک ایھا النبی میں کر چکے ہیں اور نمازی کو نماز میں السلام علیک ایھا النبی ﷺ بطور انشاء کہنا چاہیئے نہ کہ بطور اخبار کے۔ یعنی نماز کے تشہد میں جب نمازی السلام علیک ایھا النبی بارگاہِ نبوت میں پیش کرے تو آپ کو سلام کرنے کے قصد سے السلام علیک کہے نہ کہ واقع معراج میں جو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو سلام فرمایا تھا اس کی نقل اور حکایت کے طریقہ سے السلام علیک کہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن علی الحصکفی فرماتے ہیں:

ویقصد بالفاظ التشھد معانیھا مرادۃ لہ علی وجہ انشاء کانہ یحی اللہ ویسلم علی نبیہ وعلی نفسہ واولیائہ لاالاخبار عن ذالک۔

الفاظ تشہد سے ان کے معانی کا (اپنی طرف سے) ارادہ کرے گویا وہ با القصد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی عبادات کے تحفے پیش کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی کو سلام کر رہا ہے اور اپنے آپ کو اور دیگر انبیاء کو بھی سلام کر رہا ہے۔ لہٰذا اس لفظ سے سلام کی نقل اور حکایت کا ارادہ نہ کرے۔

ابن عابدین لکھتے ہیں:

ای لا یقصد الاخبار والحکایۃ عما وقع فی المعراج منہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن ربہ سبحانہ ومن الملائکۃ علیہم السلام۔

اور حضور کو سلام کرتے وقت واقعہ معراج میں اللہ تعالیٰ کے کہے ہوئے سلام کی حکایت اور نقل کا ارادہ نہ کرے۔ دیابنہ عموماً لوگوں کو یہی کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو سلام کرتے وقت واقعہ معراج کی حکایت کا قصد کرو۔ اور حضور علیہ السلام کو از خود سلام کرنے کا قصد نہ کرو۔ حالانکہ تمام فقہا اسلام فرماتے ہیں کہ نمازی بوقت تشہد درجہ محکی محنہ میں ادا کرے، نہ کہ درجہ حکایت میں جب تمام نماز وہ بحالت قصد اور انشا اور درجہ محکی عنہ میں پڑھتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ صرف تشہد میں پہنچ کر وہ اس درجہ کو ترک کر کے درجہ حکایت اور اخبار میں آجائے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے کیا ہی خوب لکھا ہے: ؎

وہابی گرچہ اخفا مے کند بغض نبی لیکن
نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

بلا یابید حب شیخ نجدی بر وہابیہ
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

رضا مست جام عشق ساغر باز مے خواہد
الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا

ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ گھبراہٹ صرف حرف ندا (یا رسول اللہ) کی ہے حالانکہ حرف

ندا ایھا النبیؐ میں بھی ہے۔ علامہ آلوسی حنفی المتوفی سنہ ۱۲۷۰ھ اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

اخرج ابن ابی حاتم و ابن مردویه و ابونعیم فی الدلائل عن ابن عباس قال کانوا یقولون یا محمد یا ابا القاسم فنهاهم الله تعالی عن ذالك بقوله سبحانه لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاه اعظاما لنبیه صلی الله علیه وسلم فقالوا یا نبی الله یا رسول الله و روی نحو هذا عن قتاده والحسن وسعید بن جبیر ومجاهد و فی الاحکام القرآن للسیوطی ان فی هذا النهی تحریم نداء له صلی الله علیه وسلم و باسمه والظاهر استمرار ذالك بعد وفاته الی الآن۔

ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابونعیم نے اپنی اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ لوگ حضور علیہ السلام کو بلانے کے وقت یا محمد اور یا ابا القاسم کہہ کر پکارا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس حکم سے ان کو اس طرح پکارنے سے منع کر دیا پھر صحابہ حضور کو یا نبی اللہ ، یا رسول اللہ کہہ کر پکارنے لگے۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ حضور کو نام لے کر بلانا حرام ہو گیا۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ حکم حضور کی وفات سے لے کر اب تک عام ہے۔ ملا علی القاری شرح شفا میں فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو ندا کے وقت یا نبی اللہ یا رسول اللہ یا حبیب اللہ کہو۔ ہر قسم کے خطابات میں خواہ حضور کی زندگی میں ہو یا بعد از وفات ہو۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کو بعد از وصال مبارک بھی یا رسول اللہ، یا حبیب اللہ کے الفاظ کیساتھ پکارا جائے گا۔ لہٰذا الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھنا خواہ قبل از اذان ہو یا بعد از اذان ہر طرح جائز ہے۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں:

۱۔ کہ موجودہ زمانہ میں جو لاؤڈ سپیکر پر اذان دی جاتی ہے اس کے جواز و عدم جواز کا کیا حکم ہے

۲۔ الاؤڈ سپیکر پر اذان کہنا، کیا یہ سنّت ہے یا بدعت ہے وہ اذان مسجد کے باہر ہو یا اندر مسجد کے باہر اگر اذان کے لیے الگ حجرہ بنایا جائے تو اس حجرہ کے اندر اذان دینا سنّت ہوگا یا بدعت ؟

۳۔ کیا مئیذنہ و مینار و صحن مسجد یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں تھے اگر نہیں تھے تو یہ کس زمانہ میں بنے ہیں کیا ان پر اذان دینا سنّت ہے یا بدعت ؟

۴۔ حضور کے زمانہ میں اذان دوسرے لوگوں کے بلند مکانوں پر دی گئی ہے یا بازار میں کھڑے ہو کر دی گئی ہے تو اب بھی یہی سنّت رہے گا کہ اذان لوگوں کے مکانوں پر کھڑے ہو کر دی جائے اذان کی مشروعیت کا کیا مقصد ہے، لوگوں کو نماز کے وقت سے اطلاع دینا ہے یا کچھ اور ہے اور الاؤڈ سپیکر پر اذان کہنے سے جب گاؤں یا شہر کی ساری مسجدوں میں اور محلے والوں کو اطلاع ہو جاتی ہے تو کیا دوسری مسجدوں میں بھی اذان کہی جائے یا نہ۔ جوف مسجد یعنی مسجد کے اندر کھڑے ہو کر اذان کہنے میں اگر کوئی خرابی ہے تو وہ آواز نہ پہنچنے کے باعث درآں حالیکہ مسجدوں کے میناروں پہ ہارن لگے ہوئے ہیں اور ان سے اذان کی آواز بہت دور تک پہنچ جاتی ہے۔ غرضیکہ آپ مہربانی فرما کر موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق کتب فقہ کے حوالہ جات مزین و مبرہن فرما کر عند اللہ ماجور و عند النّاس مشکور ہوں۔

رانا شبیر احمد خاں

ساکن عمرپور ڈاک خانہ چک ماہنی ضلع ملتان

الجواب بعونہ تعالیٰ

اذان کا اصل معنیٰ اعلام ہے (خبردار کرنا)، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :

الاذان لغۃ الاعلام قال اللّٰہ تعالیٰ (اذان من اللّٰہ و رسولہ) و شرعاً الاعلام لوقت الصلواۃ بالفاظ مخصوصۃ

یعنی اذان کا معنیٰ خبردار کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں وقت نماز کے لیے

مخصوصہ کے ساتھ خبردار کرنا اور اذان کی مشروعیت کا مقصد حقیقی مسلمانوں کو نماز کیلئے مطلع کرنا ہے۔

ان الاذان انما ھو نداء للناس لیأتو الی المسجد

کہ اذان وہ ندا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ مسجد کی طرف آئیں۔

ف: اب اگر اذان مسجد کے اندر دی جائے تو یہ منع ہے کیونکہ اس سے مقصد اذان پورا نہیں ہوتا۔ اذان کا مقصد چونکہ لوگوں کو مطلع کرنا ہے اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ اقدس میں اذان ایک مکان پر ہوتی تھی جیساکہ عروہ بن زبیر بنی نجار کی ایک عورت سے روایت کرتے ہیں کہ میرا گھر دوسرے لوگوں کی نسبت اونچا تھا اور مسجد کے قریب تھا۔

وکان بلال یؤذن علیہ الفجر (حضرت بلال اذان اس پر دیتے تھے)۔ امام ابوداؤد نے اسی مکان کو مینارہ سے تعبیر کرتے ہوئے اس حدیث کو باب المنارہ کے تحت ذکر فرمایا ہے۔ اس مکان پر اذان دینے کا یہی مطلب تھا کہ لوگوں کو اطلاع ہو جائے اور علماء نے لکھا ہے:

ومن السنۃ الماضیۃ ان یؤذن المؤذنون علی المنار۔

یعنی یہ طریقہ مستمرہ ہے کہ اذان منارہ پر ہونی چاہیئے اگر نہ ہو تو پھر سطح مسجد پر، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دروازہ مسجد پر ہونی چاہیئے اور منارہ سے مراد وہ ایک مکان ہے جو مسجدوں کی سطح پر بناتے تھے تاکہ اس پر اذان دی جائے۔ ان تینوں پر اذان متعین کرنے کا مطلب یہی ہے کہ لوگوں تک آواز پہنچ سکے اور حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ پہلے اذان اس وقت ہوتی تھی جبکہ امام منبر پر بیٹھتا تھا۔

جب خلافت عثمان کا زمانہ آیا تو لوگوں کی کثرت ہوئی تو حضرت عثمان نے اذان ثالث شروع کر دی اور اذان زوراد کے مقام پر ہوتی تھی۔ قال البخاری ھی موضع لبسوق المدنیۃ۔ بخاری[1]

---

[1] محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ ۱۲

نے کہا یہ بازار میں ایک جگہ تھی۔

روایت مذکورہ میں تو حضرت عثمان کی اذان کو اذان ثالث کہا گیا ہے اور بعض روایات میں حضرت عثمان کی اذان کو اذان اوّل کہا گیا ہے اور ایک روایت میں عثمان کی اذان کو اذان ثانی کہا گیا ہے۔ ان روایات میں ظاہراً تعارض ہے جس کا جواب یہ ہے کہ عثمان کی اذان کو ثالث باعتبار مزید اور اضافہ کے کہا گیا ہے اور اس کو اول باعتبار تقدیم فعلی کے کہا گیا ہے کہ یہ اذان اور اقامت پر مقدم ہے اور ثانی اس کو باعتبار اذان حقیقی کے کہا جاتا ہے جبکہ اقامت کا لحاظ نہ ہو۔

اگر لاؤڈ سپیکر میں اذان دی جائے خواہ منارہ مسجد ہو یا سطح مسجد یا دروازہ مسجد تو درست ہے کیونکہ مقصود لوگوں تک آواز پہنچانا ہے اور یہ ہی مسجد میں اذان نہ ہونے کی وجہ اور علّت ہے اور علّت کی تبدیلی سے حکم و معلول میں تبدیلی آجاتی ہے۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے: کہ ایک فقیہہ نے فرمایا کہ پہلے میں یہ فتویٰ دیا کرتا تھا کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا اور علماء کو بادشاہ کے دربار میں جانا حرام ہے اور یہ کہ بازار میں علماء کو نہ جانا چاہیئے۔ فرجعت عن الکل یعنی میں نے تمام مسائل مذکورہ سے رجوع کر لیا ہے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ اس میں قرآن کا ضیاع اور نقصان ہے اور لوگوں کو حاجت اور ضرورت ہے اور بازار والے عموماً دینی مسائل سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہذا میں نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ "بریق المنار" میں لکھتے ہیں کہ یوں ہی مساجد کی آرائش ان کی دیواروں پر سونے چاندی کے نقش و نگار کہ صدر اوّل میں نہ تھے بلکہ حدیث میں ہے کہ تم ان کو آراستہ کرو گے جیسا کہ آراستہ کیا یہود اور نصاریٰ نے۔ (ابو داؤد المتوفی ۲۷۵ھ)

مگر اب ظاہری تزک و احتشام ہی قلوب عامہ پر اثر تعظیم پیدا کرتا ہے لہذا ائمہ دین نے جواز کا حکم دیا۔ پھر لکھتے ہیں کہ بہت احکام ہیں کہ زمانے یا مقام کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں یعنی ایسی جگہ سے احکام سابقہ سے سند لانا حماقت ہے جو حاجت اب واقع ہوئی اگر سلف میں واقع ہوتی تو وہ بھی یہی حکم کرتے جو اس وقت ہم کرتے ہیں"۔ (بریق المنار ص ۲۰)

چونکہ پہلے آلہ مکبر الصوت الاؤڈ سپیکر نہ تھا لہٰذا فقہا نے یہی لکھا کہ مسجد کے اندر اذان دینی مکروہ ہے کیونکہ اس سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی اور الاؤڈ سپیکر میں اگر اذان مسجد کے اندر بھی ہو تو اطلاع ہو جاتی ہے لہٰذا کوئی حرج نہیں۔ علت کی تبدیلی سے حکم تبدیل ہو جاتا ہے اب اگر کوئی شخص بلا الاؤڈ سپیکر مسجد کے اندر اذان دے گا تو یہ مکروہِ تحریمہ اور حرام ہو گی جس کا اعادہ لازم کیونکہ مقصود متحقق نہیں ہوا۔ مینار، مئیذنہ صحن وغیرہ حضور کے زمانہ میں مسجد نبوی میں نہ تھے کیونکہ مسجد نبوی جہاں بنائی گئی تھی پہلے یہ جگہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اسعد[1] بن زرارہ رضی اللہ عنہ (نقیب محمدی) کی تربیت و نگرانی میں تھے۔ حضرت اسعد بن زرارہ نے پہلے سے یہاں مختصر سی جگہ نماز کے لیے بنا رکھی تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسجد کے لیے اسی جگہ کو پسند فرمایا تو ان یتیم لڑکوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور قبیلہ بنو نجار نے چاہا کہ اس کی قیمت ادا کرنے کی اجازت انہیں مل جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے دونوں باتیں منظور نہ فرمائیں۔ زمین کی قیمت دس دینار طے ہوئے اور نبی علیہ السّلام نے یہ قیمت ابوبکر صدیق سے دلا دی اور پھر زمین کو ہموار کر کے مسجد بنا دی گئی جس کا طول سو گز تھا۔ مسجد کی دیواریں جو کچی اینٹوں کی تھی تین گز بلند تھیں۔ کھجور کے تنے ستون کی جگہ اور کھجور پتے کڑی شہتیر کی جگہ ڈالے گئے۔ صحابہ نے کہا کہ چھت ڈال لیں تو اچھا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا نہیں موسیٰ علیہ السّلام جیسا عریش ہی خوب ہے۔ یہ چھت ایسی تھی کہ اگر بارش ہو جاتی تو پانی ٹپکتا، مٹی گرتی، فرش کیچڑ سا ہو جاتا، صحابہ اسی پر ہی سجدہ کرتے تھے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد ابوبکر صدیق نے مسجد نبوی میں کچھ تصرف نہیں کیا۔ عمر فاروق نے اس مسجد میں حضرت عباس کے گھر کو شامل کیا جو انھوں نے مسجد کے لیے ہبہ کیا تھا۔ حضرت عثمان نے مسجد نبوی کی سنگین دیواریں بنائیں، پتھر کے ستون لگائے اور چھت ڈالی۔

اذان میں چونکہ مقصد لوگوں کو مطلع کرنا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے کہا کہ مسجد میں

---

[1] حضرت اسعد بن زرارہ کی وفات ہجرت کے نویں مہینے شوال میں ہوئی۔ (فتاویٰ رضویہ ص۳۸۸ بحوالہ اصابہ)

اذان دینا مکروہ ہے ۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں کہ مسجد کے اندر وقتی اذان کہنا مکروہ ہے کما فی فتح القدیر مگر اذان طلب باراں یا دفع وبا وغیرہ کے دوران مسجد کے اندر بھی جائز ہے کیونکہ یہاں مقصود طلب رحمت الٰہی ہے اعلام نہیں ہے ۔
اعلیٰ حضرت نے نفیس تحقیق لکھنے کے بعد کہا کم از کم اتنا ضرور ثابت ہے کہ مسجد کے اندر اذان بدعت سیئہ ہے ہرگز حسنہ نہیں ۔ کیونکہ اگر مسجد کے اندر اذان ہو تو لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی اور نہ ہی حضور علیہ السلام سے ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک میں کسی وقت مسجد کے اندر اذان ہوئی ہو لہٰذا لازماً بدعت سیئہ ہو گی لیکن لاؤڈ سپیکر جدید زمانہ کی ایجاد ہے اس سے اگر مسجد میں اذان دی گئی تو بدعت سیئہ میں بالیقین تخفیف آئے گی کیونکہ علت کی تبدیلی سے حکم بھی متغیر ہو جاتا ہے ۔ ہر مسجد جہاں جماعت ہوتی ہے وہاں علیحدہ علیحدہ اذان ہو گی ۔ ایک اذان تمام گاؤں یا شہر کیلئے کافی نہیں اور لاؤڈ سپیکر میں اذان دینا نہ سنت ہے نہ بدعت سیئہ بلکہ جائز ہے کیونکہ آلہ مکبر الصوت جدید ایجاد ہے ۔ اا

الاصل فی الاشیاء اباحۃ

کہ ہر چیز میں اصل مباحت ہے ۔ منع کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے تقدیم میں بیان کیا ہے ۔ اذان کا مقصد صرف لوگوں کو مطلع کرنا ہے ۔ مسجد کے اندر اذان دینی مکروہ ہے کیونکہ اطلاع نہیں ہوتی ۔ اسی لیے فقہاء کرام نے منارہ یا سطح مسجد یا دروازہ مسجد یا فصیل مسجد یا سطح مسجد کا تعین فرمایا تھا ۔ اگر مسجد میں لاؤڈ سپیکر کے لیے علیحدہ کمرہ بنا ہوا ہے تو ٹھیک ہے ۔ اگر کمرہ نہیں بلکہ لاؤڈ سپیکر مسجد میں ہے تو پھر وہاں ہی اگر اذان دے دی گئی ہے تو ہو جائے گی ۔ اگر مسجد سے علیحدہ کمرہ ہے اس کے اندر اگر اذان دی جائے اور آواز باہر نہ جائے تو پھر بھی اذان نہ ہو گی کیونکہ مقصد مشروعیت لوگوں کو اطلاع دینی ہے جو کہ پورا نہیں ہو رہا ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب میت کو قبر میں دفن کرتے ہیں تو پھر قبر پر اذان دینی جائز ہے یا نہیں ؟

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالیٰ

قبر پر اذان دینی چاہیئے تاکہ میت ملائکہ (منکر و نکیر) کے سوالوں کا باطمینان جواب دے سکے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں جو مسلمان دفن کیا جائے اسے بھی کلمہ پاک کی تعلیم و تلقین کرنی چاہیئے تاکہ وہ ملائکہ کو جواب دے سکے اور بے شک آذان میں کلمہ لا الہ الا اللہ تین جگہ موجود بلکہ اذان کے تمام کلمات جواب نکیرین بتاتے ہیں۔ ان کے سوال تین ہیں:

۱۔ مَنْ رَبُّكَ : تیرا رب کون ہے ؟

۲۔ مَادِیْنُكَ : تیرا دین کیا ہے ؟

۳۔ ماکنت تقول فی ھذا الرجل : تو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے باب میں کیا اعتقاد رکھتا تھا۔

اب اذان کی ابتدا اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ اور آخر میں اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ سوال من ربک کا جواب سکھائیں گے۔ ان کے سننے سے یاد آئے گا کہ میرا رب اللہ ہے اور اشھد ان مُحَمَّدًا رسول اللہ، اشھد ان محمد ا رسول اللہ سوال ماکنت تقول فی ھذا الرجل کا جواب تعلیم کریں گے اور میں انہیں اللہ کا رسول جانتا ہوں۔ اور حیّ علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح جواب مادینک کی طرف اشارہ کریں گے کہ میرا دین وہ تھا جس میں نماز رکن وستون ہے کہ الصلوٰۃ عماد الدّین۔ تو بعد دفن اذان دینے میں ارشاد کی تعمیل ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حدیث صحیح متواتر مذکور میں فرمایا۔ (ایذان الاجر فی اذان القبر صفحہ ۶)

معلوم ہوا کہ قبر پر اذان دینی شرعاً جائز ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب "انوار الشریعۃ" میں بھی بیان کیا ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ اذان میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نام پاک سن کر انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا جائز ہے یا نہیں؟ جواب باحوالہ کتب معتبرہ سے تحریر کریں اور وہابی دیوبندی کہتے ہیں کہ کسی صحیح حدیث میں انگوٹھے چومنا ثابت نہیں ہے۔ ۱۲۔

ایک سائل قلعہ سوبھا سنگھ۔ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اذان میں نبی پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نام پاک سن کر انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا جائز اور مستحب اور باعث رحمت و برکت ہے اور ممانعت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جواز کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ شریعت میں ممانعت ثابت نہیں ہوئی ہے اور جو منع کرتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ ممانعت پر دلیل قائم کرے۔ پھر بھی اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اثبات پر بیشمار دلائل ہیں۔

علامہ اسماعیل حقی تفسیر روح البیان صفحہ ۶۴۹ ج میں لکھتے ہیں:

واظهر الله تعالىٰ جمال حبيبه فى صفاء ظفرى ابهاميه مثل المرأة فقبل آدم ظفرى ابهاميه ومسح على عينيه۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے جمال (محمد) کو حضرت آدم علیہ السلام کے انگوٹھوں کے ناخنوں میں مثل آئینہ ظاہر فرمایا تو حضرت آدم نے اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو چوم کر آنکھوں پر پھیرا۔ (اسی وجہ سے یہ سنت ان کی اولاد میں جاری ہوئی)۔

فلما اخبر جبريل النبى صلى الله تعالىٰ عليه وسلم بهذه القصة قال

علیہ السلام من سمع اسمی فی الاذان فقبل ظفری ابھامیہ و مسح

علی عینیہ ۔

پھر جب جبریل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی تو آپ نے فرمایا : جو

شخص اذان میں میرا نام سنے اور اپنے انگوٹھوں کو چومے اور اپنی آنکھوں سے لگائے

وہ کبھی اندھا نہیں ہوگا۔

اور علامہ حقی یہ بھی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور ایک ستون کے ساتھ بیٹھ گئے اور حضرت ابو بکر صدیق بھی بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر اذان دینا شروع کی۔ جب بلال نے اشھد ان محمدًا رسول اللہ کہا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو اپنی دونوں آنکھوں پر رکھا اور کہا : قُرَّۃُ عَیْنِیْ بِكَ یارسول اللہ ۔ جب حضرت بلال اذان سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا، اے ابو بکر جو شخص ایسا کرے جیسا کہ تم نے کیا ہے تو خدا اس شخص کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ رضویہ ص ۴۲۹ میں فرماتے ہیں :

امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ فقیہ محمد بن سعید خولانی سے روایت کرتے ہیں وہ فقیہ عالم ابو الحسن علی بن محمد بن حدیہ حسینی سے وہ فقیہ زاہد بلالی سے کہ سیدنا حضرت امام حسن علیہ السلام نے فرمایا جو شخص مؤذن سے (اشھد ان محمد رسول اللہ) سن کر یہ دعا پڑھے :

مرحبا بحبیبی وقرۃ عینی محمد بن عبد اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

پھر دونوں انگوٹھے چومے اور آنکھوں پر رکھے وہ نہ کبھی اندھا ہوگا اور نہ اس کی کبھی آنکھیں دکھیں گی اور وہابیہ کا یہ کہنا کہ کسی صحیح حدیث میں انگوٹھے چومنا ثابت نہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے : کہ محدثین جب کسی حدیث کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ وہ حدیث صحیح نہیں ۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حدیث ضعیف ہے یا موضوع ہے بلکہ صحت اور ضعف کے درمیان کئی مراتب ہیں مثلاً حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ وغیرہ ۔

خلیل احمد انبیٹھوی دیوبندی لکھتے ہیں :

و ایضا عدم صحت الحدیث لا یستلزم ضعفہ بل ان یکون حسنا۔

(بذل المجھود ص۱۲۱ ج۲)

ابوداؤد کا یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ضعیف ہے بلکہ لازم آئے گا کہ حدیث حسن ہو۔ نفی صحت ضعیف ہونے کو مستلزم نہیں بلکہ درمیان کئی مراتب ہیں لہذا حدیث حسن ہوگی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

من نفی الصحۃ لا ینتفی الحسن۔

یعنی صحت کی نفی سے حدیث کا حسن ہونا منتفی نہیں ہوتا اور یہ حسن لذاتہ اگرچہ صحیح سے کچھ کم ہے۔ لیکن استدلال میں اسی طرح ہے جیسا کہ حدیث صحیح ہے۔

امام ابن حجر مکی لکھتے ہیں کہ امام احمد کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ صحیح لذاتہ ہی نہیں ہے حسن کی نفی نہیں ہو گی اگرچہ حسن بھی حجۃ ہے۔

امام حلبی فرماتے ہیں :

قول الترمذی لا یصح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الباب شئی انتھی لا ینفی وجود الحسن ونحوہ والمطلوب لا یتوقف ثبوتہ علی الصحیح بل کما یثبت بہ یثبت بالحسن ایضاً۔

ترمذی کا فرمانا کہ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ صحیح نہیں احسن اور اس کے مثل کی نفی نہیں کرتا اور ثبوت مقصود کچھ صحیح پر ہی موقوف نہیں بلکہ جس طرح صحیح سے ثابت ہوتا ہے یوں ہی حسن سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

ملا علی قاری موضوعات کبیر میں فرماتے ہیں :

لا یصح لا ینافی الحسن۔ یعنی محدثین کا قول ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس کے

حسن ہونے کی نفی نہیں کرتا۔

علّامہ نورالدّین علی سمہودی المتوفی ۹۱۱ھ فرماتے ہیں :

قد یکون غیر صحیح وھو صالح للاحتجاج بہ اذالحسن رتبۃ بین الصحیح والضعیف۔

یعنی کبھی حدیث صحیح نہیں ہوتی اور باوجود اس کے وہ قابل حجیت ہے اس لیے کہ حسن کا رتبہ صحیح وضعیف کے درمیان ہے۔ (فتاویٰ رضویہ صہ ۴۳۱)

معلوم ہوا کہ جب محدثین صحت کی نفی کا حکم کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح یا صحیح لذاتہ کی نفی کر رہے ہیں حسن وغیرہ کی نفی نہیں کرتے پھر یہ نفی صحت کا حکم حدیثِ مرفوعہ کے ساتھ خاص ہے اور انگوٹھے چومنے والی حدیث جوکہ ہے وہ حدیث موقوف ہے اسکے متعلق محدثین لایصح کا حکم ہی نہیں لگا رہے ہے اسی لیے تو ملاّ علی القاری حنفی اس حدیث (انگوٹھے چومنے والی) کے متعلق تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

قلت واذا ثبت رفعہ الی الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فیکفی للعمل بہ لقولہ علیہ السلام علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔

یعنی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی اس فعل کا ثبوت عمل کو کافی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں تم پر لازم کرتا ہوں اپنی سنّت اور اپنے خلفاء راشدین کی سنّت کو (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) تو صدیق سے کسی شے کا ثبوت بعینہٖ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے ثبوت ہے۔ (فتاویٰ رضویہ صہ ۴۲۶)

چونکہ محدثین کرام حدیث موقوف کے متعلق حکم صحت کا نہیں لگا رہے ہے بلکہ وہ احادیث مرفوعہ کے متعلق یہ حکم فرماتے ہیں۔ دیکھئے علاّمہ سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ مقاصد حسنہ میں فرماتے

لا یصح فی المرفوع من کل ھذا شئی۔

اور علی قاری بھی فرماتے ہیں کہ

کل مایروی فی هذا فلا یصح رفعه ۔

علامہ ابن عابدین الشامی الحنفی بھی لکھتے ہیں :

لم یصح فی المرفوع من هذا شئ ۔

یعنی اس مسئلہ میں کوئی مرفوع حدیث صحیح وارد نہیں ہوئی ۔ موقوف حدیث ، وہ تو علی قاری فرماتے ہیں کہ موقوف حدیث ثابت ہے جو کہ عمل کے لیے کافی ہے ۔

۔ خلاصہ کلام یہ ہے : وہابیہ اور دیابنہ کا یہ کہنا کہ انگوٹھے چومنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث نہیں ہے ۔ اس کا جواب اوّل یہ ہے کہ حدیث کی صحت کی نفی سے اس کا ضعیف یا موضوع ہونا لازم نہیں آتا بلکہ محدثین خاص صحیح کی نفی کر رہے ہیں جن کا مطلب صرف یہ ہے کہ حدیث صحیح نہیں ہے البتہ حسن وغیرہ ہوسکتی ہے جو کہ صحیح کی طرح ہی قابلِ استدلال ہے ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ محدثین یہ نفی صحت کا حکم خاص احادیث مرفوعہ پر لگاتے ہیں موقوفہ پر نہیں اور یہ حدیث (انگوٹھے چومنے والی) چونکہ موقوف ہے اور موقوف بھی قابل عمل ہے جیسا کہ محدثین فرماتے ہیں ۔ لہٰذا انگوٹھے چومنا مستحب اور سنّتِ صدیقی اور باعث رحمت و برکت ہے اور جو یہ عمل کرتا ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام پاک کے صدقے اس کی آنکھیں خراب نہیں ہوتیں لہٰذا یہ عمل کرنا چاہیئے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

باب السنن والفرائض والنوافل

الاستفتاء

بخدمت جناب استاذ العلماء مولانا غلام رسول صاحب مدظلہ،

ایک مسئلہ دریافت طلب ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک خروج بصنعہ یعنی اپنے اختیار کے ساتھ نماز سے باہر ہونا فرض ہے اور ہر فرض پر ثواب ہوتا ہے۔ اب ایک آدمی نماز سے باہر قہقہہ لگا کر یا کوئی دیگر حدث وغیرہ کر کے نماز سے باہر ہوتا ہے کیا اس پر بھی ثواب ہوگا یا کراہت ہوگی۔ فقہاء نے توکراہت لکھی ہے اگر کراہت ہے تو پھر یہ کیسا فرض ہے جس کی ادائیگی سے بجائے ثواب کے کراہت ہے۔

قاضی محمد اعظم فاضل عربی خطیب سی۔ ایم۔ ایچ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک خروج بفعلہ و صنعہ (یعنی نمازی کا اپنے اختیار کے ساتھ نماز سے باہر ہونا) فرض ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

الاصل فیہ ان الخروج عن الصلوٰۃ بصنع المصلی فرض عند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ و لیس بفرض عندھما۔

یعنی مسئلہ یہ ہے کہ نمازی کا اپنے اختیار سے باہر نکلنا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک ایک فرض ہے اور صاحبین کے نزدیک فرض نہیں ہے۔ نماز کے سات فرض ہیں:

۱۔ تحریمہ، ۲۔ قیام، ۳۔ قرأت، ۴۔ رکوع، ۵۔ سجدہ، ۶۔ قعدہ اخیرہ، ۷۔ خروج بصنعہ۔ یہ ساتواں فرض امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے۔ اگر نمازی نماز سے باہر

قہقہہ لگا کر نکلا ہے تو فرض ادا ہو گیا لیکن ثواب نہیں ہو گا بلکہ کراہت ہو گی۔ قیاس کے مطابق اس پر ثواب ہونا چاہیے تھا کیونکہ مستحب میں بھی ثواب ہوتا ہے۔ فرضیت میں تو ثواب اعلیٰ درجہ کا ہے لیکن ثواب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے (حالانکہ فرضیت کی ادائیگی ہو رہی ہے) کہ امام نے اس فرض کا مدار قیاس پر نہیں رکھا بلکہ تنقیح مناط کے ساتھ اس ساتویں فرض کی فرضیت ثابت کی ہے۔

تنقیح مناط اور قیاس میں فرق ہے وہ یہ کہ تنقیح مناط قیاس سے ایک علیحدہ نوع ہے کیونکہ قیاس میں جو حکم شرعی نص سے ثابت ہوتا ہے بعینہٖ فرع کی طرف متعدی کر دیا جاتا ہے لیکن تنقیح مناط میں ایسے نہیں ہوتا کیونکہ تنقیح مناط میں تعدیہ فرع کی طرف نہیں ہوتا مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

تحریمھا التکبیر۔

یعنی نماز کے لیے تحریمہ اللہ اکبر ہے۔ امام ابوحنیفہ نے ہر ذکر جو کہ مشعر بالتعظیم ہے اس کے ساتھ اس کی تنقیح بیان کی ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے:

وتحلیلھا التسلیم۔

کہ نماز کے لیے محلّل (نماز سے باہر آنے کا سبب) تسلیم (السلام علیکم ہے) اس کا تنقیح مناط خروج بصنعہ ہے پھر صیغہ اللہ اکبر واجب ہے اسی طرح لفظ سلام واجب ہے۔ اس کا غیر یعنی حدث بالعمد مکروہ ہے حالانکہ تنقیح مناط دونوں جگہ ہے کیونکہ حدث بالعمد میں بھی خروج بصنعہ ہے اور سلام میں بھی خروج بصنعہ ہے۔ امام ابوحنیفہ ان صیغوں کے غیر کو ان پر (اللہ اکبر اور السلام پر) قیاس نہیں کرتے تاکہ دونوں کا حکم مساوی ہو بلکہ منصوص میں تنقیح مناط سے کام لیا ہے اور غیر کی طرف تعدیہ نہیں فرمایا۔ حتیٰ کہ دونوں سلام اور حدث بالعمد میں ثواب ہو بلکہ منصوص میں ثواب ہو گا اور غیر منصوص میں ثواب نہیں ہو گا۔ معلوم ہوا کہ تنقیح مناط قیاس نہیں ہے بلکہ قیاس سے ایک علیحدہ قسم ہے۔ (کما قال البیضاوی) کیونکہ اس میں تعدیہ نہیں۔ تنقیح مناط وہاں ہوتا ہے، جہاں شارع علیہ السلام نے ایک ایسی صورت میں حکم صادر فرمایا ہو جہاں چند امور جمع ہوں۔ اتفاقاً

ان امور سے بعض اس حکم کا مناط (دار و مدار) ہیں ۔ بعض نہیں ہیں ۔ ایک امر کو متعین کر لینا کہ یہ علت ہے یہی تنقیح مناط ہے ۔ مثلاً حدیث پاک میں ہے کہ سلمہ بن صخر بیاضی (جیسا کہ حافظ عبد الغنی المتوفی سنہ ۶۰۰ھ) نے کہا بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اس نے کہا "ھلکت" حضور میں ہلاک ہو گیا ۔ فرمایا کیا وجہ ہے ۔ عرض کی :

وقعت علی امرأتی فی رمضان ۔ میں نے رمضان میں عورت کے ساتھ بحالت روزہ جماع کیا ہے ۔ حضور نے کفارہ کا حکم دیا ۔ اس نے عرض کی مجھے استطاعت نہیں ۔(ہدایہ)

اب ابو حنیفہ نے وجوب کفارہ کے لیے تنقیح مناط اس فعل کا مفطر ہونا متعین کیا ہے ۔ خواہ جماع ہو یا اکل و شرب بالعمد ہو ۔ جماع کا اس واقعہ میں ہونا امر اتفاقی ہے ورنہ جیسے جماع مفطر ہے ، اسی طرح اکل و شرب بھی مفطر ہیں اور امام احمد فرماتے ہیں کہ مناط صرف جماع ہے اکل و شرب نہیں ، اور ابو حنیفہ کے نزدیک تنقیح مناط اس فعل کا مفطر ہونا ہے اور ایک تخریج مناط ہے اس میں چند امور جمع ہوتے ہیں ہر امر میں علیۃ کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ مجتہدین ان امور سے کسی امر کو علۃ کے لیے ترجیح دیتے ہیں اور مناط مقرر کر دیتے ہیں ۔ مثلاً اشیاء ستہ میں ربا (سود) سے منع کیا گیا ہے اس جگہ چند امور جمع ہو گئے ہیں ۔ قدریت ، جنسیت ، ثمن ، طعم ، اقتیات ، ادخار (روزی ، ذخیرہ) ابو حنیفہ نے سود کے لیے جنس اور قدر کو مناط حکم قرار دیا ہے ۔

امام شافعی نے طعام اور ثمن کو علۃ معین کیا ہے ۔

امام مالک نے اقتیات ادخار کو علۃ بنایا ہے ۔

تنقیح مناط اور تخریج مناط میں فرق یہ ہے کہ تنقیح میں بعض امور کو علت ہونے میں دخل ہوتا ہے ۔ مجتہد مناط کی تنقیح کرتا ہے تخریج میں تمام امور کو علت بننے کی قابلیت ہے ۔ مجتہد ایک کو ترجیح دیتا ہے تنقیح مناط اور تخریج مناط دونوں مجتہد سے متعلق ہیں اور تحقیق مناط میں اجتہاد کا ہونا لازم نہیں ہے ۔

تحقیق مناط یہ ہے کہ شارع علیہ السلام سے ایک حکم جزوی صورت میں صادر ہو پھر

اس نوع کے تمام جزئیات میں یہ حکم ثابت کیا جائے۔ اس کی مثال حرم کے شکار کی تقویم (قیمت) ہے پس قیمت کا کسی جزئی میں معلوم کرنا تحقیق مناط ہے۔ یہ بھی قیاس نہیں بلکہ علیحدہ قسم ہے۔ قیاس حدود اور کفارات میں جاری نہیں ہوسکتا لیکن تنقیح مناط حدود اور کفارات میں جاری ہوسکتا ہے حکم کے انواع کا ظاہر کرنا تشریع ہے اور یہ بیان کرنا کہ یہ جزئی اس نوع کے افراد سے ہے اجتہاد ہے۔ بعض دفعہ ایک جزئی پر متعدد کلیات کا صدق ہوجاتا ہے۔ اسی طرح کبھی واقعہ واحدہ مختلفہ قواعد کے نیچے داخل ہوتا ہے جس سے تردد ہوتا ہے۔ مجتہد کہتا ہے کہ یہ واقعہ فلاں قاعدے کے نیچے داخل ہے اور فلاں کے نہیں اسی کا نام اجتہاد ہے۔ مثلاً زید کی نماز مکہ مکرمہ میں وقت مکروہ میں ایک جزئی ہے۔ اب امام شافعی فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں وقت مکروہ میں نماز جائز ہے کیونکہ حضور نے اوقات مکروہہ سے مکہ مکرمہ کو مستثنیٰ کیا ہے۔

ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ زید کی نماز وقت مکروہہ میں مکہ مکرمہ میں مکروہ ہے کیونکہ اوقات مکروہہ کی نہی عن الصلوٰۃ مکہ مکرمہ کو بھی شامل ہے یہی مدارک اجتہاد ہے۔ الغرض ابو حنیفہ کے نزدیک ساتواں فرض تنقیح مناط سے ثابت ہے قیاس سے نہیں۔ تنقیح مناط میں تعدیہ نہیں ہوتا لہٰذا اگر خروج بصنعہ حدث بالعمد کے ساتھ ہوا تو ثواب نہیں ہوگا۔ اگر خروج بصنعہ و بفعلہ متصوص (السلام علیکم) کے ساتھ ہوا تو ثواب ہوگا۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصّواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ظہر اور عشاء کی اول چار سنتیں پڑھنے کا طریقہ کیا ہے یعنی دو رکعت کے بعد تشہد پورا پڑھا جائے یا نہیں اور تیسری رکعت میں سبحانک اللّٰھم پڑھا جائے یا نہیں۔ اس کے متعلق تفصیلاً تحریر فرمائیں۔

صوفی منظور احمد

اسماعیل آباد۔ ملتان

الجواب بعونہ تعالیٰ

چونکہ ظہر کی پہلی چار رکعتیں سنّتِ مؤکدہ ہیں ان میں درمیانی قعدہ میں التحیات صرف عبدہٗ ورسولہ تک پڑھی جائے اور تیسری رکعت کو ثنا سے نہ شروع کرے بلکہ الحمد سے شروع کرے۔

ویقتصر المتنفل فی الجلوس الاول من السنۃ الرباعیۃ المؤکدۃ وھی اللتی قبل الظہر والجمعۃ وبعدھا علی قرأۃ التشہد فیقف علی قولہ واشہد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہ واذا تشہد فی الآخر یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم واذا قام لشفع الثانی من الرباعیۃ الموکدۃ لا یأتی فی ابتداء الثالثۃ بدعاء الاستفتاح کما فی فتح القدیر وھو الاصح کما شرح المنیۃ لانہا لتاکدھا اشبہت الفرائض فلا تبطل شفعتہ۔

یعنی ظہر اور جمعہ کے پہلے اور اس کے بعد چار رکعتیں سنّت مؤکدہ پڑھنے والا پہلے جلوس میں اپنے قول اشہد ان مُحَمَّدًا عبدہٗ ورسولہ پر ٹھہرے اور جب آخری تشہد میں ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر درود پڑھے اور جب دوسرے شفعے (دو رکعت) کے لیے چار رکعت مؤکدہ سے کھڑا ہو تو تیسری رکعت کو دُعاءِ استفتاح (سبحانک اللہم) کے ساتھ شروع نہ کرے ایسے ہی فتح القدیر میں ہے اور یہی صحیح تر ہے جیساکہ منیہ نے تشریح کی ہے اس لیے کہ چار رکعتیں پڑھنے سے اس کا آخری شفعہ باطل نہیں ہوگا۔

عصر اور عشاء کی نماز سے پہلے کی چار رکعتیں سنّت مؤکدہ نہیں بلکہ مستحب ہیں۔ ان کا طریقہ مذکورہ بالا طریقہ کے برعکس ہے۔

بخلاف الرباعیات المندوبۃ فلیستفتح ویتعوذ ویصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلّم فی ابتداء کل شفع منہا۔

بخلاف ان چار رکعتوں کے جو مستحب ہیں ان میں تیسری رکعت میں سبحانک اللھم اور اعوذ پڑھے اور پہلے قعدہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے۔

یعنی پہلے التحیات میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھے اور دعا بھی اور تیسری رکعت کو سبحانک اللھم سے شروع کرے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں اگر مقیم نے امام مسافر کی اقتدا کی ایک یا دو رکعت نہ پائی۔ مثلاً دوسری رکعت میں ملا یا التحیات میں شریک ہوا تو امام کے سلام کے بعد نماز کیسے پڑھے۔۔ مہربانی فرما کر جواب جلدی تحریر کریں۔

حافظ محمد امین۔ وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نوراللہ مرقدہٗ " فتاویٰ رضویہ " میں کتاب الصلوٰۃ کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ صورت مسبوق لاحق کی ہے۔ دو پچھلی رکعتوں میں کہ مسافر سے ساقط ہیں مقیم مقتدی لاحق ہے۔

لانہ لم یدرکھا مع الامام ما اقتدی بہ

اور اس کے شریک ہونے سے پہلے ایک رکعت یا دونوں جس قدر نماز ہو چکی ہے اس میں مسبوق ہے اور حکم اس کا یہ ہے کہ جتنی نماز میں لاحق ہے پہلے اسے بے قرأت ادا کرے یعنی حالت قیام میں کچھ نہ پڑھے بلکہ اتنی دیر کہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے، محض خاموش کھڑا رہے بعدہٗ جتنی نماز میں مسبوق ہوا اسے مع قرأت یعنی سورۃ فاتحہ و سورۃ کے ساتھ پڑھے۔ اگر دونوں رکوع نہ پائے تھے تو پہلے دو رکعتیں بلا قرأت پڑھ کر بعد التحیات دو رکعتیں سورت و فاتحہ کے ساتھ پڑھے اگر ایک رکوع نہ ملا تھا تو پہلے ایک رکعت بلا قرأت پڑھ کر بیٹھے اور التحیات پڑھے کیونکہ

یہ اس کی دوسری ہوئی ۔ پھر کھڑا ہو کر ایک رکعت ویسی ہی بلاقرأت پڑھ کر اس پر بھی بیٹھے اور التحیات پڑھے کہ یہ رکعت اگرچہ اس کی تیسری ہے مگر امام کے حساب سے چوتھی ہے اور رکعاتِ فاتحہ کو امام کی ترتیب پر ادا کرنا ذمہ لاحق لازم ہوتا ہے ۔ پھر کھڑا ہو کر ایک رکعت با فاتحہ و سورت پڑھ کر بیٹھے اور لبعد تشہد نماز قائم کرے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

باب الامامتہ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک امام مسجد اور مقتدی میں کسی مسئلہ کی بحث میں تلخ کلامی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کو دونوں برا بھلا کہتے ہیں اب اس مقتدی نے امام مسجد کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے ۔ چند آدمیوں نے کوشش کی کہ وہ امام مسجد کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دے ۔ مگر مقتدی کا عذر ہے کہ میں نے امام مسجد کو دل سے برا بھلا کہا ہے اس لیے میری نماز مذکورہ امام کے پیچھے نہیں ہوتی براہ کرم اس مسئلہ کا جواب دے کر مشکور فرمائیں کہ آیا دونوں کا راضی نامہ کرا دینے سے امام مسجد کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں ۔

المستفتی

رانا محمد اسلم کلرک پراویڈنٹ فنڈ آفس

کوہ نور ملز لیاقت آباد ضلع میانوالی ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اگر امام اور مقتدی کے درمیان اختلاف شرعی وجہ سے ہوا ہے کہ امام نے کوئی کام

خلاف شرع کام کیا ہے تو پھر ایسے امام کو خود امام بننا ناجائز ہے کیونکہ امام کو چاہیئے اگر مقتدی ناراض ہوں یا لوگ پسند نہیں کرتے تو امام نہ بنے۔ ایسی صورت میں امام کی خود نماز مکروہ تحریمہ ہے۔

فتاویٰ درمختار میں ہے:

ولو ام قوما وھم له کارھون کرہ له ذالك تحریما لحدیث

ابی داؤد لا یقبل الله صلوٰۃ من تقدم قوما وھم له کارھون۔

جب ایسی صورت میں بحیثیت امام اس کی خود ہی نماز مکروہ تحریمہ ہے تو وہ امام کیسے بن سکتا ہے۔ اگر امام میں کوئی شرعی خرابی نہیں ہے بلکہ امام متقی متشرع صحیح العقیدہ اہل السنّت و الجماعت ہے لیکن مقتدی کسی دنیاوی وجہ سے ناراض ہیں جن کی ناراضگی صرف خواہشاتِ نفسانیہ پر مبنی ہے تو پھر امام کا کیا قصور ہے۔ مقتدی اگر نماز نہیں پڑھتے تو یہ مقتدی گنہگار اور تارک جماعت ہیں۔

فتاویٰ نظامیہ میں ہے:

وان ھو احق والکراھة علیھم۔

بہرصورت اگر مسجد میں امام برحق تھا تو اس مقتدی کو امام کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیئے بلکہ امام سے معذرت کرے۔ اگر نماز نہیں پڑھتا تو گناہ مقتدی پر ہے امام کی شخصیت اس سے متاثر نہ ہوگی۔

والله ورسوله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام مسجد و خطیب مذبح خانے میں جانور ذبح کرتا ہے اور ذبح پر اجرت اور مزدوری لیتا ہے یہ اس کا کسب ہے۔ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اور اس کو مسجد میں امام و خطیب رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔

المستفتی: محمد یوسف میرپور۔ آزاد کشمیر۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر امام صحیح العقیدہ اہل السنّت والجماعت، متقی اور پرہیزگار ہے اور مسائل نماز سے خوب واقف ہے نیز اس میں کوئی شرعی نقص نہیں ہے تو اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے اور اس کو امام مسجد رکھنا شرعاً جائز ہے۔

فقہاء کرام فرماتے ہیں:

وامامة ليست بمكروهة وليس اخذ الاجرة على ذبح الشاة و غيرها ممنوعاً شرعاً۔

یعنی جانوروں کے ذبح پر اجرت لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے لہذا جو امام ذبح کرتا ہے اس کی اقتدار صحیح ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر نمازی سے کسی رکعت میں رکوع چھوٹ گیا اب کیا وہ رکوع کو قضا کرے یا دوبارہ رکعت کا اعادہ کرے۔

بینوا وتوجروا۔

سائل محمد شریف

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں دوبارہ اس رکعت کو قضا کرے کیونکہ یہ رکعت ہی حقیقت میں نہیں ہوئی اور رکوع کو قضا نہیں کیا جائیگا۔

الظاهر ان الركوع بعد فوته لا يقضى فى الصلوٰة بل الركعة اللتى ترك فيها الركوع لم يصح فيعيدها كما يستفاد من محيط الرخسى حيث قال الاصل انه لو ترك فرضا او واجبا هو قربة بانفراده

فعلیہ قضا مالم یخرج عن صلواتہ والرکوع و القعدۃ لا یقضی بعد فوتہ لانہ لم یشرع قربۃ فلو سجد فی رکعۃ ولم یرکع لم یعتد بہا لان القیام بلا رکوع غیر معتبر انتھٰی ۔

قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز عبادت اور قربت ہو اگر وہ نماز میں رہ جائے تو اس کو نماز میں ہی قضا کرے اور رکوع چونکہ قربت نہیں ہے لہذا اگر نماز کے اندر یہ چھوٹ جائے تو قضا نہ کرے بلکہ اس رکعت کو دوبارہ پڑھے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں کہ ایک نمازی نماز پڑھتے وقت قرأت صرف دل میں پڑھتا ہے زبان سے نہیں پڑھتا ۔ کیا یہ قرأت ہو جائے گی یا نہیں اور اس کی نماز صحیح ہو گی یا نہیں ۔ بینوا و توجروا ۔

خالد محمود چشتی ۔ لاہور ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نماز نہیں ہو گی کیونکہ جو قرأت دل میں پڑھی گئی ہے وہ حقیقت میں قرأت ہی نہیں ہے کیونکہ قرأت زبان سے ہوتی ہے ۔ ہدایہ میں ہے :

القرأۃ فعل اللسان کہ قرأۃ فعل زبان ہے ۔

بحر الرائق میں ہے :

وحد القرأۃ تصحیح الحروف بلسانہ بحیث یسمع نفسہ علی الصحیح ۔ کہ قرأت یہ ہے کہ حروف کو اپنی زبان کے ساتھ ادا کرے اور اپنے نفس کو سنا لے ۔ یہی قول صحیح ہے ۔

فالقرأۃ المفروضۃ فی الصلوٰۃ لا یعتد بہا مالم یتلفظ بہا بلسانہ

ولا عبرة فی ھذا الباب بالاخطار فی القلب الذی یسمونه قرأة قلبیة۔

پس وہ قرأت جو نماز میں فرض ہے جب تک اس کو زبان سے تلفظ نہ کیا جائے غیر معتبر ہے اور نماز کے باب میں قرأت قلبیہ کا اعتبار ہی نہیں ہے لہٰذ صورت مسئولہ میں اگر کسی نے صرف اپنے دل میں نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز نہیں ہوگی اور نماز کے لیے ضروری ہے کہ قرأت زبان کے ساتھ پڑھے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص قرآن پاک نماز تراویح میں اس طرح پڑھتا ہے کہ الف ، عین اور ھ ، ح میں فرق نہیں کرتا اور نہ ہی مدّات اور صحیح مخارج ادا کرتا ہے۔ ایسے امام کے پیچھے حافظ سند یافتہ عالم کی نماز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ معتبر فتاوٰی سے مسئلہ حل کر کے ارسال فرمادیں۔

سید حافظ درویش علی

امام مسجد جامعہ نور۔ ریلوے روڈ ننکانہ ضلع شیخوپورہ۔

الجواب بعونہ تعالٰی

صورت مسئولہ میں نماز ہرگز جائز نہیں۔ فتاوٰی رضویہ میں جزئیہ صریحہ کے متعلق ہے کہ اگر امام ایسا قرآن مجید غلط پڑھتا ہے جس میں ا ، ع یا ت ۔ ط یا ث ، ص ، س یا ہ ، ح یا ذ ، ض ، ظ ، میں فرق نہیں کرتا تو نماز باطل ہے۔ خواہ کوئی پیچھے صاحب علم آدمی ہو یا عام آدمی ہو۔ کسی کی نماز نہ ہو گی۔ (فتاوٰی رضویہ ص ۲۱۹)

امام متقی پرہیزگار اور امامت کے مسائل سے واقف قرآن کی تلاوت صحیح اور مخارج کے مطابق حروف کی ادائیگی کرنے والا صحیح العقیدہ اہل السنت ہونا چاہیے۔

درمختار میں ہے:

الحق بالامامة الاعلم باحکام الصلوٰة بشرط اجتنابه الفواحش الظاهرة۔

یعنی امامت کا حق دار وہ ہے جو احکام صلوٰۃ سے واقف ہو اور گناہ سے پرہیز کرتا ہو ایسے امام کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں (خواہ تراویح ہو یا نماز فریضہ)، جو کہ حروف کی صحیح ادائیگی نہیں کرتا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ امام مسجد داڑھی قبضے سے کم رکھتا ہے بلکہ بعض دفعہ بہت چھانٹنے سے تھوڑی سی معلوم ہوتی ہے۔ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے یا ناجائز اور داڑھی منڈوانے کے لیے کیا حکم ہے۔

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالیٰ

داڑھی منڈوانا یا چھانٹنا ایسے طریقہ سے کہ قبضہ سے کم ہو جائے ناجائز، فسق اور گناہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جزوا الشوارب واعفوا اللحی

یعنی مونچھوں کو کتراؤ اور داڑھیوں کو بڑھاؤ۔ داڑھی رکھنی لازم اور واجب ہے اگر قبضہ سے کم ہو تو گناہ۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم عشر من الفطرة قص الشوارب واعفاء اللحیه۔

دس چیزیں فطرت (طریقہ) اسلام سے ہیں۔ ایک مونچھ کترنا دوسرا داڑھی کو بڑا کرنا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

حلق کردن لحیہ حرام است وروش افرنج وہنود وجوالقیان ست کہ ایشاں

را قلندریہ گوینڈ وگذاشتن آں بقدر قبضہ واجب است ۔ (لمعات شرح مشکوٰۃ)

داڑھی کا منڈوانا حرام ہے اور یہ طریقہ افرنگیوں (انگریزوں) اور ہندوؤں اور جوالقیوں کا ہے جن کو قلندریہ کہتے ہیں (ملنگ) اور اس کا ایک مشت رکھنا واجب ہے ۔ صورت مسئولہ میں جو امام داڑھی منڈواتا ہے یا اس کی چھانٹی کرواتا ہے وہ فعل حرام کا مرتکب ہے اور فاسق معلن ہے (اعلانیہ فسق کرنے والا) اور فاسق معلن کے پیچھے نماز حرام اور مکروہ تحریمہ ہے ایسے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیئے جو نمازیں پڑھی گئی ہیں ان کا اعادہ واجب اور ضروری ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ کیا سجدۂ تلاوت رکوع میں ادا ہو جاتا ہے ۔ جیسے کہ ایک حافظ صاحب نے نماز تراویح میں قرآن پاک تلاوت کرتے ہوئے رکوع میں سجدہ ادا کر لیا ہے ۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے سجدۂ تلاوت نہیں کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رکوع میں ہی نیت سجدۂ تلاوت کی ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سجدۂ تلاوت رکوع میں ادا ہو جاتا ہے ۔ اگر ہو جاتا ہے تو اس کی کیا دلیل ہے ۔ دلیل شرعی اور فقہی تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔

غلام محی الدین منگلا کالونی ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اگر سجدۂ تلاوت رکوع میں ادا کیا تو ادا ہو جائے گا ۔ علماء اصول فقہ لکھتے ہیں:

حاصلہ ان المصلی اذا قراء آیۃ السجدۃ بین الصلوٰۃ واراد ان یؤدی السجدۃ فی الرکوع بان نوی التداخل بین رکوع الصلوٰۃ وسجدۃ التلاوۃ کما ھو المعروف بین الحفاظ فیجوز قیاساً وجہ القیاس ان الرکوع والسجود متشابھان فی الخضوع ولذا اطلق اسم الرکوع علی السجود فی تلک الآیہ (وخر راکعاوا ناب) وذالک لان الخرور

وھو ان یقع علی الارض لا یتحقق فی حالۃ الرکوع بل فی حالۃ السجدۃ

فظھر ان المراد بالرکوع فی تلک الآیۃ ھو السجدۃ فلما ثبت ان الرکوع

والسجود متشابھان فی الخضوع والمقصود فی سجود التلاوۃ ھو

الخضوع فیجوز الرکوع قیاساً علی السجدۃ لاشتراک وصف الخضوع

بینھما - (نامی شرح حسامی ج۲ ص۲۷)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نمازی نے جب آیت سجدہ کی نماز کے درمیان تلاوت کی اور اس نے ارادہ کیا کہ سجدہ کو رکوع میں ادا کرے - بایں طور کہ نیت تداخل کی درمیان رکوع نماز اور سجدہ تلاوت کے (تداخل کا معنی یہ ہے کہ دونوں رکوع اور سجدہ رکوع کے اندر ادا ہو جائیں) جیسا کہ حفاظ کے درمیان مشہور ہے پس قیاس کے لحاظ سے جائز ہے۔

دلیل قیاس یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ خضوع (عاجزی) میں دونوں ہم مثل ہیں اس لیے رکوع کا اطلاق سجدہ پر اس آیت میں کیا ہے:

وخر راکعا واناب: (وہ گرے رکوع کرتے ہوے اور انہوں نے رجوع کیا) کیونکہ حالت رکوع میں خرور زمین پر واقع ہونے سے متحقق نہیں ہوتا بلکہ حالت سجدہ میں اس کا تحقق ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ آیت میں رکوع سے مراد سجدہ ہے پس جب یہ ثابت ہوا کہ خضوع میں رکوع اور سجدہ دونوں متشابہ ہیں اور سجدہ تلاوت میں مقصود خضوع ہے لہذا اطلاق رکوع کا سجدہ پر قیاس کے لحاظ سے ہوگا کیونکہ دونوں کے درمیان وصف (علتہ) خضوع مشترکہ ہے۔ یہاں تداخلی صورت کی بنا پر رکوع میں سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا۔ ابوحنیفہ نے یہاں قیاس پر عمل کیا ہے اور استحسان کو چھوڑا ہے کیونکہ استحسان میں یہ جائز نہیں ہے۔ علامہ حسام الدین محمد بن محمد بن عمر لکھتے ہیں:

لا یجزئیہ لان الشرع امرنا بالسجود والرکوع خلافہ کسجود

والصلوٰۃ ۔

اور استحسان میں یہ جائز نہیں کیونکہ شریعت نے ہمیں سجدہ کا حکم کیا ہے جس میں نہایت تعظیم ہے اور رکوع میں اس سے تعظیم کم ہے اسی وجہ سے رکوع سجدہ کے قائم مقام نہیں ہوتا کیونکہ نماز میں رکوع کی ایک علیحدہ حیثیت ہے اور سجدہ کی علیحدہ حیثیت۔ دونوں نماز میں انفرادی طور پر رکن ہیں۔ حنفیہ نے چونکہ یہاں قیاس پر عمل کیا ہے اور استحسان کو ترک کیا ہے۔ اس لیے حنفیہ کہتے ہیں کہ سجدہ تلاوت عبادہ مقصودہ نہیں ہے اگر کوئی شخص سجدہ تلاوت کی نذر مانتا ہے تو اس کا اس پر وجوب نہیں ہوگا۔ اگر سجدہ تلاوت عبادہ مقصودہ ہوتا تو نذر سے وجوب ہوجاتا۔ سجدہ تلاوت سے محض مقصد عاجزی ہے اور عاجزی کا تحقق رکوع میں بھی ہوجاتا ہے لہذا سجدہ تلاوت رکوع میں ادا ہوجائے گا چونکہ دونوں میں عاجزی ہے لہذا تداخلی صورت میں سجدہ ادا ہوجائے گا۔ یہاں پر ابوحنیفہ نے قیاس کو استحسان پر ترجیح دی ہے۔ یہ کم مقام میں ہوتا ہے۔ اکثر استحسان کو قیاس پر ترجیح ہوتی ہے۔

کتب فقہ میں بالخصوص ہدایہ میں اس کی اکثر مثالیں موجود ہیں۔ ابوحنیفہ کے نزدیک استحسان قیاس کی ہی ایک قسم ہے دلیل خامسہ نہیں ہے۔

استحسان کا معنی یہ ہے کہ قیاس جلی کے مقابلہ میں ایک خفی قیاس ہے۔ کبھی استحسان صورت نص (سنت) میں ہوتا ہے اور کبھی صورت اجماع میں اور کبھی صورت ضرورت میں ہوتا ہے یعنی اگر قیاس جلی کے مقابلہ میں نص یا اجماع یا ضرورت آجائے تو اس کو استحسان کہہ دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ استحسان پر ایسے ہی عمل کرتے ہیں جیسا کہ امام مالک مصالحہ مرسلہ پر عامل ہیں۔ مصالحہ مرسلہ کو استصلاح بھی کہتے ہیں اور مصالحہ مرسلہ کا مطلب وہ مصلحتیں ہیں جن کی شریعت سے نہ بطلان کی کوئی دلیل ملتی ہے اور نہ ہی باعتبار نص کے کوئی اعانت ملتی ہے۔ اس وقت موجب نزاع ہوسکتا ہے جبکہ وہ کسی دوسری دلیل سے ٹکرائے یا کسی نص اور قیاس کے مخالف ہو اور اس کی مثال چوری کا اقرار کرانے کے لیے کسی شخص کو سزا دینے کی ہے جس کے جواز کے امام مالک قائل ہیں لیکن دوسرے لوگ ان کی مخالفت

کرتے ہیں کیونکہ یہ ایسی مصلحت ہے کہ جس کی دوسری مصلحت معارض ہے اور وہ اس شخص کی مصلحت ہے جس کو مارا جائے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ بری ہو اور بری کو مارنا کب صحیح ہے گنہگار کو مارنا چاہیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح مال برآمد کرنا مشکل ہوگا تو اسی طرح ایک بری کو سزا دینے کا دروازہ کھل جائے گا اور اسی طرح مفقود الخبر کا مسئلہ ہے کہ جب اس کی موت و حیات کی خبر معلوم نہ ہو اور اس کا انتظار کیا گیا اور عورت نے شوہر کی علیحدگی سے نقصان اٹھایا۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک عورت کا حیض کئی سال سے بند ہے اور نکاح کے لیے اس کی عدت رُک گئی اور نکاح نہ کر سکی تو امام مالک نے ان دونوں صورتوں میں حضرت عمر فاروق کی رائے کو لیا کہ مفقود الخبر کی بیوی خبر نہ ملنے کے چار سال بعد نکاح کرلے اور دوسری عورت جس کا حیض بند ہے۔ مدت حمل گزرنے کے بعد تین ماہ عورت بیٹھے نو ماہ عدت حمل ہے اور تین ماہ یہ، عدت مجموعی ایک سال ہو جائے گی۔ پہلی صورت میں بیوی کی مصلحت کا خیال رکھا اور غائب شوہر کو نظر انداز کیا۔ اور دوسری صورت میں امام مالک نے زوجہ کی مصلحت کا خیال کیا۔ باوجودیکہ یہ اس نص صریح کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء مطلقہ۔

عورتیں ایام ماہواری تک انتظار کریں کیونکہ مہینوں سے تو تب عدت (جیساکہ امام مالک نے کہا) ہو۔ جبکہ وہ سن یاس کو پہنچے ابھی تو وہ سن یاس کو پہنچی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مصلحت مرسلہ ایسی مصلحت ہے جو مقصود شرعی کی حفاظت کی طرف رجوع کرتی ہے جس کا مقصود شرعی ہونا کتاب اللہ، سنّت یا اجماع سے معلوم ہو لیکن کوئی اصل معین اس اعتبار کی شہادت نہ دے اور اس کا مقصود شرعی ہونا کسی ایک دلیل سے نہیں ہوتا بلکہ جملہ ادلہ و احوال کے قرینوں اور متفرق علامتوں سے معلوم ہو۔ اسی لیے اس کا نام مصلحت مرسلہ رکھا گیا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے صورت مستفسرہ میں قیاس پر عمل کیا ہے اور کہا کہ سجدہ تلاوت

رکوع میں ادا ہو جائے گا اور استحسان کو چھوڑ دیا ہے۔ اگر حافظ صاحب نے سجدہ تلاوت کی نیت رکوع میں ادا کرنے کے لیے کی ہے تو صحیح ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ٹیپ ریکارڈ سے آیت سجدہ سنی گئی ہے کیا اس پر بھی سننے کے بعد سجدہ تلاوت نکالنا لازم ہے یا نہیں؟

محمد شفیق سرائے عالمگیر

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے۔ فتاویٰ نظامیہ میں ہے:

گراموفون اور صدائے کوہ یا پرند وغیرہ غیر ذوی العقول سے اگر آیت سجدہ سنی جائے تو سجدہ لازم نہیں ہوتا۔

ولا یجب اذا سمعها من طیر هو المختار وان سمعها من الصدی لا یجب علیه۔

لہٰذا اگر ٹیپ ریکارڈ سے آیت سجدہ سنی گئی ہے تو سجدہ واجب نہیں ہو گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک امام صاحب جن کی عمر اسی سال کے قریب ہے اور اب بڑھاپے کی وجہ سے کانوں سے بہرے اور نابینے ہیں اور دماغی توازن بھی بعض دفعہ صحیح نہیں رہتا۔ نہ لقمہ سن سکتے ہیں اور نہ لے سکتے ہیں اور دیگر ان کا تمام خاندان بیوی بچے شیعہ ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔ بینوا وتوجروا۔

میاں محمد حسن دھنیالہ ضلع جہلم

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں امام مذکور کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی اور حرام ہے جبکہ اس کا تمام خاندان شیعہ اور بیوی بھی شیعہ اور وہ بھی ان کے ساتھ رہتا ہے تو یہ بھی شیعہ رافضی بے دین منافق ہے اس کے پیچھے اہل السنّت والجماعت کی نماز ہرگز ہرگز جائز نہیں ۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے :
جو رافضیوں میں رافضی اور سنیوں میں سُنّی بنتا ہے جب تو ظاہر ہے کہ وہ رافضی بھی ہے اور منافق بھی اور اس کے پیچھے نماز باطل محض ہے جیسا کہ کسی یہودی نصرانی کے پیچھے ۔

کمابینا فی النھی الاکید ۔

ایسے کو امامت سے معذول کرنا لازم اور ضروری ہے اور شریعت مطہرہ کا قاعدہ ہے :

اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام ۔

جب ایک چیز میں حلّت اور حرمت دونوں جمع ہو جائیں تو غلبہ حرمت کو ہوگا اور وہ شئی حرام سمجھی جائے گی ۔ یہ سنی ہو تو امامت حلال اور رافضی ہو تو امامت حرام ۔ جب دونوں جمع ہوں تو غلبہ حرمت کو ہوگا یعنی امام مذکور کی امامت حرام ہوگی ۔ امام مذکور کے پیچھے نماز نہ ہونے کی بھی علّت شیعہ ہونا کافی ہے ۔ اس کے علاوہ سوال میں دیگر سبب بھی تمام باعث کراہت تحریمہ ہیں اور تمام کے اجتماع سے شدید حرمت ہوگی ۔ ایسے امام کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں ۔ جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی گئی ہیں ان کا اعادہ لازم ہے ۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں :

کل صلوٰۃ ادیت مع الکراھۃ التحریمۃ واجبت اعادۃ ۔

جو نماز بحالت کراہت ادا کی گئی ہو تو اس کا لوٹانا فرض اور لازم ہے ۔ لہٰذا امام مذکور کے پیچھے جو نمازیں پڑھی گئی ہیں ان کا اعادہ ضروری ہے ۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ودرج ذیل صورتِ مسئلہ میں کہ ایک امام مسجد کا عقیدہ حضرت

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ہے کہ آپ ابتداء میں راہِ راست پر تھے اور پھر گمراہ ہو گئے۔ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جائز ہے یا ناجائز۔ کیا یہ عقیدہ اہل السنّت کے عقائد سے ہے؟ کیا ایسے عقیدہ کے حامل کو اہل السنّت کہہ سکتے ہیں؟ جواب مفصل معہ حوالہ کتب سے نوازیں۔

الحقیر محمد عبداللہ ٹیچر فیڈرل گورنمنٹ بوائز ہائی سکول اوکاڑہ کینٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں جس امام کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے راہ راست پر تھے اور پھر گمراہ ہو گئے۔ ایسا امام شیعہ ہے اہل السنّت سے خارج ہے۔ ایسے امام کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں۔ حضرت امیر معاویہ صحابی رسول تھے اور کاتب وحی تھے[1] اور آپ کی ہمشیرہ حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نکاح میں تھیں۔ (ترجمہ المقبول)

حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ص۲۰۷ میں لکھتے ہیں:

معاویہ بن ابو سفیان صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف الاموی اسلم یوم الفتح و قیل قبل ذالک قال ابن اسحاق کان معاویۃ امیرا عشرین سنتہ و قیل مات سنتہ ستین فی رجب و قیل ابن ست وثمانین۔

حضرت معاویہ نے فتح مکّہ یا اس سے قبل اسلام قبول فرمایا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ بیس سال آپ کی امارت رہی اور ۶۰ھ میں فوت ہوئے اور آپ کی عمر ۸۶ چھیاسی سال تھی۔

قد صرح علماء الحدیث بان معاویۃ رضی اللہ عنہ من کبار الصحابۃ ونجبائھم ومجتھدیھم۔ (نبراس شرح شرح عقائد)

---

[1] حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہ کاتب وحی تھے۔ (تقریب التہذیب ص۳۵۷)

علمائے حدیث نے تصریح کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بزرگ و شرفاء اور مجتہدین صحابہ سے تھے۔ حدیث میں ہے:

اللهم اجعله هاديا ومهديا (رواه الترمذی)

بخاری شریف میں ہے:

فانه فقيه صحب رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کہ معاویہ فقیہ اور صحابی رسول تھے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک سے سوال کیا گیا کہ معاویہ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیز۔ تو آپ نے جواباً کہا:

معاویہ کے گھوڑے کی غبار بھی عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ قاضی عیاض مالکی نے شفاء شریف میں فرمایا کہ امام مالک فرماتے ہیں:

جو آدمی کسی صحابی کو ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ یا عمرو بن عاص کو سب (گالی گلوچ) کرے اگر یہ شخص ان کو کافر اور گمراہ سمجھتا ہے تو یہ آدمی واجب القتل ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہدایت یافتہ اور ہادی ہیں جو ان کو گمراہ سمجھتا ہے وہ خود گمراہ بے دین مرتد شیعہ رافضی ہے۔ ایسے آدمی کو ہرگز امام نہیں بنانا چاہیئے اور نہ ہی اس کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیئے اور جو نمازیں اس کے پیچھے پڑھی گئی ہیں ان کا اعادہ لازم اور ضروری ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

از روئے شرع شریف کسی مسجد کے مقررہ امام کے لیے شرعی داڑھی کا ہونا کس حد تک لازمی اور ضروری ہے۔ اس زمانہ میں پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں بیشمار مقررہ امام ہیں جن کی نہایت تراشی ہوئی خشخشی داڑھی ہوتی ہے۔ بعض عالموں کا کہنا ہے کہ مختصر داڑھی والے امام کے پیچھے نماز ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مقدس ہے:

"ہر اچھے اور برے کے پیچھے نماز پڑھو" اس فرمان کے مطابق اگر کسی مختصر

داڑھی والے شخص نے نمازیوں کے اصرار پر نماز پڑھادی تو نماز ہو گئی یا واجب الاعادہ ہی رہی ۔ ایسی ہی صورت میں ایک امام صاحب نے کہا کہ غیر شرعی داڑھی والے پیچھے نماز حرام ہے ، ہوتی ہی نہیں ۔

مستفتی زاہد حسن فریدی ۔ چکوال ۔

۲۹ دسمبر ۶۹ء

الجواب بعونہٖ تعالٰی

داڑھی منڈوانا یا چھانٹنا ایسے طریقے سے کہ قبضہ سے کم ہو جائے ناجائز و فسق اور گناہ ہے ۔ حدیث شریف میں ہے :

جزوا الشارب واعفوا اللحی ۔

یعنی مونچھوں کو کتراؤ اور داڑھیوں کو بڑھاؤ ۔ داڑھی رکھنی لازم اور واجب ہے ۔ اگر قبضہ سے کم ہو تو گناہ ۔ حدیث میں ہے

عشرۃ من الفطرۃ قص الشوارب واعفاء اللحیہ

دس چیزیں اسلام سے ہیں ۔ ایک مونچھ کتروانا اور دوسرا داڑھی بڑھانا اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں و

حلق کردن لحیہ حرام است وگذاشتن آں بقدر قبضہ واجب است ۔

داڑھی کا منڈوانا حرام ہے اور اس کا ایک مشت رکھنا واجب ہے ۔ اس مسئلہ کو ہم نے اپنی کتاب '' صاعقۃ الوہاب علی مستحل الکلاب '' میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ صورت مسئولہ میں جو امام داڑھی منڈواتا ہے یا چھانٹی اور خشخشی داڑھی کراتا ہے وہ فعل حرام کا مرتکب ہے اور فاسق معلن ہے اور اعلانیہ فسق کرنے والے کے پیچھے نماز حرام اور مکروہ تحریمہ ہے ۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ اسی مسئلہ کے تحت لکھتے ہیں کہ ایسے کو امام کرنا گناہ اور اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے ۔ غنیہ میں ہے ،

لو قدموا فاسقا یاثمون ۔

جو سوال میں لکھا گیا ہے کہ حدیث میں ہے: "ہر اچھے اور برے کے پیچھے نماز پڑھو" اس کا یہ معنی نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے کہ ہر آدمی کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر حکام سے کوئی امامت کرائے تو اس کے پیچھے نماز پڑھ لو۔ اگر ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی گئی تو انتشار اور فتنہ کا باعث بنے گا کیونکہ زمانہ خلافت میں سلاطین اور بادشاہ خود امامت کراتے اور حضور علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ان میں فساق بھی ہوں گے اور فجار بھی کہ ستکون علیکم امراء یوخرون الصلوٰۃ عن وقتھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اہل اصلاح کے قلوب ان کی اقتداء سے نفرت کریں گے اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان سے اختلاف آتش فتنہ کو مشتعل کرنے والا ہوگا اور دفع فتنہ دفع اقتداء فاسق سے اہم واعظم تھا۔ قال اللہ تعالیٰ:

والفتنۃ اکبر من القتل

لہٰذا دروازہ فتنہ کے انسداد کے لیے ارشاد ہوا:

صلوا خلف کل بر و فاجر۔ یہ اس بات سے ہے: من ابتلی ببلیتین اختار اھونھما اور فقہا کا قول تجوز الصلوٰۃ خلف کل بر و فاجر اسی معنی پر ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکام سے اگر کوئی جماعت کرائے تو اس کے پیچھے نماز پڑھ لو ورنہ قرآن پاک میں ہے:

ام نجعل المتقین کالفجار ۔

کیا فجار متقیوں کی طرح ہو سکتے ہیں (ہرگز نہیں) صورت مستفسرہ میں جن اماموں کے متعلق سوال کیا گیا ہے نہ وہ امراء اور حکام سے ہیں کہ ان سے اختلاف پیدا ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا وہ اس حدیث کے مصداق ہی نہیں۔ ان اماموں کے پیچھے نماز مکروہ تحریمہ واجب الاعادہ ہی ہے اور حدیث میں جو لفظ کل ہے اس کی تعمیم حکام کے لیے ہے۔ جن اماموں کے متعلق سوال میں ذکر کیا گیا ہے ان کی اقتداء ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔

واللہ ورسولہ اَعْلَمُ بِالصَّواب۔

الاستفتاء

اگر غیبت کا گناہ امام مسجد کے خلاف ثابت ہو جائے تو ایسے امام کے متعلق کیا حکم ہے اور اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔ غیبت کی کیا تعریف ہے۔ غیبت کا گناہ ثابت ہو جانے کی صورت میں شرعی سزا کیا ہو سکتی ہے۔

عبدالعزیز تحصیل دار۔ میرپور آزاد کشمیر۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

کسی کے پس پشت ایسی بات کہنی جو اسے ناگوار ہو اسے غیبت کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ غیبت کیا چیز ہے۔

حضور علیہ السّلام نے فرمایا کسی کی پس پشت ایسی بات کرنی جو اسے ناگوار ہو۔

سائل نے پوچھا اگر اس میں واقعتہً موجود ہو جو بات کہی گئی ہے تو حضور علیہ السّلام نے فرمایا۔ جب ہی تو غیبت ہے۔ اگر اس میں واقعتہً موجود نہ ہو تب تو بہتان ہے اور نمیمہ (چغل خوری) میں مقصود فساد کرانا ہوتا ہے۔ غیبت اور نمیمہ میں یہی فرق ہے کہ غیبت میں فساد اور شرارت آگے مقصود نہیں ہوتی اور نمیمہ میں گویا تعدیہ اور آگے فساد کرانا مقصود ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے غیبت کو اپنے بھائی کا مردار گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری المتوفی ۷۴ھ سے مرفوعاً روایت ہے:

الغیبۃ اشد من الزنا۔ (رواہ البیھقی)۔ نبراس ص۳۴۸۔

غیبت گناہ کبیرہ ہے اس کا مرتکب فاسق معلن ہے۔ شرعاً اس پر توبہ علی الاعلان واجب ہے۔ (امام غیبت کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ توبہ کرے۔ ایسے امام کے پیچھے جو نماز پڑھی گئی ہے اس کا اعادہ لازم اور ضروری ہے۔ اگر توبہ کرے اور اس پر ندامت کا اظہار کرے تو پھر اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے ورنہ نہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

باب الجماعۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص رمضان شریف میں عشاء کی جماعت کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ فرض اس نے علیحدہ پڑھے ہیں اب وہ وتر امام کے ساتھ پڑھے یا وتر بھی علیحدہ پڑھے۔

ایک سائل۔ جہلم

الجواب بعونہ تعالیٰ

جو شخص امام کے ساتھ فرض ادا نہیں کرتا اس کو وتر بھی علیحدہ پڑھنے چاہئیں۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر۔

یعنی جب امام کے ساتھ فرض نہیں پڑھے تو وتر بھی امام کے ساتھ نہ پڑھے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک امام مسجد نے نماز پڑھاتے وقت ایک رکعت میں سورت الم ترکیف فعل پڑھی۔ پھر دوسری رکعت میں ارایت الذی پڑھی۔ یعنی ایک سورت درمیان میں چھوڑ دی۔ ایک مرتبہ اسی امام نے پہلے سورت قریش پڑھی پھر سورۃ الم ترکیف پڑھی۔ مقتدیوں نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں اور شور مچا دیا۔ اس کا شرعی حکم بیان کیا جائے۔

سائلیں
فیصل آباد

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اس طرح پڑھنا مکروہ ہے بلکہ آیات اور سورتوں کو ترتیب سے پڑھنا چاہیئے فتاویٰ نظامیہ صفحہ ۲۵ میں ہے : نماز میں خلاف ترتیب آیتیں پڑھنی یعنی بعد والی سورت کو پہلے اور پہلی سورت کو بعد میں پڑھنا اور اسی طرح کسی آیت کو آگے پیچھے پڑھنا یا ایک ہی رکعت میں دو ایسی آیتوں کو جمع کرنا جن کے درمیان ایک آیت یا کئی آیتیں رہ گئی ہوں یا دو رکعتوں میں ایسا عمل کرنا مکروہ ہے فتاویٰ عالمگیریہ ص۸۷ میں ہے :

واذا قرأ فی رکعة سورة وفی الرکعة الاخری او فی تلك الرکعة سورة فوق تلك السورة یکره وکذا اذا قرأ فی رکعة آیة ثم قرأ فی الرکعة الاخری او فی تلك الرکعة آیة اخری فوق تلك الآیة واذا جمع بین ایتین بینهما ایات او ایته واحدة فی رکعة واحدة او فی رکعتین فهو علی ما ذکرنا فی السور کذا فی المحیط ـ

لیکن یہ کراہت صرف فرض نماز میں ہے. سنت یا نوافل میں اگر ایسا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ اسی مقام پر ہے :

هذا کله فی الفرائض واما فی السنن فلا یکره هکذا فی المحیط ـ

بہر کیف اگر سورتوں کو بلا ترتیب پڑھا یا درمیان سے ایک سورت کو چھوڑ کر دونوں کو ملا دیا تو یہ مکروہ ہے ۔ ایسا ہر گز عمداً نہیں کرنا چاہیئے مقتدیوں نے صحیح کہا ہے کہ ایسا عمل ٹھیک نہیں ہے

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ـ

باب الجمعہ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جب پاکستان میں احکام شرعیہ کے نفاذ کا حکم ہو چکا ہے اور بعض حدود جاری بھی ہو چکی ہیں تو کیا پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ پڑھنا فرض ہوگیا ہے اور جن گاؤں میں جمعہ پڑھا جاتا ہے ان گاؤں میں اب فرض کی نیت سے پڑھا جائے یا نہ اور علمائے احناف کے نزدیک گاؤں میں جمعہ کسی صورت میں بھی فرض کی نیت سے پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ نیز چھوٹے بڑے شہروں میں جمعہ اب بہ نیت فرض پڑھا جائے یا نہ۔ کتب فقہ کے حوالہ جات سے تحریر فرما کر فلاح دارین حاصل کریں۔

المستفتی: سید نذیر حسین شاہ نمبردار چک نمبر ۲ جنوبی ضلع سرگودھا۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نماز جمعہ فرض ہے جس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اس کے بارہ شرائط ہیں جن میں سے ایک شرط مصر (شہر) ہے۔ علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل فرغانی (صاحب ہدایہ جو کہ اصحاب ترجیح سے ہیں اور فقہاء کرام کے طبقات سبعہ سے پانچویں طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں) تحریر فرماتے ہیں:

لا تصح الجمعة الا فی مصر جامع او فی مصلی المصر و لا تجوز فی القری لقوله علیه السلام لا جمعة و لا تشریق و لا فطر و لا اضحیٰ الا فی مصر جامع۔

جمعہ نہیں ہوتا مگر شہر یا شہر کی عید گاہ میں اور گاؤں میں جائز نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جمعہ اور عیدین کی تکبیریں اور نماز عیدین شہر کے سوا جائز نہیں۔

شیخ ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں :

ان قوله تعالیٰ فاسعوا الی ذکر الله لیس علی اطلاقه اتفاقا بین الایمة اذلا یجوز إقامتها فی البراری اجماعاً ولا فی قریة عند الشافعی فکان خصوص المکان مراداً بالاجماع فقدر الشافعی قریة الخاصة وقدرنا المصر وهو اولی لحدیث علی رضی الله عنه وهو لو عورض بفعل غیره کان علی مقدما علیه فکیف ولم یتحقق معارضة ماذکرنا ایاه ولهذا لم ینقل عن الصحابة انهم لما فتحوا البلاد اشتغلوا بنصب المنابر والجمعة فی الامصار دون القری۔

اللہ تعالیٰ کا قول فاسعوا الی ذکر اللہ اپنے اطلاق پر نہیں کیونکہ تمام ایمہ بالاتفاق جنگلوں اور شافعی عام بستیوں میں جمعہ کے قیام کے قائل نہیں ہیں بلکہ مکان کی تخصیص کرتے ہیں۔ شافعی قریہ مخصوصہ مراد لیتے ہیں۔ ہمارے حنفیہ کے نزدیک شہر ہے اور شہر مراد لینا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ حدیث علی رضی اللہ عنہ موجود ہے اور اگر کسی دوسرے کے فعل کے ساتھ معارضہ کیا جائے تو پھر حضرت علی ہی مقدم ہیں۔ پس یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ابھی تک معارضہ ثابت نہیں ہوا اور اسی لیے صحابہ سے منقول نہیں ہوا کہ جبھی انہوں نے شہر فتح کئے، منابر اور جمعہ کے تقرر کے لیے مشغول ہوئے انہوں نے شہروں میں جمعے قائم کیئے گاؤں میں نہیں۔

صاحب ہدایہ اور ابن ہمام کی کلام سے معلوم ہوا کہ جمعہ شہر میں ہوتا ہے۔ گاؤں میں حنفیہ کے نزدیک جمعہ جائز نہیں ہے۔ پاکستان میں اگرچہ بعض احکام شرعیہ کا نفاذ ہو چکا ہے لیکن احکام شرعیہ کے نفاذ سے جمعہ شہروں میں فرض ہوگا اور شہروں میں فرض کی نیت سے پڑھا جائے گا کیونکہ جمعہ فرض ہے اور فرضیت بھی نص قطعی سے ثابت ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں؛ گاؤں میں جمعہ فرض ہی نہیں ہے۔ احکام شرعیہ کے نفاذ سے گاؤں متاثر نہیں ہوں گے کہ گاؤں میں بھی جمعہ فرض سمجھا جائے بلکہ گاؤں میں

جمعہ فرض نہیں ہو گا۔

فتاوٰی رضویہ میں ہی لکھتے ہیں کہ مذہب حنفی میں فرضیت جمعہ وصحت جمعہ و جواز جمعہ سب کے لیے مصر مشروط ہے۔ دیہات میں نہ جمعہ فرض نہ اس کی ادا جائز نہ صحیح۔ اگر پڑھیں گے تو ایک نفل نماز ہو گی۔ ظہر کا فرض سر سے نہ اترے گا کیونکہ جمعہ گاؤں والوں پر واجب ہی نہیں ہے بلکہ جمعہ کے لیے شہر ہونا شرط لازم ہے اور شہر وہ آبادی ہے جس میں متعدد کوچے ہوں، دوامی بازار ہوں یا وہ پرگنہ ہو کہ اس کے متعلق دیہات گنے جاتے ہوں اور اس میں کوئی حاکم مقدمات رعایا فیصلہ کرنے پر مقرر ہو، جس کی حشمت و شوکت اس قابل ہو کہ مظلوم کا انصاف ظالم سے لے سکے جہاں یہ تعریف صادق آئے وہ شہر ہے۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ شہر کی تعریف یہی صحیح اور ظاہر روایت کے مطابق ہے۔ پانچ کتابوں (مبسوط، جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات، سیر صغیر و کبیر) کی روایات کو ظاہر روایت کہا جاتا ہے اور مبسوط اصل میں قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے اور امام محمد[1] نے اس کی تشریحات لکھی ہیں۔ دیگر کتب اربعہ امام محمد کی تصنیف ہیں جن میں سیر کبیر ساٹھ جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ جامع کبیر کے بعد جو فروع یاد آئے ان کو زیادات کی شکل میں پیش کیا۔ فقہ حنفی کا مدار ان کتب خمسہ پر ہے جن میں ابو حنیفہ کے مسائل روایۃً مذکور ہیں۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت نے مصر کی تعریف وہ کی ہے جو کہ ظاہر الروایت کے مطابق ہے جہاں جمعہ کے جواز کا ہونا ہے۔ اسی کو صاحب ہدایہ نے ترجیح دی ہے اور اسی کو صاحب درمختار جو کہ طبقہ ستہ (چھٹا) سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ روایت کے قوی ہونے اور ضعیف اور ظاہر روایت اور نادر روایت ہونے کو بیان کرتے ہیں لہٰذا جمعہ شہر میں ہو گا۔ دیہات گاؤں اور بستیوں میں نہ فرض ہے نہ جمعہ کی ادائیگی ہو گی بعد میں نماز ظہر گاؤں میں پڑھی جائے گی۔ گاؤں میں جس جگہ جمعہ نہیں ہوتا وہاں جمعہ شروع نہ

---

[1] اسی وجہ سے امام محمد کی تصنیفات میں بھی مبسوط کو شمار کیا گیا ہے۔ ۱۲۔

کیا جائے اور جہاں شروع ہو چکا ہے اس کو منع نہ کیا جائے۔

فتاوٰی رضویہ ص ۷۱۹ میں ہے، اگر عوام پڑھتے ہوں تو ان کو منع کرنے کی ضرورت نہیں کہ عوام جس طرح اللہ اور رسول کا نام لیں غنیمت ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ عوام بعد میں نماز ظہر پڑھیں۔ جمعہ فرض ہے لیکن دیہات اور بستیوں میں جمعہ فرض نہیں ہے بلکہ ادائیگی جمعہ سے جمعہ نہیں ہوگا۔ گاؤں میں جب واجب ہی نہیں تو فرض کی نیت کا کیا مطلب بلکہ گاؤں میں بنیادی طور پر نماز ظہر ہی پڑھی جائے گی۔ اگر کسی گاؤں میں جمعہ شروع ہے تو وہاں جمعہ کے بعد نماز ظہر پڑھی جائیگی کیونکہ مذہب حنفیہ کے مطابق جمعہ گاؤں میں فرض نہیں ہے اور نہ ہی جمعہ کی ادائیگی کے ساتھ نماز ظہر معاف ہو جائے گی بلکہ گاؤں میں نماز ظہر لازم ہے۔ اگر گاؤں میں جمعہ پڑھا گیا تو بعد از نماز جمعہ نماز ظہر پڑھی جائے گی۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

جناب مفتی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

پہلے ہم آپ کے حکم کے مطابق جمعۃ المبارک کی نماز کی چار سنتیں اور دو فرضوں کے بعد نماز ظہر پوری ادا کرتے ہیں۔ اب آپ کی خدمت میں گذارش ہے کہ جمعۃ المبارک کے دن اسی طرح نماز ادا کریں یا کوئی اور طریقہ ہے۔

صوفی غلام حسین نقشبندی (دوکاندار)

غلہ منڈی روڈ لیاقت پور ضلع رحیم یار خان

الجواب بعونہ تعالیٰ

جمعہ فرض ہے لیکن اس کی شرائط ہیں، اگر وہ تمام شرائط نہ پائی جائیں تو پھر جمعہ کے بعد نماز ظہر ادا کرنی لازم ہے۔ جمعہ کی شرطوں میں شہر ہونے کے علاوہ اسلامی قانون کا نفاذ اور اجراء

بھی ہے۔ چونکہ ابھی تک پاکستان میں مکمل اسلامی قانون کا نفاذ نہیں ہوا صرف حکومت وعدہ اور مواعید کر رہی ہے، عملی طور پر کوئی اقدام نہیں کیا۔ لہٰذا نماز جمعہ کے بعد احتیاطاً ظہر بھی ادا کی جائے۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں:

کل موضع وقع الشك فی جواز الجمعة لوقوع الشك فی مصره او غیره واقام اهله الجمعة ینبغی ان یصلوا بعد اربع رکعات وینووا بها الظهر حتی لو لم تقع الجمعة موقعها یخرج عن عهدة فرض الوقت بیقین۔

یعنی جس جگہ بھی جمعہ کے شرائط متحقق نہ ہونے کی وجہ سے جمعہ کے جواز میں شک ہو اور وہاں کے لوگوں نے جمعہ شروع کر رکھا ہو، لائق ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت نماز پڑھیں اور ظہر کی نیت کریں۔ اگر جمعہ نہ ہوا تو یہ چار فرض جمعہ کے قائم مقام ہو جائیں گے اور وقتی فرض یقیناً ادا ہو جائے گا اور ان چاروں رکعتوں میں قرأت پڑھی جائے گی

فتاویٰ رضویہ میں ہے:

ینبغی ان یقرأ الفاتحة والسورة فی الاربع التی تصلی بعد الجمعة فی دیارنا کذا فی التاتارخانیة۔

چار رکعتوں میں فاتحہ اور سورت پڑھی جائے۔ جب پاکستان میں عملی طور پر اسلامی قانون کا نفاذ ہو جائے گا تو پھر گاؤں میں جہاں جمعہ ہوتا ہے وہاں صرف احتیاط الظہر پڑھی جائے، شہروں میں صرف نماز جمعہ پڑھی جائے گی احتیاط الظہر کی ضرورت نہ رہے گی لیکن جو حکومت برسر اقتدار آتی ہے وہ صرف اپنے اقتدار اور کرسی کے تحفظ کے لیے اعلان یہی کرتی ہے کہ اب پاکستان میں قرآن اور سنت کی حکومت ہو گی اور اسلامی قوانین کا نفاذ کر دیا جائے گا عملی طور پر کسی قسم کی پیش رفت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب تک کوئی حکومت عملی طور پر قوانین اسلامیہ کا نفاذ نہیں کرتی اس وقت تک تمام جمعہ کی شرطیں متحقق نہیں ہو سکیں۔ احتیاطاً نماز

جمعہ کے بعد چار رکعتیں فرض پڑھتے رہنا چاہیئے ۔یہی تحقیقی اور مفتی بہ قول ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔۱۲

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نمازی کے پاس بلند آواز سے ذکر کرنا جس سے خلل اندازی نماز ہو۔ جائز ہے یا نہیں ؟ بینوا و توجروا

المستفتی : سید مزمل حسین شاہ خطیب گجرات۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جہاں تک ذکر کے مسئلہ کا تعلق ہے وہ تو جائز ہے ۔ ذکر ، ذکر خفی ، ذکر جہر ، ذکر متوسط یہ تمام ہی جائز ہیں لیکن خلل اندازی نماز ہرگز جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ نظامیہ ج ۱ صفحہ ۳۳ میں ہے :

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک امام بعد از نماز فرض کے اپنے تمام مقتدیوں کو مسجد میں ذکر لا الٰہ الا اللہ پکار کر کہنے کے لیے حکم کرتا ہے جس سے مسجد میں شور و غل رہتا ہے اور دوسرے نمازیوں کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے ۔کیا شرعاً یہ فعل درست ہے ؟

الجواب :

مسجد میں اس طرح پکار کر ذکر کرنا جس سے دوسرے نمازیوں کی نماز اور قرأت میں خلل آئے شرعاً مکروہ ہے ۔

ویکرہ رفع صوت بذکر

ردالمحتار ج ۱ ص ۴۶۳ میں ہے :

اجمع العلماء سلفا و خلفا علی استحباب ذکر الجماعت فی المساجد و غیرھا الا ان یشوش جھرھم علی نائم او مصلی او قاری انتھیٰ۔

فتاویٰ نظامیہ جو کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا معتمد علیہ فتاویٰ ہے اس سے معلوم ہوا کہ

مخل انداز ی نماز کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ بھی منع ہے ۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ (بعد از نماز) امرِ مستحسن ہے ۔ بشرطیکہ خلل اندازیِ نماز نہ ہو ۔

(فتاویٰ افریقہ صـ۴۸) علامہ محمد امین بن عمر الشامی الحنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ بھی لکھتے ہیں:

اجمع العلماء سلفاء وخلفا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرھا الا ان یشوش جھرھم علی نائم او مصل او قاریٔ ۔

علماء سلف اور خلف نے مساجد وغیرہا میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے مستحب ہونے پر متفق ہیں مگر یہ کہ ان کے ذکر بالجہر سے کسی سونے والے یا کسی نمازی یا کسی تلاوت کرنے والے کو تشویش ہوتی ہو ۔ علامہ شامی کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خلل اندازیِ نماز جائز نہیں ہے ۔

رئیس الحنفیہ حضرت ملا علی القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ مرقاۃ ج صـ۲۲۳ پر لکھتے ہیں :

نعم جوز التدریس فی المسجد والبحث فیہ حیث لم یشوش علی المصلین او لم یکن ھناك المصلون

کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے مسجد میں تدریس اور علمی بحث کی اجازت دی ہے جبکہ اس سے نمازیوں کو تشویش نہ ہو یا مسجد میں کوئی نمازی نہ ہو ۔

ملا علی قاری نے بھی خلل اندازی نماز کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا کہ خلل اندازیِ نماز نہیں ہونی چاہیئے اور جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد علماء کرام درس قرآن وغیرہ شروع کر دیتے ہیں اور لوگ بھی نماز ادا کرتے رہتے ہیں ۔ اگر خلل اندازیِ نماز ناجائز ہو تو علماء درس قرآن کیوں شروع کر دیتے ۔ تو اس کا جواب ملا علی قاری نے دے دیا کہ تدریس اور درس قرآن اور علمی بحث اس وقت شروع کی جائے جبکہ نمازیوں کو تشویش نہ ہو ۔ اگر نمازیوں کو تشویش ہو تو پھر تدریس اور علمی بحث شروع نہیں ہونی چاہیئے ۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ جہاں لوگ نماز نفل ادا کر رہے ہوں

ان کے پاس بلند آواز سے قرآن نہ پڑھا جائے تاکہ ان کی نماز میں خرابی واقع نہ ہو۔ (فتاویٰ رضویہ ہے ۲۱)

ثابت ہوا کہ خلل اندازی نماز تمام فقہاء کرام کے نزدیک منع ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو امر عند الشرع ثابت ہو مثلاً تکبیرات تشریق ان کے ساتھ خلل اندازی نماز جائز ہے۔ حالانکہ ان کا یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ قرآن پاک کا پڑھنا عند الشرع ثابت ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی خلل اندازی نماز ناجائز ہے۔ جیسا کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے فتاویٰ رضویہ میں بیان کیا ہے اور کلمہ طیبہ بھی عند الشرع ثابت ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی خلل اندازی نماز منع ہے جیسا کہ صاحب فتاویٰ نظامیہ نے ذکر کیا ہے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے "فتاویٰ افریقہ" میں صریحہ جزئیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کلمہ طیبہ کے ساتھ خلل اندازی نماز نہیں ہونی چاہیئے۔ تکبیرات تشریق کو خلل اندازی نماز کے جواز کے لیے بطور استدلال پیش کرنا بھی غلط ہے کیونکہ تکبیرات تشریق تو ان مواضع مخصوصہ سے ہیں جہاں امام ابو حنیفہ سے جواز نص موجود ہے اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے تکبیرات تشریق کے لیے چند شرائط مقرر کی ہیں کہ فرضی نماز ہو، مقیم ہو، شہر میں ہو، جماعت مستحبہ ہو، صرف عورتوں کی جماعت نہ ہو کہ وہ مکروہ ہے چنانچہ امام علی بن ابی بکر المتوفی ۵۹۳ھ اپنی عظیم تصنیف ہدایہ ج ۱ ص ۱۵۵ میں لکھتے ہیں:

ولان الجهر بالتكبير خلاف السنة والشرع ورد به عند استجماع هذه الشرائط۔

اور اس لیے کہ بلند آواز سے تکبیر کہنا خلاف سنت ہے اور شریعت کا حکم وہاں ہے جہاں یہ شرطیں جمع ہوں۔

اور ملا علی قاری فرماتے ہیں:

ولابی حنيفة ان الجهر بالتكبير خلاف الاصل والنص الوارد فيه اجتمع هذه الامور فتراعى

اور امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ بلند آواز سے تکبیر کہنا خلاف اصل ہے اور جو

نص اس میں وارد ہوئی ہوئی ہے اس میں تمام امور موجودہ کی رعایت رکھی جائے گی۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیرات تشریق بلند آواز سے کہنا واجب ہیں لیکن مواضع مخصوصہ سے ہیں اور مخصوص احکامات حقیقت میں مستثنیٰ ہوا کرتے ہیں۔ جب یہ تکبیرات تشریق بنیادی طور پر اصل مسئلہ (خلل اندازی نماز) سے مستثنیٰ اور مخصوص ہیں تو ان کو اصل مسئلہ کے ثبوت کے لیے دلیل پیش کرنا علمی بصیرت کے خلاف ہے۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے کہیں بھی نہیں لکھا کہ تکبیرات تشریق کے ساتھ خلل اندازی نماز جائز ہے کیونکہ یہ تکبیرات مخصوص احکامات سے ہیں اور یہ تکبیرات مشروط بالشرائط ہیں البتہ کلمہ طیبہ کے ساتھ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے لکھا ہے کہ:

خلل اندازی نماز نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر نمازی وغیرہ نہ ہوں تو پھر کلمہ طیبہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر جائز ہے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی تکبیرات تشریق کو موانع مخصوصہ سے شمار کیا ہے:

وقیل ذالك فی ایام التشریق بمنی وھذا اوفق لمذھب الحنفیہ فی کراھتھم الجھر بالذکر فیما عداما وردبه ولھذا لایوجبون قضاء تکبیرات العید والتشریق۔ (حواشی مشکوٰۃ ص۸۸)

اور بعض نے کہا کہ تکبیر سے مراد منیٰ میں ایام تشریق کی تکبیریں ہیں اور یہی قول زیادہ مذہب حنفیہ کے موافق ہے کیونکہ حنفیہ سوائے ما وردبہ النص کے جہر بالذکر کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ تکبیرات تشریق مخصوصہ ہیں ان کے جواز پر نص اور صراحۃً آگئی ہے۔ یہ مستثنیٰ ہیں۔ اصل مسئلہ پر ان کو بطور دلیل پیش کرنا کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہے اور بعد از نماز کلمہ لا الہ الا اللہ مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی لیے صاحب فتاویٰ نظامیہ نے کہا کہ اس سے خلل اندازی نماز ہو گی جو کہ مکروہ ہے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی فتاویٰ افریقہ میں

لکھا کہ اس سے خلل اندازی نماز نہیں ہونی چاہیئے۔

خلل اندازی نماز کے جواز کے قائلین بعض موقعہ حدیث ابن عباس پیش کرتے ہیں جس کو بخاری اور مسلم نے ذکر کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے اختتام کو اللہ اکبر کہنے سے پہچانا کرتا تھا۔ (مشکوٰۃ ص۸۹)

حالانکہ حدیث ابن عباس کے متعلق امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ فرماتے ہیں:

واحسبه انما جهر قليلا ليتعلم الناس منه۔

کہ حضرت ابن عباس کی یہ روایت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر پڑھا کرتے تھے تو میرے خیال میں اس سے مراد یہ ہے کہ آپ نے تھوڑا عرصہ جہر کیا تاکہ لوگ حضور علیہ السلام سے سیکھ لیں۔ (پھر جہر ترک کر دیا) (بحوالہ کتاب الام ج ۱ ص ۱۱۱)

اسی لیے امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں تو پسند کرتا ہوں کہ امام اور مقتدی نماز سے فارغ ہونے کے بعد دونوں آہستہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں۔ حدیث کے سیاق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس نے جب یہ حدیث بیان کی، اس وقت صحابہ کرام نے بلند آواز سے ذکر جہر چھوڑ دیا تھا۔

علامہ کرمانی الشافعی المتوفی ۷۸۶ھ حدیث ابن عباس کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

ابن عباس کا یہ قول كان على عهد النبى صلى الله عليه وسلم (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ ذکر تھا) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب ابن عباس نے یہ حدیث بیان کی ہے تو اس وقت صحابہ ایسے نہیں کرتے تھے گویا کہ صحابہ نے یہ خیال کیا کہ تکبیر کہنا لازم نہیں ہے۔ اس لیے صحابہ نے اس خوف کی وجہ سے اس ذکر کو ترک کر دیا تھا تاکہ کم فہم لوگ یہ خیال نہ کریں کہ نماز بغیر اس کے پوری نہیں ہوتی۔

علامہ عینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ حدیث ابن عباس کے بعد آخری فیصلہ امام شافعی کا لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مختار امام اور مقتدی ہر دونوں کے لیے بعد از نماز ذکر خفی افضل ہے۔ (تاکہ نمازی کو تشویش نہ ہو)

ثابت ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ المتوفی ۶۸ھ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلند آواز سے جو ذکر تھا وہ صرف تعلیم جواز کے لیے کیا گیا ہے۔ دائمی یہ بات نہیں اسی لیے صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا۔ اگر حکم دائمی ہوتا تو پھر صحابہ کیوں چھوڑتے۔

اعتراض: علامہ ابن حجر عسقلانی تو لکھتے ہیں:

فیه دلیل علی جواز الجهر بالذکر عقب الصلوٰة

اس حدیث ابن عباس میں دلیل ہے کہ نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا جائز ہے۔ انتہی

جواب حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ جواز جہر پر علامہ ابن بطال المتوفی ۴۴۴ھ نے گرفت کی ہے۔ کہا کہ سلف میں سے کسی ایک سے بھی اس پر اطلاع نہیں پائی جاسکی اور امام نووی شافعی فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے اس حدیث کا مطلب تعلیم جواز قرار دیا ہے۔ وہ بھی تھوڑے وقت کے لیے جہر پر کبھی مداومت اور ہمیشگی نہیں ہوئی اور آخر میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

والمختار ان الامام والماموم یخفیان الذکر (فتح الباری ج۲ ص۳۲۵)

اور مختار یہی ہے کہ امام اور مقتدی دونوں آہستہ ذکر کریں۔

علامہ عینی نے بھی ابن بطال کے تعاقب اور گرفت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

وقال ابن بطال اصحاب المذاهب المتبعة وغیرهم متفقون علی عدم استحباب رفع الصوت بالتکبیر والذکر حاشا ابن حزم محدث۔

ابن بطال فرماتے ہیں کہ تمام اصحاب مذاہب اربعہ اور ان کے علاوہ دوسرے سب اس بات پر متفق ہیں کہ بلند آواز سے تکبیر اور ذکر مستحب نہیں ہے بجز ابن حزم کے۔

پھر علامہ عینی لکھتے ہیں کہ امام شافعی کے نزدیک امام اور مقتدی دونوں کے لیے مختار آہستہ ذکر ہے۔ علامہ ابن حزم المتوفی ۴۵۶ھ غیر مقلد ہے۔

اعتراض: مشکوٰۃ شریف میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سلم من صلوتہ قال بصوتہ الاعلی لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الحدیث۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نماز کا سلام پھیرتے بلند آواز سے فرماتے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ (اخیر حدیث تک پڑھیے)

ف: یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ کلمات پڑھتے اور بعض لوگ مسبوق بھی ہوتے جو بعد از سلام نماز ادا کرتے ان کی نماز میں خلل ہوتا۔ ثابت ہوا کہ خلل اندازی نماز جائز ہے۔

جواب: یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے مسلم سے نقل اور تخریج کی ہے اور مسلم شریف میں یہ الفاظ: بصوتہ الاعلیٰ کے موجود نہیں ہیں۔ دیکھئے مسلم شریف ص ۲۱۸۔ اور اس روایت کو امام ابوبکر بیہقی المتوفی ۴۵۸ھ نے "سنن کبریٰ" ص ۱۸۵ میں بحوالہ مسلم ذکر کیا ہے لیکن اس میں بھی بصوتہ الاعلیٰ کے لفظ موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح امام احمد بن محمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ نے اپنی مسند ج ۴ ص ۵ اور امام ابوداؤد المتوفی ۲۷۵ھ نے سنن ابوداؤد ص ۲۱۱ اور امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے نسائی ص ۱۵۰ اور امام نووی نے کتاب الاذکار ص ۶۷ اور علامہ ابن القیم المتوفی ۷۵۱ھ نے زاد المعاد ص ۶۶ میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ لیکن ان تمام کتب مذکورہ میں بصوتہ الاعلیٰ کے الفاظ موجود نہیں ہیں اور یہ الفاظ بصوتہ الاعلیٰ صرف مشکوٰۃ میں موجود ہے لیکن صاحب مشکوٰۃ کا یہ وہم ہے جو لوگ علم حدیث میں بصیرت تامہ رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مشکوٰۃ شریف میں فن حدیث کے لحاظ سے متعدد وہم ہیں۔ مثلاً دیکھئے صاحب مشکوٰۃ حضرت عبداللہ بن مسعود المتوفی ۳۲ھ کی ترک رفع یدین کی روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

وقال ابوداؤد وليس هو بصحيح علی هذا المعنی انتهی ۔

حالانکہ ابوداؤد نے یہ الفاظ حضرت ابن مسعود کی روایت کے بارے میں نہیں فرمائے بلکہ ابوداؤد نے حضرت براء بن عازب المتوفی ۷۲ھ کی حدیث کے متعلق فرمائے ہیں جس کو ہم نے اپنی کتاب نور الفرقدین علی رفع الیدین میں بھی ذکر کیا ہے ۔

جب صاحب مشکوٰۃ کو ان الفاظ کے ساتھ وہم ہوا ہے تو بلند آواز سے بعد از نماز ذکر لا الٰہ الا اللہ ثابت نہ ہوا ۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت نے فتاویٰ افریقہ میں اور صاحب فتاویٰ نظامیہ نے اپنے فتاویٰ میں کہا کہ کلمہ طیبہ کے ساتھ بھی خلل اندازی نماز منع ہے ۔ چونکہ صاحب مشکوٰۃ کو ان الفاظ (بصوتہ الاعلی) کے ساتھ وہم ہوا ہے لہٰذا یہ روایت ہی غیر مسلمہ ہے اگر اس کو بالفرض والتقدیر تسلیم بھی کیا جائے تو اس کا جواب وہ بھی ہے جو امام شافعی نے ذکر کیا ہے ۔

واحسب ماروی ابن الزبیر من تہلیل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

انما جہر قلیلا لیتعلم الناس منہ ۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ المتوفی ۷۳ھ نے جو یہ روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لا الٰہ الا اللہ پڑھتے تھے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑا عرصہ جہر کیا تاکہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ لیں ۔ اسی لیے امام شافعی ، حافظ ابن حجر ، حافظ بدرالدین عینی حنفی ، علامہ نووی شافعی وغیرہ یہی فرماتے ہیں کہ بعد از نماز امام اور مقتدی ہر دونوں ذکر خفی کریں بلند آواز سے ذکر نہ کریں تاکہ خلل اندازی نماز نہ ہو ۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے فتاویٰ افریقہ میں اور صاحب فتاویٰ نظامیہ نے کہا کہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ سے خلل اندازی نماز نہیں ہونی چاہیئے ۔ بہرصورت ذکر ، ذکر خفی ، ذکر جہر ، ذکر متوسط تمام جائز ہیں لیکن خلل اندازی نماز ہرگز جائز نہیں ۔ مسند میں

جب نمازی نماز میں مصروف نہ ہوں یا نمازی ہی نہ ہوں تو پھر بلند آواز سے ذکر جائز ہے۔

واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ کیا مقتدی نماز فریضہ میں بھی امام کو لقمہ دے سکتے ہیں جبکہ امام نے اتنی قرأت پڑھ لی ہے جس کے ساتھ نماز ہو جاتی ہے۔

سائل: امام دین پیش امام۔ تخت پور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

مقتدی کو اپنے امام کے لیے لقمہ دینا جائز ہے، اگرچہ نماز فرضی، نفلی، جہری ہو خواہ امام اتنی مقدار پڑھ چکا ہو جس کے ساتھ نماز ادا ہو جاتی ہے یا زیادہ۔ مگر مقتدی کو جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

ویکرہ للمقتدی ان یفتح علی امام من ساعۃ لجواز ان یتذکر من ساعۃ فیصیر قارئا خلف الامام من غیر حاجۃ۔

اور مقتدی کے لیے مکروہ ہے کہ وہ فوراً اپنے امام پر لقمہ دے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ امام کو اسی وقت بھولا ہوا لفظ یاد آجائے اور قرأت امام کے پیچھے بلا ضرورت واقع ہو۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہی ہے:

وان فتح علی امامہ لم تفسد

کہ اگر مقتدی نے امام پر لقمہ دیا تو نماز فاسد نہیں ہوگی

والصحیح ان ینوی الفتح علی امام دون القراٴۃ

اور صحیح یہی ہے کہ لقمہ کی نیت کرے قرأت کی نیت نہ کرے۔ لہٰذا صورت مذکورہ میں لقمہ دینا جائز ہے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ امام نے جب دو سجدے کیے پھر تیسرے سجدے کی طرف چلا گیا۔ مقتدیوں نے لقمہ دیا مگر وہ سجدہ میں چلا گیا۔ کیا مقتدی بھی امام کی تابع فرمانی کرتے ہوئے تیسرے سجدہ میں چلے جائیں یا انتظار کرتے رہیں۔ شرعی حکم بیان کیا جائے۔

مستفتی محمد علی ضلع جہلم۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر امام نے دو سجدوں کے بعد اگر تیسرا سجدہ کیا ہے تو مقتدیوں کو چاہیے کہ امام کی اتباع نہ کریں۔ شامی ج ۱ صہ ۳۲ میں ہے:

وانہ لیس لہ ان یتابع فی البدعۃ والمنسوخ وما لا تعلق لہ بالصلوٰۃ فلا یتابعہ لو زاد سجدۃً۔

امام کی بدعت اور منسوخ میں اتباع نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز میں اتباع واجب ہے جس کا نماز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امام نے اگر سجدہ زائد کیا ہے تو مقتدی اس کی تقلید نہ کرے۔

صورت مذکورہ میں مقتدیوں کو امام کی اتباع اور تقلید لازم نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے احناف اہل السنۃ والجماعۃ دریں مسئلہ کہ بوقت رکوع رفع یدین ثابت ہے یا نہیں۔ یہاں کے وہابیہ کہتے ہیں کہ رفع یدین کرنا چاہیے کیونکہ احادیث میں رفع یدین کا ثبوت موجود ہے اور جن میں رفع یدین کی ممانعت ہے وہ حدیثیں ضعیف ہیں۔ لہذا آپ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں اور مسئلہ بحوالہ جات کتب حدیث تحریر فرمائیں۔

سائلین از کلاسوالہ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

حنفیہ کے نزدیک رفع یدین رکوع جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت ثابت نہیں اور نہ ہی حنفیہ اس پر عامل ہیں۔ امام شافعی، امام احمد رفع یدین کے قائل ہیں اور امام مالک بھی مشہور قول کے مطابق رفع یدین نہیں کرتے۔

وعن مالك الترك رواه ابن قاسم واختاره المواللك وفی روایة الرفع وقال ابن رشد فی بدایة المجتهد ونهایة المقتصد ان الامام مالكا رجح الترك لانه جری علیه تعامل السلف من اهل المدینة

اور ابن قاسم نے امام مالک سے عدم رفع یدین کی روایت ذکر کی ہے اور اسی کو تمام مالکیہ نے پسند کیا ہے یعنی وہ رفع یدین نہیں کرتے اور ایک روایت میں وہ رفع یدین کرتے ہیں۔ محدث ابن رشد المالکی المتوفی ۵۹۵ھ نے بدایۃ المجتہد میں کہا کہ امام مالک عدم رفع یدین کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اہل مدینہ کا عمل رفع یدین کے نہ کرنے پر ہے۔ (ایک ابن رشد اوّل ہیں جنہوں نے فقہ مالکیہ کو مدوّن کیا ہے۔ ان کی وفات ۵۲۰ھ میں ہوئی)۔

شوافع اور حنابلہ رفع یدین کے ثبوت کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث پیش کرتے ہیں:

عن الزهری عن سالم عن عبد الله بن عمر قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قام الی الصلوٰة رفع یدیه حتی یکونا حذو منکبیه ثم کبر فاذا اراد ان یرکع فعل مثل ذالك واذا رفع من الرکوع فعل مثل ذالك ولا یفعله حین یرفع راسهٗ من السجود۔

(بخاری، مسلم، نسائی المتوفی ۳۰۳ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھاتے پھر تکبیر کہتے پھر جب رکوع کرتے اس کی مثل کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے پھر اسی طرح کرتے اور جب سر کو سجدہ سے اٹھاتے تو اس طرح نہ کرتے۔

یہ وہ حدیث ہے جو شافعیہ اور حنبلیہ رفع یدین کے ثبوت کے لیے پیش کرتے ہیں اور حنفیہ نے حدیث عبداللہ ابن مسعود پیش کر کے تعارض کر دیا ہے۔ دیکھئے محدث ابن ہمام فرماتے ہیں:

وجوابه المعارضة بما فی ابوداؤد والترمذی عن وکیع عن سفیان الثوری عن عاصم بن کلیب عن عبدالرحمٰن بن الاسود عن علقمه قال قال عبد الله بن مسعود الا اصلی بکم صلوٰة رسول الله صلی الله علیه وسلّم فصلی ولم یرفع یدیه الا فی اول مرة و فی لفظ فکان یرفع یدیه فی اول مرة ثم لا یعود قال الترمذی حدیث حسن واخرجه النسائی عن ابن المبارك عن سفیان الی آخره و ما نقل عن ابن المبارك انه قال لم یثبت عندی حدیث ابن مسعود فغیر ضائر بعد ما ثبت بالطریق اللتی ذکرنا۔

یعنی ابن عمر کی حدیث کا معارضہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث کے ساتھ ہو گیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود کی حدیث کو امام ترمذی اور امام ابو داؤد نے وکیع عن سفیان ثوری کی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ کیا تمہارے سامنے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی نماز نہ پڑھوں۔ پس ابن مسعود نے نماز پڑھی اور ہاتھ بلند نہ کیے مگر اول مرتبہ پھر رفع یدین کیطرف نہیں لوٹے۔ ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے اور نسائی نے ابن مبارک عن سفیان کی سند سے اس کو روایت کیا ہے اور ابن مبارک سے جو منقول ہے کہ حدیث ابن مسعود کی میرے

نزدیک ثابت نہیں ہے۔ محدث ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ چیز کوئی نقصان دہ نہیں ہے۔ جبکہ حدیث اس سند سے ثابت ہو چکی ہے جس کو ہم نے بیان کیا ہے (یعنی وکیع عن سفیان ثوری)

یعنی عبداللہ بن مبارک کا یہ کہنا کہ میرے نزدیک حدیث ابن مسعود ثابت نہیں اس سے اصل حدیث ابن مسعود متاثر نہیں ہے کیونکہ وہ دوسری سند وکیع عن سفیان سے ثابت ہے۔ اگرچہ ابن مبارک کے خیال کے مطابق دوسری سند میں ثابت نہیں۔

شیخ الاسلام ابن دقیق العید المتوفی ۷۰۲ھ فرماتے ہیں کہ ابن مبارک کا ابن مسعود کی حدیث کو قبول نہ کرنا اس کے ثبوت میں خرابی پیدا نہیں کرتا کیونکہ یہ دوسرے محدثین کے نزدیک حدیث ثابت ہے۔

ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالملک بن یحیٰی بن ابراہیم ابن القطان المتوفی ۶۲۸ھ نے اس حدیث کی کتاب الوہم والایہام میں تصحیح کی ہے: وکذالک صححہ ابن حزم الاندلسی اور اسی طرح ابن حزم اندلسی المتوفی ۴۵۶ھ (جو کہ غیر مقلد اور اہل ظواہر سے ہیں) نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور محدث ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ ابن مبارک ابن مسعود کی حدیث کو کیسے معلول کہہ سکتے ہیں۔

والحال انہ یدور علی عاصم بن کلیب وھو من رواۃ مسلم۔

جبکہ حدیث کا مدار عاصم بن کلیب المتوفی ۱۳۷ھ پر ہے جو کہ امام مسلم کے راویوں میں سے ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ ابن مسعود کی حدیث دو مضمونوں کے ساتھ مروی ہے۔ ایک رفع فعلی اور ایک رفع قولی تو ابن مبارک کے نزدیک اگر ثابت نہیں تو وہ روایت ہے جس میں رفع قولی ہے نہ کہ رفع فعلی اور رفع فعلی تو ابن مبارک کے نزدیک بھی ثابت ہے۔ کیف وقد روی ابن المبارک فعل ابن مسعود ای المضمون الاول فی النسائی ص ۱۶۸۔

کیسے نہ ہو حالانکہ ابن مبارک نے فعل ابن مسعود کو خود روایت کیا ہے جیسا کہ نسائی شریف

ہیں ہے۔ (بحوالہ العرف الشذی ص۱۲۵)

وہابیہ جو کہتے ہیں کہ حدیث ابن مسعود صحیح نہیں یہ ان کی غلط فہمی ہے کہ وہابیہ نے رفع فعلی اور قولی کے درمیان فرق نہیں کیا۔ رفع فعلی کو قولی بنادیا ہے اور رفع قولی کو فعلی بنادیا ہے اور کہا کہ حدیث ابن مسعود تو ابن مبارک کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے حالانکہ ابن مبارک کے نزدیک جو ثابت نہیں وہ قولی ہے اور بحث جس میں ہو رہی ہے وہ فعلی ہے اور فعلی کو ابن مبارک خود روایت کر رہے ہیں۔ جیسا کہ نسائی ص۱۶۸ پر ہے۔ لہٰذا حدیث ابن مسعود صحیح السند ہے۔

سوال: حافظ ابن حجر نے حدیث ابن مسعود کو تلخیص الحبیر میں ضعیف کہا ہے۔

جواب: حافظ ابن حجر نے حدیث ابن مسعود کو درایہ میں صحیح کہا ہے۔ گویا کہ حافظ ابن حجر اس حدیث میں متردد ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ معلول ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ صحیح ہے۔ لہٰذا ابن حجر کی جرح ابن مسعود کی حدیث پر غیر معتبر ہے۔

سوال: دارقطنی کہتے ہیں کہ حدیث ابن مسعود معلول ہے۔

جواب: بدر الدین زرکشی المتوفی سنہ ۷۹۴ھ لکھتے ہیں:

ان الدارقطنی صححه فی موضع واعله فی موضع

کہ دارقطنی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حدیث ابن مسعود صحیح ہے اور ایک جگہ لکھا ہے کہ معلول ہے۔ لہٰذا دارقطنی کی جرح بھی ابن مسعود کی حدیث کو متاثر نہیں کرے گی۔ باوجودیکہ دیگر محدثین اس کی تصحیح فرما رہے ہیں۔ جب حدیث ابن مسعود صحیح السند ہے تو اب عاصم بن کلیب پر بھی جرح غیر مقبول ہے۔ سید الحفاظ یحیی بن معین المتوفی سنہ ۲۳۰ھ نے اس کی توثیق کی ہے۔ فقد وثقه ابن معین۔ اور امام مسلم نے اس سے حدیث عن علی روایت کی ہے۔

سوال: عبدالرحمن علقمہ سے نہیں سنتا۔ لہٰذا حدیث ابن مسعود صحیح نہیں ہے۔

جواب: یہ رجل مجہول کا قول ہے۔ عبدالرحمن کا سن ابراہیم نخعی کے مطابق ہے۔ جب

ابراہیم علقمہ سے سنتا ہے تو عبدالرحمن کیوں نہیں سنتا حالانکہ ابن حبان المتوفی ۳۵۴ھ نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور اس کا سن وفات ۹۹ھ ہے اور خطیب نے اپنی کتاب المتفق میں تصریح کی ہے کہ یہ عبدالرحمن علقمہ سے سنتا ہے

سوال : امام بخاری نے جزء رفع یدین میں حدیث ابن مسعود پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ حدیث تو صحیح ہے لیکن یہ فقرہ لم یرفع یدیہ الا فی اوّل مرۃ معلول ہے۔

جواب تعلیل ناممکن ہے۔ حدیث تمام بمعہ زیادتی صحیح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سفیان بن عیینہ المتوفی ۱۹۸ھ کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ابی زیاد سے ایک مرتبہ حدیث کو سنا تو انہوں نے ثم لا یعود کا ذکر کیا۔ پھر میں دوسری مرتبہ ان کے پاس سے پھر یہی حدیث سنی تو انہوں نے کہا : ثم لا یعود امام ابوداؤد کے لولوئی نسخہ کے سوا دوسرے نسخوں میں ہے کہ شاید یزید کو تلقین ہو گئی۔ تلقین یہ ہے کہ شیخ

تلقین یہ ہے کہ شیخ روایت کرے، شاگرد کہے کہ یہ لفظ بھی آپ کی روایت میں ہے۔ شیخ کہے ہاں اور تلقین محدثین کے نزدیک علامت ضعف ہے۔ یہاں سے بعض لوگوں نے سمجھا کہ حدیث ابن مسعود میں خطا ہے جیسا کہ ابوحاتم المتوفی ۳۲۷ھ نے کہا کہ حدیث ابن مسعود میں خطا ہے حالانکہ یہ خطا نہیں۔ کیونکہ ابن مسعود کی بعض روایات میں لم یرفع یدیہ الا فی اوّل مرۃ ہے اور بعض میں ثم لا یعود ہے۔

دونوں کا مطلب ہے کہ رفع یدین ایک مرتبہ ہی تھا پھر عندالرکوع وغیرہ رفع یدین نہیں کیا۔ حدیث میں نہ خطا ہے اور نہ ہی تلقین ہے۔ بلکہ دو لفظ تھے معنی ایک تھا۔

ابوحاتم کو خود غلطی لگ گئی اس نے کہہ دیا کہ حدیث میں خطا ہے۔ اسی وجہ سے دارقطنی اور ابن قطان فرماتے ہیں : فانما هو ظن ظنوه کہ حدیث کو معلول کہنا جیسا کہ ابوحاتم یا بیہقی یا ابن حبان نے کہا ہے کہ وہ صرف ظن ہی ظن ہے حدیث صحیح ہے۔ پس محدث ابن ہمام فرماتے ہیں :

فعرفنا انه لماروی من طرق بروں ھذہ الزیادۃ ظنوھا خطاء

واختلفوا فی الغالط وغایۃ الامران الاصل رواہ مرۃ بتمامہ و

مرۃ بعضہ بحسب تعلق الغرض وبالجملۃ فزیادۃ العدل الضابط

مقبولۃ خصوصاً۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب ایک حدیث کو بتمامہ ذکر کیا جائے اور بعض دفعہ اس کا بعض حصّہ ذکر کیا جائے اور یہ زیادتی کسی غرض کی وجہ سے ہو تو وہ زیادتی مقبول ہوتی ہے جبکہ اس کا بیان کرنے والا عادل ضابط ہو۔ اس زیادتی کی وجہ سے وہ حدیث غلط نہیں ہو جاتی باوجودیکہ اس حدیث کے متابعات بھی ہوں۔ چونکہ وہ روایت ایک مرتبہ زیادتی سے خالی ہوتی ہے تو لوگ اس کو غلط سمجھنے لگتے ہیں۔ حدیث ابن مسعود میں ثم لا یعود کا قطعہ پہلے معنی کی تشریح ہے لہٰذا اس کے ساتھ حدیث معلول نہیں ہوگی۔ اس کی مزید تائید ابن عینیہ کی وہ روایت ہے۔ جس میں ابوحنیفہ اور اوزاعی کا باہمی مکالمہ مکہ مکرمہ میں ہوا جو درج ذیل ہے:

اوزاعی نے کہا اے ابوحنیفہ تم بوقت رکوع رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟

ابوحنیفہ نے جواب دیا کہ رفع یدین کے ثبوت میں کوئی بھی صحیح حدیث رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت نہیں ہوئی۔

اوزاعی نے کہا: آپ یہ کیوں کہتے ہیں حالانکہ مجھے زہری المتوفی ۱۲۴ھ نے سالم سے سالم نے اپنے باپ ابن عمر سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نماز کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے اور رکوع میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت بھی رفع یدین کرتے تھے۔

پس ابوحنیفہ نے فرمایا:

حدثنا حماد عن ابراھیم عن علقمہ والاسود عن عبد اللہ بن

مسعود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلّم کان لا یرفع یدیہ الا عند

افتتاح الصلوٰۃ ثم لا یعود شئی من ذالک

ہم کو حماد نے ابراہیم سے اس نے علقمہ اور اسود سے انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے حدیث بیان کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف شروع نماز (بوقت تکبیر تحریمہ) میں رفع یدین کرتے تھے پھر تمام نماز میں کسی موقع پر بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

پس اوزاعی نے کہا کہ میں تجھے زہری سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تو مجھے حماد سے بیان کرتا ہے۔

ابوحنیفہ نے کہا کہ حماد زہری سے زیادہ فقیہ اور عالم ہیں اور ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور علقمہ ابن عمر سے کم نہیں اگرچہ ابن عمر کے لیے صحابیت ہے لیکن علقمہ کے لیے صحبت ہے اور اسود المتوفی ۷۵ھ کے لیے علم کثیر ہے اور عبداللہ عبداللہ ہے (یعنی ابن مسعود بڑی شان کے مالک ہیں) الخ

ابوحنیفہ نے ترجیح میں راویوں کے علم اور فقاہت کو پیش نظر رکھا ہے اور اوزاعی نے سند عالی کا لحاظ کیا ہے اور یہ زیادتی ثم لا یعود حافظ اور ضابط اور عادل سے ہے۔ لہذا یہ زیادتی صحیح ہے۔

امام اوزاعی نے زیادتی پر اعتراض نہیں کیا لہذا اس زیادتی کی وجہ سے حدیث معلول نہیں ہوگی۔ جب حدیث ابن مسعود صحیح السند ہے تو یہ ابن عمر کی حدیث (جس پر شوافع کے مسئلہ رفع یدین کا مدار ہے) کے ساتھ معارض ہو جائے گی بلکہ دیگر احادیث جو رفع یدین پر دلالت کرتی ہیں ان کے بھی معارض ہوگی۔ جب تعارض ہوا تو اصول حدیث کے تحت ترجیح کرنی پڑے گی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں

فان امکن الترجیح تعین المصیر الیہ۔ (نخبۃ الفکر ص۲۵)

اگر ترجیح ہو سکے تو ترجیح ہوگی۔ یہاں پر ترجیح حدیث ابن مسعود کو ہے۔ (وجہ ترجیح

یہ ہے کہ ترجیح راویوں کے علم کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ مرتبہ علم اور فقاہت، علو اسناد سے بلند ہے۔ لہذا علم اور فقاہت کی وجہ سے ترجیح ہوگی اور حدیث ابن مسعود کے راوی زیادہ فقیہ ہیں۔ جیسا کہ ابوحنیفہ نے خود بیان کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کی صحت اور عدم صحت کا اعتماد راویوں پر ہے اور حنفیہ کے راوی بدری صحابہ ہیں۔ وہ نماز کے وقت بھی پہلی صف میں حضور علیہ السّلام کے پیچھے ہوتے تھے اور شافعیہ کے رواۃ حدیث ابن عمر اور وائل بن حجر دور ہوتے تھے اور اقرب کے قول کے ساتھ (ابن مسعود) عمل کرنا اولیٰ ہے۔ لہذا ترجیح حدیث ابن مسعود کو ہی ہوگی۔

سوال: امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

جواب: اسی حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں بسند وکیع عن سفیان بیان کیا ہے اور اس میں جو لفظ فلم یرفع یدیہ الا مرۃ ہے یہ دفع یدیہ ثم لم یعد کے معنی میں ہے۔ اسی طرح ابوبکر بن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۹ھ نے اپنی تصنیف میں اسی سند کے ساتھ حدیث عبداللہ بن مسعود کو ذکر کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کی تنقید کا تعلق صرف اسی قطعہ کے ساتھ تھا۔ حالانکہ یہ حدیث کا دوسرا طریقہ تھا جو اس کا ہم معنی تھا۔ جب اس کی تصحیح ابوحنیفہ نے کردی ہے تو امام احمد کے قول سے حدیث متاثرنہ ہوگی اور خود دارقطنی جنہوں نے کہا کہ احمد بن حنبل اس زیادتی کو تسلیم نہیں کرتے۔ علی بن عاصم کی سند سے روایت کرتے ہوئے زیادتی ثم لا یعود کو بیان کیا ہے اور دارقطنی نے اس زیادتی کو تسلیم بھی کیا ہے لہذا حدیث ابن مسعود متاثر نہ ہوگی۔

سوال: ابوداؤد فرماتے ہیں کہ حدیث ابن مسعود صحیح نہیں ہے۔

جواب: یہ غلط ہے کیونکہ ابوداؤد نے حدیث ابن مسعود پر کلام نہیں کی اور نہ ہی اس پر عدم صحت کا حکم کیا ہے بلکہ ابوداؤد نے براء بن عازب کی حدیث پر بحث کی ہے۔ البتہ صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے کہا کہ:

وقال ابو داؤد لیس ھو بصحیح علی ھذا المعنی ۔

ابوداؤد فرماتے ہیں کہ حدیث ابن مسعود اس معنی پر صحیح نہیں ہے یعنی حدیث ابن مسعود رفع یدین کے معنی پر صحیح نہیں ۔ اسی لیے قاری حنفی فرماتے ہیں :

وان کان سندہ صحیحاً (کہ حدیث اپنی سند کے ساتھ صحیح ہے) اور ترجیح ابن مسعود کی حدیث کو ہی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل رفع یدین کے خلاف ہے ۔ امام طحاوی اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے روایت کرتے ہیں :

قال صلیت خلف ابن عمر فلم یکن یرفع یدیہ الا فی التکبیرۃ الاولیٰ من الصلوٰۃ ۔

مجاہد نے کہا کہ میں نے ابن عمر کے پیچھے نماز پڑھی ۔ آپ رفع یدین صرف بوقت تکبیر تحریمہ کیا، اس روایت کو ابوبکر بن ابی شیبہ اور امام بیہقی نے بھی بیان کیا ہے ۔

سوال : طحاوی کی پیش کردہ اس روایت میں ابوبکر بن عیاش ضعیف ہے ۔

جواب : ہم کہتے ہیں کہ یہ رجال صحیحین سے ہے اور احمد بن یونس نے ابوبکر بن عیاش سے قبل از اختلاط روایت لی ہے اور امام بخاری نے اس سے بیس مقام سے زائد میں تخریج کی ہے ۔ ابن عمر نے پہلے حضور کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے پھر اس کو چھوڑ دیا ہے ۔ ثابت ہوا کہ ابن عمر رفع یدین کو منسوخ سمجھتے تھے ۔ ابن عمر کا عمل اپنی روایت کے خلاف ابن مسعود کی حدیث کے لیے باعث ترجیح ہے اور عندالرکوع رفع یدین کا منسوخ ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ رفع یدین بین السجدتین منسوخ ہے ۔ باوجودیکہ رفع یدین بین السجدتین و رفع یدین بعد السجدتین بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے ۔ جیسا کہ نسائی صـ۱۷۲ اور ترمذی صـ۴۰ میں موجود ہے حالانکہ امام شافعی اس کو پسند نہیں فرماتے اور نہ ہی رفع یدین بین السجدتین (دونوں سجدوں کے درمیان) اور نہ ہی رفع یدین بعد السجدتین کرتے ہیں امام شافعی اس رفع یدین کو منسوخ سمجھتے ہیں لہذا عندالرکوع بھی رفع یدین منسوخ ہوگا

وہابیہ خواہ مخواہ شوافع کا اتباع کر کے رٹ لگا رہے ہیں کہ رفع یدین احادیث سے ثابت ہے۔ عبداللہ بن زبیر الشہید ۷۳ھ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ مسجد حرام میں نماز پڑھ رہا ہے اور رفع یدین کرتا ہے۔ تو فرمایا؛

لاتفعل فان ھذا اشئی فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم ترکہ' ۔

رفع یدین نہ کر اس کو حضور نے پہلے کیا تھا پھر اس کو چھوڑ دیا ہے۔ اس حدیث کو علامہ ابن اثیر جزری المتوفی ۶۰۶ھ نے النہایہ میں اور حافظ زیلعی الحنفی المتوفی ۷۶۲ھ نے نصب الرایہ میں بیان کیا ہے۔

سوال : حنفیہ سے عبدالحیٔ اور علامہ سندھی ابن ماجہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ رفع یدین کے منسوخ ہونے کا قول بلا دلیل ہے۔

جواب : امام طحاوی ابن ہمام حافظ عینی ملا علی القاری کے سامنے عبدالحیٔ اور علامہ سندھی کیا مقام رکھتے ہیں جبکہ یہ تمام کہہ رہے ہیں کہ رفع یدین کی احادیث منسوخہ ہیں۔ علاوہ ازیں عبدالحیٔ اور علامہ سندھی مذہب ابوحنیفہ تو نقل نہیں کر رہے تاکہ ہم حنفیہ پر حجت ہو۔ جب وہ بڑے بڑے ایمہ احناف کی تحقیق کے خلاف لکھ رہے ہیں تو ان کی تحقیق بجائے خود غلط ہے جس پہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے بھی ہم نے بیان کیا ہے کہ عبدالحیٔ اجتہادیات میں امام سے نصوص کا مطالبہ کرتا ہے جو کہ عبدالحیٔ کا منصب ہی نہیں ہے۔ عبدالحیٔ ظاہراً تقلید کرتا ہے۔ حقیقت میں وہ غیر مقلد اور محقق ہونے کا مدعی ہے۔ بہرحال حدیث رفع یدین عندالرکوع منسوخ ہے جبکہ عندالسجود میں رفع یدین منسوخ ہے اور بوقت تعارض نسخ حدیث رفع یدین مذہب حنفیہ کے لیے باعث ترجیح ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب " نورالفرقدین علی رفع الیدین " میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم۔

الاستفتاء

جناب مکرم ومعظم مفتی صاحب دربار عالیہ علی پور شریف دامت برکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

ہمارے ایڈیٹر صاحب انوار الصوفیہ قصور مولوی غلام رسول صاحب گوہرؔ نے ایک موسومہ آئینہ نماز لکھ کر شائع فرمائی ہے۔ اس کے صفحہ ۳۹ پر جواز رفع سبابہ یعنی نماز کے دوران تشہد میں انگلی سبابہ سے اشارہ کرنا لکھا ہے کہ تشہد میں انگلی کے ساتھ اشارہ کرنا سنت ہے۔ اسکا ترک موجب گناہ ہے لیکن مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں رفع سبابہ منع فرمایا ہے اور صلوٰۃ مسعودی ج ۱ ص ۹۴ اور فتاوٰی نظامیہ سلطان الفقہ ج ص ۵ میں بھی منع فرمایا ہے اور اعلیٰ حضرت امیر الملت محدث علی پوری اور مفتی اعظم حضرت سراج الملت دربار عالیہ نور اللہ مرقدہٗ بھی رفع سبابہ منع فرماتے تھے۔ فقیر کو ان کی صحبت ومحفل عالیہ سے عرصہ ۲۵ سال کا شرف حاصل ہے ان کے ساتھ نمازیں بھی پڑھی ہیں لیکن آپ کبھی نماز میں ایسا نہ کرتے تھے بلکہ موجودہ حضرات صاحبزادگان اعلیحضرت دربار عالیہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ کیا مولوی غلام رسول صاحب گوہر کے قول پر عمل کیا جائے یا مذکورہ صدر حضرات کے اقوال وسنت عالیہ پر عمل کیا جائے۔ حالانکہ ایڈیٹر صاحب موصوف اپنے آپ کو حنفی نقشبندی مجددی کہلاتے ہیں۔

یہ بھی ابوالعجیبت والی بات ہے

جواب تحریر فرما کر انوار الصوفیہ قصور میں شائع فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔ بینوا وتوجروا تاکہ عوام، عقیدت مند حضرات کی نمازیں درست ہوں۔

نیز حال ہی میں اس مسئلہ پہ مخالفین حضرات آئینہ نماز مذکورہ فقیر کے پیش کر کے جھگڑتے رہے۔ گویا مخالفین کو موجودہ ایک نسخہ ہاتھ آگیا ہے جس پہ نکتہ چینی کر رہے ہیں کہ آپ کے ایڈیٹر انوار الصوفیہ حنفی نقشبندی مجددی ہیں وہ رفع سبابہ کے قائل ہیں لہٰذا

اس مسئلہ پر روشنی ڈالنی اشد ضروری ہے ۔

فقط والسلام

المرقومہ ۔ ۱۱ ماہِ صفر ۱۳۹۴ھ

سائل ، فقیر غلام حسین جماعتی عفی عنہ

خطیب مسجد ٹھٹھڑ والی ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

تشہد میں انگلی کے ساتھ (رفع سبابہ) اشارہ کرنے کے متعلق حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ اپنے مکتوبات[1] دفتر اوّل ج ۱ میں رقمطراز ہیں کہ اشارہ حرام ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ جن روایات میں اشارہ کا ثبوت ہے وہ روایات اصول کی نہیں بلکہ روایاتِ نادرہ ہیں ۔ امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشیر ونصنع کما یصنع النبی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام ثم قال ھذا قولی وقول ابی حنیفۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (یعنی حضور علیہ السلام اشارہ کرتے تھے ۔ امام محمد فرماتے ہیں جیساکہ حضور علیہ السلام کرتے تھے ویسے ہی ہم کرتے ہیں پھر کہا یہی میرا مذہب اور امام ابو حنیفہ کا ہے) بھی روایت نادرہ ہے، یہ اصول سے نہیں ہے ۔

پھر امام ربانی مجدد الف ثانی نے فتاویٰ غرائب کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ امام محمد نے اس مسئلہ کو مبسوط میں ذکر نہیں کیا ۔ مشایخ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ اشارہ کرے ، بعض کہتے ہیں کہ نہ کرے ۔ علماء کے بیان کے بعد کہا کہ صحیح یہ ہے کہ اشارہ حرام ہے :

---

[1] مکتوب ۳۱۲ ، منہ ۱۲

وفی السراجیۃ ویکرہ ان یشیر بالسبابۃ فی الصلوٰۃ عند قولہ اشھد ان لا الہ الا اللہ ھو المختار وفی الکبریٰ وعلیہ الفتویٰ لان مبنی الصلوٰۃ علی السکون والوقار وفی الغیاثیۃ من الفتاوی ولا یشیر بالسبابۃ عند التشھد ھو المختار علیہ الفتویٰ وفی جامع الرموز لا یشیر ولا یعقد وھو ظاھر اصول اصحابنا کما فی الزاھدی وعلیہ الفتویٰ کما فی المضمرات والولوالجی والخلاصۃ وغیرھا۔

اور فتاوٰی سراجیہ میں ہے اور مکروہ ہے کہ نماز میں اشھد ان لا الہ الا اللہ پر انگشت سبابہ سے اشارہ کرے یہی مختار مذہب ہے اور کبریٰ میں ہے اور اسی پر فتویٰ ہے کیونکہ نماز کی بنا سکون اور وقار پر ہے اور فتاوٰی غیاثیہ[1] میں ہے کہ تشہد کے وقت انگشت سبابہ سے اشارہ نہ کریں یہی مختار ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور جامع الرموز میں ہے نہ تو اشارہ کرے اور نہ گرہ لگائے اور یہی ہمارے اصحاب کا ظاہر مذہب ہے۔ جیسا کہ زاہدی میں ہے اور اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ مضمرات اور ولوالجی اور خلاصہ وغیرہ میں ہے۔

مجدد الف ثانی یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب معتبر روایات میں اشارے کی حرمت واقع ہو چکی ہے اور اشارے کے مکروہ ہونے پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ اشارہ اور گرہ لگانے سے علماء روکتے ہیں اور اپنے اصحاب کا ظاہر مذہب بتاتے ہیں تو ہم مقلدوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ احادیث کے مقتضا کے مطابق عمل کرکے اشارہ کرنے کی جرأت کریں اور اس قدر علماء اور مجتہدین کے فتووں کے باوجود ایک حرام اور مکروہ اور ممنوع کام کا ارتکاب کریں۔

تنبیہہ : ہمارے مذہب کے مسائل تین طبقہ پر ہیں :

---

[1] اور فتاوٰی غیاثیہ میں فتاوی سے منقول ہے۔

اوّل وہ مسائل جو کہ ظاہر روایت یعنی مبسوط اور جامع صغیر و کبیر اور زیادات کے ہیں۔
ثانی غیر کتب مذکورہ کے مسائل یعنی غیر ظاہر روایت کے ثالث، وہ جو کہ متا
ثالث وہ جو کہ متاخرین نے اصحاب محمد وغیرہم کی کلام سے مسائل استنباط کیے ہیں۔
ایمہ ثلاثہ میں سے کسی ایک کی ان مسائل میں روایت نہیں ہے۔ اگر سائل کہے کہ
حدیث پاک میں موجود ہے کہ حضور علیہ السلام اشارہ فرماتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا کہ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھا ہوا تھا اور انگلی کیساتھ اشارہ کر رہے تھے۔

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا کہ آپ تشہد میں حلقہ کرنے کے بعد اشارہ کر رہے تھے۔ (بحوالہ ابن ماجہ صہ ۶۶)

جواباً کہا جائے گا کہ امام ربانی مجدد الف ثانی نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ احادیث جن میں رفع سبابہ ثابت ہو رہا ہے وہ مضطرب ہیں کیونکہ بعض روایات میں آتا ہے کہ اشارہ کے وقت سبابہ کو حرکت دیتے تھے اور بعض میں عدم حرکت ہے۔ بعض میں ہے کہ قرأت تشہد بلا تعین کے وقت اشارہ کرتے تھے۔ بعض میں تعین ہے بعض روایات میں ہے کہ فلاں دعا کے وقت تشہد میں اشارہ فرماتے تھے بعض میں دعا کا تذکرہ نہیں۔ بعض روایات میں اشارہ کے وقت جمیع انگلیوں کو قبض کر لیتے اور بعض میں ہے کہ خنصر بنصر کو قبض فرماتے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ حلقہ فرماتے تھے اور بعض میں اس کے خلاف ہے۔ اس لیے حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ احادیث واردہ فی رفع السبابہ مضطرب ہیں۔

فائدہ علّامہ شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث مضطرب وہ ہے کہ سند حدیث یا متن حدیث میں راوی سے اختلاف واقع ہو۔ اس کی کئی صورتیں ہیں یا تو زیادتی، نقصان، تقدیم، تاخیر یا ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی یا ایک متن کی جگہ دوسری

متن ہوگئی ہو۔ مضطرب حدیث کا حکم یہ ہے کہ اولاً توفیق کی جائے گی اگر نہ ہو سکے تو توقف ہوگا
امام ربانی مجدد الف ثانی نے فرمایا کہ یہاں توفیق ممکن نہیں ہے کیونکہ اکثر روایات میں لفظ کان
موجود ہے جو غیر مناطقہ کے نزدیک حروف کلیہ میں سے ہے۔ لہذا موافقت ممکن نہیں ہے۔

اگر سائل کہے کہ کتب حنفیہ میں رفع سبابہ کے جواز پر فتویٰ دیا گیا ہے جیسا کہ شیخ ابن ہمام
اور صاحب مراقی الفلاح نے ذکر کیا ہے اور عدم جواز پر بھی فتویٰ ہے۔ لہذا دونوں صورتوں کو جائز
کہنا چاہیئے تھا۔

اس کا جواب امام ربانی مجدد الف ثانی نے یہ دیا ہے کہ جب علت اور حرمت، جواز اور
عدم جواز کا تعارض ہو جائے تو ترجیح جانب عدم جواز اور حرمت کو ہوگی۔ لہذا اشارہ کرنا حرام ہوگا۔
حضرت مجدد الف ثانی نے شیخ ابن ہمام کی بھی تردید کی ہے۔

حاصل کلام حضرت شیخ مجدد الف ثانی کا یہ ہے کہ اشارہ بوقت تشہد حرام ہے کیونکہ حدیث
میں اضطراب ہے اور جن فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ اشارہ کرنا چاہیئے انہوں نے روایت نادرہ
کا ذکر کیا ہے جو کہ ظاہر مذہب کے خلاف ہے اور ظاہر روایت اور نادر روایت کا جب
تعارض ہو تو ترجیح ظاہر روایت کو ہوتی ہے اور ظاہر روایت ہی قابل عمل ہوتی ہے باوجودیکہ مبنی
صلوٰۃ کا نہایت سکون و اطمینان پر ہے لہذا اشارہ نہیں کرنا چاہیئے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک امام مسجد جو کہ قرأت بھی غلط پڑھتا ہے
اور داڑھی بھی کترواتا ہے اور اہل بیت کا بھی گستاخ ہے۔ گانا بجانا بھی سنتا ہے۔ ایک اور
امام مسجد ہے جس نے نکاح پر نکاح پڑھایا ہے ان دونوں کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔
شرعی حکم تحریر فرمایا جائے۔

سائل، محمد ذاکر الحسن حیدری قصور شہر۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں دونوں اماموں کے پیچھے نماز حرام ہے۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے اگر امام قرآن مجید غلط پڑھتا ہے تو نماز ہی ایسے امام کے پیچھے باطل ہے۔ (فتاوی رضویہ صد ۲۱۹) اور داڑھی کترواناکہ قبضہ سے کم ہو جائے ناجائز اور فسق و گناہ ہے۔

وگذاشتن آں بقدر قبضہ واجب است (لمعات) کہ داڑھی کا ایک قبضہ رکھنا واجب ہے اور جو کترواتا ہے وہ فاسق ہے اور فاسق کے پیچھے نماز حرام ہے اور اہل بیت کا گستاخ خارجی ہے جس کے پیچھے نماز ہی جائز نہیں کیونکہ اہل بیت کی محبت فرض ہے اور گانا بجانا بھی حرام ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نوراللہ مرقدہٗ نے بھی "احکام شریعت" صد ۶ میں گانے بجانے کو حرام لکھا ہے اور گانے بجانے کا مرتکب فاسق اور گنہگار ہے۔

مذکورہ امام جس میں مذکورہ عیوب بیان کیے گئے ہیں اس کے پیچھے ہرگز نماز جائز نہیں ہے تاوقتیکہ وہ گناہ سے توبہ علی الاعلان اور قرآن کو صحیح پڑھنے اور اپنے اعتقاد کو بھی صحیح یعنی مذہب اہل السنّت والجماعت کے مطابق کرے پھر امام بن سکتا ہے ورنہ نہیں اور منکوحہ عورت کا نکاح پڑھانا بھی حرام ہے کیونکہ منکوحہ عورت کی حرمت نص قطعی قرآن سے ثابت ہے۔ والمحصنت من النساء

والمحصنت من النساء۔ کہ شادی عورتوں کے ساتھ بھی نکاح حرام ہے۔ ایسے امام کے لیے بھی توبہ علی الاعلان واجب ہے۔ اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں کہ اس کو امام بنانا جائز نہیں ہے جب تک توبہ نہ کرے۔ (فتاویٰ رضویہ صد ۱۴۴)

لہٰذا یہ مذکورہ امام بھی جب تک توبہ علی الاعلان نہ کرے اس وقت تک اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ دیوبندی اور وہابی امام مسجد کے پیچھے نماز جائز ہے کہ نہیں اور اگر جائز نہیں تو پڑھنے والے کے لیے کیا حکم ہے۔

السائل: محمد صادق وفاروڈ کوئٹہ۔ صوبہ بلوچستان۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں دیوبندی اور وہابی امام کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ فتاوی رضویہ میں ہے کہ ان وہابیہ کے پیچھے نماز محض باطل ہے۔ فتح القدیر میں ہے:

الصلوٰۃ خلف اھل الاھواء لا تجوز۔

یعنی مذاہب باطلہ کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔ (فتاو

فتاویٰ رضویہ صد ۱۷ پر یوں مرقوم ہے:

"اور جب امام مسجد وہابی المذہب ہو اور اسے منع کرنے اور امامت سے باز رکھنے پر قدرت نہ ہو تو سنی المذہب کو چاہیئے کہ اس مسجد کو چھوڑ کر چلا جائے اور دوسری مسجد میں جس کا امام ایسے خبائث سے پاک ہو نماز پڑھے۔"

فتاویٰ نظامیہ صد ۲۱ میں ہے کہ جو لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکار ہیں ان کا مذہب باطل ہے۔ ان کے پیچھے اہل السنت والجماعت کی نماز جائز نہیں ہے اور جس سنی نے وہابیہ اور وہابنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اس کو چاہیئے کہ جتنی نمازیں پڑھی ہیں ان کا اعادہ کرے۔ کیونکہ ان وہابیہ اور دیوبندیہ کے پیچھے اہل السنت والجماعت کی نماز ہرگز نہیں ہوتی۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ماہ رمضان شریف میں امام وتر پڑھا رہا ہے اور مقتدی نے سمجھا کہ تراویح پڑھا رہا ہے۔ مقتدی نے تراویح کی

نیت کرلی۔ کیا یہ اقتدا صحیح ہے یا نہیں۔ مقتدی کی یہ نماز تراویح بنے گی یا وتر۔ جواب تحریر فرمائیں۔

ایک سائل پسرور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مذکورہ میں نہ وتر ہوں گے اور نہ ہی تراویح۔ کیونکہ وتر میں صرف نیت شرط نہیں بلکہ تعین نیت شرط ہے۔ تعین کا مطلب یہ ہے کہ تعین کرے کہ نماز وتر پڑھ رہا ہوں۔

درمختار میں ہے:

ولا بد من التعیین عند النیت لفرض - و واجب انہ وتر او نذر۔

اور فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

الواجبات والفرائض لا تتادی بمطلق النیۃ اجماعاً

جب مقتدی نے وتر کا تعین نہیں کیا تو لہذا نماز وتر نہ ہوں گے۔ صاحب فتاویٰ واحدی جزئیہ صریحہ کے متعلق لکھتے ہیں:

الظاھر انہ لا یسقط عن ذمۃ لعدم وجود النیۃ التعیین المشروط فی اداء الواجب۔ اور تراویح بھی نہ ہوں گی۔ والاصح انہ لا یصح اور اصح یہی ہے کہ تراویح بھی نہ ہوں گی۔ (فتاویٰ واحدی صہ ۱۹۴)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اس میں جمعہ جائز ہے یا نہیں اگر پڑھا جائے تو احتیاط الظہر پڑھنی چاہیئے یا کہ نہیں۔

چودھری غلام حیدر بمقام بھدر تحصیل نوشہرہ ضلع گوجرانوالہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

گاؤں اور دیہات میں جمعہ ناجائز ہے۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے دیہات میں جمعہ

ناجائز ہے اگر پڑھیں گے تو ظہر ذمہ سے ساقط نہیں ہوگی اور صرف جمعہ پڑھنے والے گنہگار ہونگے۔

صلوٰۃ العید فی القریٰ تکرہ تحریما ای لانہ اشتغال بما لا یصح لان المصر شرط الصحۃ فالجمعۃ اولیٰ لان فیہا مع ذالک اما ترک الظہر وھو فرض او ترک جماعۃ وھی واجبۃ۔

نماز عید گاؤں میں پڑھنا مکروہ تحریمہ ہے کیونکہ نماز عید کے لیے شہر ہونا شرط لازمی ہے۔ پس جمعہ کا گاؤں میں پڑھنا بطریق اولیٰ مکروہ ہوگا کیونکہ جمعہ کے لیے بھی شہر شرط ہے۔ پھر جمعہ کی ادائیگی میں ظہر کا چھوڑنا جو کہ فرض ہے لازم آئے گا یا ظہر کی جماعت جو کہ واجب ہے اس کا ترک ہوگا لہٰذا گاؤں میں جمعہ نہیں پڑھا جائے گا۔ البتہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر عوام کسی گاؤں میں جمعہ پڑھتے ہیں تو ہم ان کو منع نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی گاؤں میں شروع کے لیے کہیں گے اور گاؤں والوں کے لیے ضروری ہے کہ بعد از نماز جمعہ نماز ظہر بھی پڑھیں کیونکہ گاؤں والوں پر نماز ظہر یقیناً اور حتماً فرض ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ جمعہ کے خطبہ میں سامعین کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خاموشی سے خطبہ سنیں۔ کیا یہی حکم خطبہ عید کا بھی ہے کہ سامعین خاموش ہو کر سنیں۔

سائل فقیر اللہ ظفروال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جمعہ کے خطبہ میں سامعین پر لازم ہے کہ خاموشی سے سنیں لیکن عید میں اگر امام تکبیرات پڑھتا ہے تو مقتدی اور سامعین بھی تکبیرات پڑھیں۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

اذا کبر الامام فی الخطبۃ یکبر القوم معہٗ۔ کہ جب امام تکبیر کہے تو قوم (لوگ)

بھی اس کے ساتھ تکبیر کہے۔

یعنی خطبہ عید میں لوگ امام کے ساتھ تکبیریں کہیں اور خطبہ جمعہ خاموشی سے سنیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ چلتی ریل گاڑی میں نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں۔

ایک سائل۔ نارووال۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

ریل گاڑی اگر چل رہی ہو تو اس میں نماز فرض نہیں پڑھنی چاہیئے۔ اگر خطرہ ہے کہ وقت نکل جائے گا تو پھر نماز فرض پڑھ لی جائے بعد میں اعادہ کرلیا جائے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں کہ اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تو ریل میں سب نمازیں جائز ہیں اور اگر چلتی ہے تو صبح کی سنتوں کے علاوہ سب سنّت ونفل جائز ہیں مگر فرض و وتر یا صبح کی سنتیں نہیں ہوسکتی ہیں اور اہتمام یہی کرے ٹھہری میں پڑھے اور اگر نہ ٹھہرے اور دیکھے کہ وقت جاتا ہے پڑھ لے اور جب ٹھہرے پھر پھیر لے۔

(فتاوٰی رضویہ ص ۱۹۶)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

باب الجنائز

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی مسلمان فوت ہوگیا ہے۔ اس کے

جنازہ کے لیے اعلان جائز ہے یا نہیں۔

محمد اشرف۔ آزاد کشمیر میر پور۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نماز جنازہ کے لیے اعلان کرنا جائز ہے۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں؛

ولا بأس باعلام الناس بموته۔ یعنی میت کی موت کا اعلان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ حسن بن عمار بن علی لکھتے ہیں؛

بل یستحب لتکثیر المصلین علیه لما روی الشیخان انه صلی اللہ علیه وسلم نعی لاصحابه النجاشی فی الیوم الذی مات فیه و انه نعی جعفر بن ابی طالب و زید بن حارثه وعبد اللہ بن رواحة وقال فی النهایة ان کان عالما او زاهدا او ممن یتبرک به فقد استحسن بعض المتاخرین النداء فی السوق بجنازته وهو الاصح وکثیر من المشائخ لم یر و بأسا بان یؤذن بالجنازة لیو دی اقاربه واصدقاء ه حقه۔ (مراقی الفلاح ص۹۵)

بلکہ اعلان کرنا مستحب ہے تاکہ جنازہ میں کثیر لوگ شرکت کرسکیں۔ بخاری اور مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے نجاشی کی وفات کے متعلق صحابہ کرام کو آگاہ فرمایا اور حضرت جعفر طیار اور زید بن حارثہ اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم جب ۸ھ بمقام موتہ (شام) میں شہید ہوئے تو حضور علیہ السلام نے ان کی شہادت کے متعلق بھی لوگوں کو مطلع فرمایا اور صاحب نہایہ فرماتے ہیں اگر کوئی عالم یا پرہیزگار یا بابرکت آدمی فوت ہوجائے تو علماء متاخرین نے اس کے جنازہ کے لیے بازاروں میں اعلان کرنے کو بھی مستحسن فرمایا ہے اور یہی بات اصح ہے اور کثیر مشائخ اس میں کوئی حرج تصور نہیں کرتے تاکہ میت کے اقربا

اور دوست جمع ہو کر میت کے حقوق کی ادائیگی کریں۔ معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کے لیے اعلان کرنا درست ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں کہ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سبز گھاس اور درخت قبرستان سے کاٹنے جائز ہیں یا نہیں۔ ہمارے گاؤں میں لوگوں کا آپس میں تنازعہ ہے۔ لہذا آپ شرعی حکم تحریر فرمادیں تمام لوگ کہتے ہیں کہ دربار عالیہ علی پور شریف سے جو حکم آئے گا ہمیں قبول ہے۔

امانت علی امام مسجد چونڈہ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

درخت اور سبز گھاس قبرستان سے کاٹنا منع ہے۔

وکرہ قلع الحشیش الرطب وکذا الشجر من المقبرۃ لانہ مادام رطبا یسبح اللہ تعالیٰ فیونس المیت وتنزل بذکر اللہ تعالیٰ الرحمۃ ولا بأس بقلع الیابس منہا ای الحشیش والشجر لزوال المقصود۔

(مراقی الفلاح ص۱۰۳)

سبز گھاس کاٹنا مکروہ ہے اور اسی طرح قبرستان سے درخت کاٹنا بھی مکروہ ہے کیونکہ جب تک یہ خشک نہیں ہوں گے اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھیں گے، میت کو آرام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوگا اگر خشک ہو جائیں تو پھر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اب مقصود باقی نہیں رہا۔

صورت مستفسرہ میں جب درخت اور گھاس سبز ہے تو اس کا کاٹنا ناجائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حضرت آدم علیہ السّلام کی قبر مبارک کہاں ہے۔ ایک دو مولوی صاحبان سے میں نے یہ بات دریافت کی ہے لیکن انہوں نے کوئی تسلّی بخش جواب نہیں دیا۔ لہذا آپ کی خدمت میں یہ مسئلہ بھیج رہا ہوں۔ آپ جواب باحوالہ تحریر فرمائیں تاکید ہے۔ جوابی لفافہ ارسال خدمت ہے۔

محمد عظیم خاں ٹیکسلا۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

حضرت آدم علیہ السّلام کا مزار اقدس مسجد خیف اور منیٰ میں واقع ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی ص ۲۴۹ میں لکھتے ہیں:

ابوالشیخ از مجاہد آوردہ کہ قبر حضرت آدم در موضع منیٰ است۔ در مقام مسجد الخیف وقبر حضرت حوا علیہا السّلام در جدہ است۔

اور فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السّلام کا جنازہ حضرت جبریل نے پڑھایا اور چار تکبیریں کہیں اور آپ کی مزار اقدس کوہانی شکل پر بنائی گئی جیسا کہ امام دار قطنی نے اپنی سنن میں ابنِ عباس سے روایت کی ہے۔ وسنّم قبرہٗ یعنی قبر بر صورت کوہان شتر بنائی گئی اور آپ کی وفات پر سات دن متواتر حضرت حوا علیہا السلام نے گریہ کیا۔ آپ جب دنیا سے تشریف لیگئے تو آپ کی نسل سے چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ حضرت قتادہ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضرت آدم نے تمام عمر میں (جب دنیا میں تشریف لائے) زمین کا پانی نہیں پیا بلکہ بارش کا پانی استعمال فرماتے تھے۔ ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ تمام سے پہلے اشرفی، درہم و دینار کی ایجاد بھی حضرت آدم علیہ السّلام کی ہے۔

حضرت آدم علیہ السّلام کی وفات جزیرہ ہند میں ہوئی پھر آپ کے صاحبزدگان (ایک صد پچاس ۱۵۰) نے آپ کو مکّہ مکرمہ میں نقل کیا اور متصل کعبہ آپ کا جسم مبارک رکھا گیا اور

جبریل نے جنازہ پڑھلیا اور پھر آپ کو مسجد خیف میں دفن کیا گیا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جب کوئی آدمی مرنے کے قریب ہو اس کے پاس سورہ یسین پڑھی جائے تو اس کو کچھ فائدہ ہے یا نہیں؟

حافظ غلام محی الدین۔ منگلا ڈیم۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جو شخص قریب المرگ ہے اور سفر آخرت کی تیاری میں ہے اس کے پاس سورہ یسین اور سورہ رعد کا پڑھنا مستحب ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ جب قریب المرگ اور مریض کے پاس سورہ یسین پڑھی جائے تو وہ سیراب ہو کر مرتا ہے اور اسی وقت جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ المتوفی ۷۸ھ فرماتے ہیں: جس کے پاس سورہ رعد پڑھی جائے اس کی روح آسانی سے نکلتی ہے۔

معلوم ہوا کہ قریب المرگ کے پاس سورہ یسین اور سورہ رعد کی تلاوت مستحب اور مسنون ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ میت کو صندوق میں داخل کر کے دفن کرنا جائز ہے یا نہیں۔

مولوی غلام حسین

خطیب ٹھٹھڑ والی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

چونکہ شریعت میں بوقت ضرورت میت کو صندوق میں رکھ کر دفن کرنا جائز ہے۔ اس لیے صورت مسئولہ میں صندوق میں میت کو دفن کرنا جائز ہے۔ در مختار میں کتاب الجنائز کے تحت ہے:

ولا بأس باتخاذ تابوت ولو من حجر او حدید (له عند الحاجة) کرخاوة الارض۔

کہ تابوت (صندوق) خواہ پتھر یا لوہے یا لکڑی کا ہو، بوقت ضرورت جائز ہے جیسا کہ زمین کا نرم ہونا وغیرہ۔

شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں،

واتخاذ التابوت للمیت حتی قالوا اتخذوا تابوتا من حدید لم اراءبه بأساً فی هذه الدیار۔ (مبسوط سرخسی صـ ۶۲ باب الجنازہ)

کہ تابوت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام بیہقی کی وفات ۴۵۸ھ کو نیشاپور میں ہوئی اور آپ کو تابوت میں رکھ کر بیہق میں لائے اور خسروجرد میں دفن کیا۔ ثابت ہوا کہ تابوت میں رکھ کر دفن کرنا جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ قبرستان میں ایک جگہ پر قبر کھودی گئی۔ وہاں پر قبر نکل آئی۔ اب کیا کیا جائے۔ کیا پھر علیحدہ قبر اس میت کے لیے نکالی جائے یا اسی جگہ اس میت کو بھی دفن کر دیا جائے۔

سائل، نذیر احمد

الجواب بعونہ تعالیٰ

قبر نکالتے ہوئے جو قبر ظاہر ہوئی ہے اس میں جو میت ہے، اگر یقین ہے کہ اس کی ہڈیاں مٹی ہو گئی ہیں تو دوسری قبر نکالنے کی ضرورت نہیں ہے اسی میں اس کو دفن کر دیا جائے۔ اگر ہڈیاں موجود ہیں تو ان کو جمع کر کے اس میت اور ہڈیوں کے درمیان چھوٹی سی دیوار اور روک بنا دی جائے۔ اگر میت کا جسم ابھی صحیح ہے تو پھر نئی قبر نکالی جائے جس میں اس میت کو دفن کیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷ میں ہے:

ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ۔

کہ میت اگر بوسیدہ ہو کر مٹی ہو گئی ہے، ہڈیاں نہیں رہیں تو پھر دوسری میت کا دفن کرنا جائز ہے۔

رد المحتار ص ۲۲۴ ج میں ہے:

الا ان یوجد فتضم عظام الاول ویجعل بینہما حاجز من تراب۔

اگر ہڈیاں موجود ہیں تو پھر ان کو ایک طرف جمع کر دیا جائے اور درمیان میں دیوار بنا دی جائے پھر میت کو دفن کیا جائے۔ بہر نوع صورت مذکورہ میں اگر ہڈیاں وغیرہ نہیں ہیں تو پھر اسی قبر میں اس میت کو دفن کر دیا جائے۔ اگر ہڈیاں ہیں تو پھر ہڈیوں کو ایک طرف جمع کر کے دونوں کے درمیان روک بنا دی جائے اور میت کو دفن کیا جائے۔ اگر میت کا جسم صحیح ہے تو پھر اس کے لیے علیحدہ قبر نکال لی جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ پڑھنے کے بعد سلام پھیرنا شریعت میں ثابت ہے یا نہیں اور پھر بعد از نماز جنازہ دعا مانگنی بھی شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں وہابی اور دیوبندی مولوی کہتے ہیں کہ نہ سلام پھیرنا ثابت

ہے اور نہ ہی دعا مانگنی جائز ہے۔ جواب بمعہ حوالہ جات کتب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: سید افتخار حسین شاہ۔ قلعہ سوبھا سنگھ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

۱۔ نماز جنازہ پڑھنے کے بعد سلام بھی پھیرنا چاہیئے۔ حدیث پاک میں ہے:

حضرت امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو امامۃ سے روایت کرتے ہیں: والتسلیم عند الآخرۃ (نسائی ص۲۸۱) کہ آخری تکبیر کے بعد سلام پھیرا جائے۔ اور امام بخاری فرماتے ہیں:

باب التکبیر علی الجنازۃ اربعا وقال حمید صلی بنا انس فکبر ثلاثا ثم سلم فقیل لہ فاستقبل القبلۃ ثم کبر الرابعۃ ثم سلم (بخاری ص۱۷۸)

باب نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہنا اور حمید نے کہا کہ انس رضی اللہ عنہ نے ہم کو نماز جنازہ پڑھائی تو تین تکبیریں کہیں اور سلام پھیر دیا۔ ان سے کہا گیا تو وہ قبلہ رو ہوئے اور چوتھی تکبیر کہی پھر سلام پھیر دیا۔

ان احادیث سے صاف اور ظاہر ثابت ہوا کہ نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیرنا چاہیئے۔ اگر وہابیہ یہ کہتے ہیں کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیرنا ثابت نہیں تو ان کی صریح جہالت ہے جبکہ صحاح ستہ میں احادیث سلام پھیرنے کی موجود ہیں۔

۲۔ نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنی بھی جائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

محدث عبد الرزاق اپنی سند کے ساتھ عبد اللہ بن عمر عن نافع سے روایت کرتے ہیں:

قال کان ابن عمر اذا انتہی الی جنازۃ قد صلی علیہ دعا وانصرف ولم یعد الصلوۃ۔

کہ ابن عمر ایک جنازہ پر پہنچے، نماز جنازہ پڑھی گئی تھی۔ ابن عمر نے دعا مانگی اور

لوٹ آئے اور نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جنازہ پر پہنچے تو نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی تھی۔ آپ نے دوبارہ جنازہ نہیں پڑھا بلکہ صرف اس کے لیے دعا فرمائی۔

(جوہر النقی فی رد البیہقی ص ۲۷۷)

مبسوط ج ۲ ص ۶۷ میں ہے:

ولنا ما روی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما و ابن عمر رضی اللہ عنہ انہما فاتتہما الصلوٰۃ علی جنازۃ فلما حضرا ما زادا علی استغفار له و عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فاتته الصلوٰۃ علی جنازۃ عمر فلما حضر قال ان سبقتمونی بالصلوٰۃ علیہ فلا تسبقونی بالدعاء۔

کہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی گئی ہے کہ ان سے ایک جنازہ پر نماز فوت ہوگئی۔ پس جب دونوں حاضر ہوئے تو انہوں نے صرف اس کے لیے دعا مغفرت کی اور حضرت عبداللہ بن سلام سے عمر فاروق کے جنازے پر نماز فوت ہوگئی۔ جب آپ حاضر ہوئے تو عبداللہ بن سلام نے لوگوں سے کہا کہ اگر تم مجھ سے پہلے نمازِ جنازہ پڑھ چکے ہو تو دعا میں مجھ سے پیش رفت نہ کرو۔

یعنی جب عبداللہ بن سلام نے دیکھا کہ یہ لوگ نمازِ جنازہ پڑھ چکے ہیں اور دعا بھی مانگنے لگے ہیں تو فرمایا نماز تو مجھ سے پہلے پڑھ چکے ہو دعا میں مجھے بھی شریک کر لو معلوم ہوا کہ نمازِ جنازہ میں صرف دعا مانگنی صرف جائز ہی نہیں بلکہ سنت صحابہ کرام بھی ہے لہٰذا دعا مانگنی چاہیئے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و فقہ و مفتیان شرع متین کہ:

۱- مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والے قادیانی یا لاہوری مسلمان ہیں یا کافر۔

۲- ان کو مسلمان سمجھنے والے کیسے ہیں، قادیانی یا لاہوری مرزائیوں کی نماز جنازہ پڑھنی یا پڑھ یا پڑھانی جائز ہے کہ ناجائز۔

نیز نماز جنازہ پڑھنے یا پڑھانے والوں کو کوئی سزا یا کفارہ تو ادا نہیں کرنا پڑے گا بعض لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔

مذکورہ سوالات کے جوابات شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ حنفیہ کی روشنی میں فتویٰ کی صورت میں حل فرماویں۔

سائل، محمد علی مستری آرے والا۔ نارووال ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

قانون شریعت اسلامیہ اور قانون پاکستان کے مطابق قادیانی مرزائی جو مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں مطلقاً کافر ہیں۔ اسی طرح لاہوری جو کہ مرزا کو مجدد مانتے ہیں بھی قطعاً کافر ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر، مرتد، خارج از اسلام ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

ومن قال بعد نبینا نبی یکفر لانہ انکر النص۔

جو شخص ہمارے نبی کے بعد کسی اور کو نبی تسلیم کرے وہ کافر ہے کیونکہ وہ نص قطعی کا منکر ہے اور نص قطعی کا منکر کافر ہے۔ تفسیر روح البیان میں ہے:

ومن ادعی النبوۃ بعد موت محمد لا یکون دعواہ الا باطلاً۔

اور جس شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا وہ جھوٹا اور کذاب ہے چونکہ مرزائی تمام کافر ہیں جو ان کو مسلمان سمجھے وہ بھی کافر ہے۔ جن لوگوں نے ان کو مسلمان سمجھ کر جنازہ پڑھا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ وہ اپنے ایمان اور نکاح کی تجدید کریں اور جن لوگوں نے ان کا جنازہ ان کو غیر مسلم سمجھتے ہوئے پڑھا ہے ان کا یہ جنازہ پڑھنا بھی ممنوع اور حرام اور ناجائز ہے ہے لانہا غیر مشروعۃ لقولہ تعالیٰ ولا تصل علیٰ احد منہم مات ابداً۔

اگر کافروں سے کوئی مر جائے تو اس کا جنازہ نہ پڑھے اور جنازہ میں شرط اوّل میّت کا مسلمان ہونا ہے۔ فتاویٰ شامیہ میں ہے:

وشرطها اسلام المیت

کہ میّت کا مسلمان ہونا نماز جنازہ کے لیے شرط ہے اور مرزائی چونکہ کافر ہیں لہذا ان کا جنازہ پڑھنا ناجائز ہے۔ جن لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی ہے ان کو چاہیئے کہ توبہ علی الاعلان کریں اور احتیاطاً اپنے نکاح اور ایمان کی یہ لوگ بھی تجدید کریں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلہ میں کہ میت کو جب قبر میں دفن کر دیا گیا ہے بعد از دفن بھی تلقین ہو سکتی ہے یا نہیں۔ کیا تلقین قبر پر شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

منگلا کالونی

الجواب بعونہ تعالیٰ

مرنے کے بعد جب میّت کو قبر میں دفن کیا جائے تو قبر پر بھی تلقین جائز ہے۔ ایک آدمی قبر پر کھڑا ہو جائے اور یہ کہے کہ اے فلاں (میّت کا نام لے)، اپنا دین یاد کر جس پر تو دنیا میں تھا اور گواہی دے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں صلی اللہ علیہ وسلّم۔ (مراقی الفلاح صـ۱۰۵)

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس کی ماں کا بھی نام لے کہ اے فلاں بن فلانۃ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کہ اگر میّت کی ماں کا نام یاد نہ ہو تو حضور علیہ السّلام نے فرمایا کہ حضرت حوا علیہا السّلام کا نام لیا جائے کیونکہ وہ تمام کی ماں ہیں۔ لہذا قبر پر کھڑے ہو کر بھی تلقین جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی مرگیا ہے جس نے نماز فریضہ کبھی نہیں پڑھی تھی یعنی تارک الصلوٰۃ تھا۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں۔

محمد شریف۔ ساہیوال

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اس بے نماز مسلمان مرنے والے کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ کیونکہ تارک الصلوٰۃ شرعاً فاسق و فاجر ہے اور اہل السنت والجماعت کے نزدیک اگر کوئی مسلمان فاسق و فاجر مرجائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھنی چاہیئے۔ شرح عقائد صلا۱۱ میں ہے:

ویصلی علی کل بر و فاجر اذا مات علی الایمان للاجماع

اور جماع یعنی جو فاسق و فاجر ایمان پر مرا ہے اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اس پر تمام کا اتفاق ہے اور حدیث پاک میں ہے:

لا تدعوا الصلوٰۃ علی من مات من اھل القبلۃ۔

جو اہل قبلہ سے مرجائے اس پر نماز جنازہ نہ چھوڑو۔

صورت مسئولہ میں اگر تارک الصلوٰۃ مسلمان صحیح العقیدہ تھا اور فاسق و فاجر تھا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اگر عقیدہ صحیح نہ تھا یعنی وہ گستاخ رسول یا صحابہ اور اولیاء کا تھا تو ایسے عقیدہ باطلہ والے کے جنازہ پر نماز نہ پڑھی جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلہ میں کہ عورت مرجائے تو اس کا خاوند اس کو دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

نور محمد۔ شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر عورت فوت ہوگئی ہے تو مرد اس کا منہ دیکھ سکتا ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

اگر عورت فوت ہوگئی ہے تو مرد اس کو نہ چھو سکتا ہے اور نہ ہی اس کو غسل دے سکتا ہے البتہ اس کا منہ دیکھ سکتا ہے اور جو لوگوں میں مشہور ہے کہ مرد نہ عورت کے جنازے کو کندھا دے سکتا ہے اور نہ قبر میں اتار سکتا ہے اور نہ منہ دیکھ سکتا ہے یہ غلط ہے۔ صرف غسل دینے اور اسکے بدن کو بلا حائل ہاتھ لگانے کی ممانعت ہے۔ چہرہ دیکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔ لہذا اگر عورت فوت ہوگئی ہے تو اس کا مرد منہ دیکھ سکتا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قبر پر گنبد بنانا جائز ہے یا نہیں اور قبر کو پختہ کرنا بھی جائز ہے یا نہیں۔

صاحبزادہ عاشق حسین۔ سجادہ نشین بنی شریف ضلع گجرات۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اولیاء کرام و مشائخ کے مزارات پر گنبد بنانا جائز ہے تاکہ ان کی عزت وعظمت کا اظہار ہو۔ درحقیقت اولیاء کرام کی تعظیم وعزت دین اسلام کی عزت ہے لہذا ان کی قبروں پر گنبد بنانے جائز ہیں۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

وقیل لا یکرہ البناء اذا کان المیت من المشایخ والعلماء والسادات

اگر میت مشایخ اور علماء اور سادات کرام میں سے ہو تو ان کی قبروں پر عمارت بنانا مکروہ نہیں ہے اور علامہ طحاوی لکھتے ہیں:

وقیل لا بأس بہ وھو المختار۔

یعنی گنبد بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہی مختار اور پسندیدہ ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ آخر زمانے میں چونکہ عام لوگ ظاہر بین رہ گئے ہیں لہذا مشائخ اور صلحاء کی قبروں پر عمارت بنانے میں مصلحت دیکھ کر زیادتی کر دی تاکہ مسلمانوں اور اولیاء اللہ کی ہیبت ظاہر ہو۔ خاصکر ہندوستان میں کہ یہاں ہندو اور کفار بہت سے دشمنان دین ہیں۔ ان مقامات کی بلندی شان کفار کے مرعوب ہونے اور تابعداری کا ذریعہ ہے۔ بہت سے کام پہلے مکروہ تھے اور آخر زمانہ میں مستحب ہو گئے۔ (شرح سفر سعادت)

شاہ عبدالحق کی کلام سے معلوم ہوا کہ اولیاء کے مزارات پر گنبد بنانے میں اسلام کی عزت ہے اور اس میں کسی قسم کا حرج نہیں ہے۔ رئیس الحنفیہ علی قاری لکھتے ہیں:

قد اباح السلف البناء علی قبور المشائخ والعلماء المشهورین لیزورهم الناس ولیستریحوا بالجلوس۔

علماء سلف نے مشائخ اور علماء کی قبروں پر عمارات بنانا جائز فرمایا ہے تاکہ ان کی لوگ زیارت کریں اور وہاں بیٹھ کر آرام پائیں۔ تفسیر روح البیان میں ہے:

فبناء قباب علی قبور العلماء والاولیاء والصلحاء امر جائز اذا کان القصد بذالك التعظیم فی اعین العامة حتی لا یحتقروا صاحب هذا القبر

علماء اور اولیاء صالحین کی قبروں پر عمارات بنانا جائز کام ہے جبکہ اس سے مقصود لوگوں کی نگاہوں میں عزت پیدا کرنا ہو تاکہ لوگ اس صاحب قبر کو حقیر نہ سمجھیں۔ امام شعرانی میزان باب الجنائز میں لکھتے ہیں:

مع قول ابی حنیفه یجوز ذالك

کہ ابو حنیفہ کے نزدیک قبر پر گنبد بنانا جائز ہے۔ فقہاء، مفسرین اور بالخصوص ابو حنیفہ کے قول سے یہ ثابت ہوا کہ مزارات اولیاء پر گنبد بنانا جائز ہے اور حدیث میں جو

عمارت اور گنبد بنانے سے منع کیا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ عمارت اس طرح نہ بنائی جائے کہ قبر دیوار میں شامل ہو جائے - کیونکہ حدیث پاک کے یہ لفظ ہیں :

ان یبنی علیہ -

یعنی قبر پر عمارت بنانا منع ہے کہ دیواروں کو عمارت اور گنبد میں شامل کیا جائے اور گنبد جو بنایا جاتا ہے وہ حول القبر یعنی قبر کے ارد گرد بنایا جاتا ہے جو کہ منع نہیں ہے - دیکھئے در مختار میں ہے :

ویکرہ الزیادۃ علیہ من التراب لانہ بمنزلۃ البناء -

قبر پر مٹی زیادہ کرنا منع ہے کیونکہ یہ عمارت بنانے کے درجہ میں ہے -

معلوم ہوا کہ قبر پر عمارت بنانا یہ ہے کہ قبر دیوار میں آجائے اور گنبد کا بنانا تو ارد گرد ہوتا ہے جو کہ ممنوع نہیں - اسی لیے تو فقہاء اور ابو حنیفہ نے اس کو جائز رکھا ہے - حدیث ابو حنیفہ اور فقہاء کے پیش نظر تھی -

باقی سوال میں جو یہ دریافت کیا گیا ہے کہ قبر کو پختہ بنانا جائز ہے - اس کا جواب یہ ہے کہ قبر کو پختہ کرنا بھی جائز ہے - حدیث پاک میں ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے عثمان[1] بن مظعون کو دفن فرمایا تو ان کی قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب فرمایا اور فرمایا :

اعلم بہا قبر اخی وادفن الیہ من مات من اھلی -

ہم اس سے اپنے بھائی کی قبر کا نشان لگائیں گے اور اس جگہ اپنے اہل بیت سے جو فوت ہوگا اس کو دفن کریں گے - (مشکوٰۃ باب الجنائز) -

بخاری کتاب الجنائز باب الجرید علی القبر میں ہے :

حضرت خارجہ[2] فرماتے ہیں ہم زمانہ عثمان میں تھے - ہم میں بڑا کودنے والا وہ تھا

---

[1] عثمان بن مظعون المتوفی ۳ھ ۱۲ - [2] حضرت خارجہ المتوفی ۳۰ھ ۱۲ -

جو کہ عثمان بن مظعون کی قبر کو پھلانگ جاتا ۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کی قبر کا تمام تعویذ پتھر کا تھا اور جو حضور علیہ السلام نے پتھر رکھا تھا وہ بھی قبر کے اندر رکھا تھا ۔ جب پتھر قبر کے اندر بھی رکھا جا سکتا ہے اور تعویز بھی پتھر کا ہو تو قبر کا پختہ بنانا بھی جائز ہے اور قبر کو اونچا کرنا تا کہ نشان باقی رہے ۔ یہ بھی جائز ہے ۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین در یں مسئلہ کہ قُل کا جو ختم انسان کے مرنے کے بعد تیسرے دن کیا جاتا ہے ۔ اس تیسرے دن کی کیا وجہ ہے ۔ با حوالہ بیان فرمایا جائے ۔

ایک سائل ۔ نونار تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

قُل کا ختم جو پڑھا جاتا ہے اس سے مقصد ایصال ثواب ہے اور ایصال ثواب شریعت اسلامیہ میں جائز ہے ۔ مشکوٰۃ شریف باب الفتن میں ہے ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

من یضمن لی منکم ان یصلی فی مسجد العشار کعتین ویقول ھذہ لابی ھریرۃ ۔

تم سے کون میرے لیے اس بات کی ضمانت اٹھاتا ہے یہ کہ مسجد عشا میں دو رکعتیں پڑھے اور کہے کہ یہ ابوہریرہ کے لیے ہیں ۔ بدنی عبادت میں اگرچہ نیابت جائز نہیں ۔ (یعنی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے نماز پڑھے تو دوسرے کی نماز نہیں ہوگی) البتہ جیسا کہ مالی عبادت کا ثواب دوسرے شخص کو بخش سکتا ہے ۔ اسی طرح بدنی عبادت کا ثواب بھی دوسرے شخص کو بخشنا جائز ہے ۔ اس حدیث سے جیسا کہ بدنی عبادت کے ثواب کا ثبوت ہوا ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ برکت کی نیت سے بزرگان دین کی مسجدوں میں نماز پڑھنا بھی باعث ثواب ہے ۔ امام احمد بن

حنبل اپنی مسند شریف میں فرماتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم لوگ اپنی اموات کے لیے دعا کرتے ہیں، ان کی طرف سے صدقہ کرتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔ کیا یہ چیزیں ان اموات کو پہنچتی ہیں تو فرمایا ضرور ان کو ملتی ہیں اور فرمایا:

ویفرحون به کما یفرح احدکم بالهدیته۔

اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ جیسے کہ تم میں سے کوئی ہدیہ سے خوش ہوتا ہے۔

حضرت سعد[1] بن عبادہ نے عرض کیا:

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میری ماں یعنی ام سعد کا انتقال ہوگیا ہے تو کونسا صدقہ سب سے بہتر ہوگا تو فرمایا پانی۔ انہوں نے ایک کنواں کھودا اور کہا:

هذه لام سعد۔ یہ کنواں ام سعد کا ہے۔

ایصال ثواب کا ثبوت قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ قرآن نے بیان کیا ہے:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام ایک آبادی میں پہنچے تو اہل قریہ نے ان بزرگوں کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے کا صاف انکار کردیا۔ جب یہ دونوں حضرات ایک بوسیدہ دیوار کے پاس پہنچے جو گرنے کے قریب تھی۔ جناب خضر نے آگے بڑھ کر اس کی مرمت شروع کردی اور اس کو درست کردیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے اس ناشکر گزار گاؤں کی ناحق خیر خواہی کی۔ اگر چاہتے تو کم از کم اس محنت کی اجرت ہی لے لیتے تو خضر نے فرمایا یہ دیوار دو یتیموں کی ملکیت ہے اس کے نیچے ایک خزانہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوئی کہ دیوار گرنے نہ پائے تاکہ خزانہ محفوظ رہے اور یہ یتیم جوان ہوکر اپنے اس موروثی سرمایہ کے

---

[1] حضرت سعد بن عبادہ المتوفی ۱۵ھ ۱۲۔

وارث ہوں۔ وجہ یہ کہ ان کا باپ ایک مرد صالح تھا (مفسرین کا بیان ہے کہ وہ مرد صالح ان یتیموں کے اجداد میں سات پشت اوپر ہو گزرا تھا)

اس واقعہ سے ظاہر ہو گیا کہ مرد صالح کا صلاح و تقویٰ کا اثر و نفع دوسروں تک پہنچ سکا اور پہنچا۔ یتیموں کی منفعت کے خیال سے اور دیوار و خزانہ کی حفاظت ان نابالغ بچوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ باپ کے عمل کا فائدہ بیٹوں کو ملا گویا کہ مرد صالح کی نیکو کاری کا فائدہ اس کو اپنی ذات کو بھی ہے اس کے طفیل میں اس کی اولاد کو بھی نفع پہنچا۔ لہٰذا ایصال ثواب میں اعمال خیر کا نفع موصل اور موصل الیہ دونوں کو پہنچتا ہے اور کسی کے حق میں کمی نہیں ہوتی۔ اسی قصہ میں ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ:

اثنائے سفر میں جناب خضر نے ایک کم سن بچے کو مار ڈالا اور وجہ یہ بتائی کہ اس بچے کے والدین خدا ترس و صالح تھے۔ یہ بچہ بڑا ہو کر فاسق و ضال ہوتا جس سے صالح والدین کے خیالات و اعمال بھی یقیناً متاثر ہوتے لہٰذا اس کو قتل کر دیا اور اس کے بدلے ایک صالح اولاد اس کے والدین کے گھر پیدا ہوگی۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ والدین کے صلاح و تقویٰ کے نتیجہ میں متوفی بچہ عذاب آخرت سے بچا لیا گیا۔ گویا کہ بلوغ کے بعد فسق و ضلالت کی وجہ سے مستحق عذاب ہوتا لیکن والدین کے صلاح و تقویٰ کی وجہ سے بچپن کی موت نے اس کو آخرت میں جنت کا حقدار بنا دیا۔ لہٰذا پہلے قصہ میں ایک کا عمل خیر دوسرے کے لیے اس دنیا میں کار آمد ہوا اور دوسرے واقعہ میں ایک کا عمل خیر دوسرے کے لیے آخرت میں نفع بخش ہوا۔ یہی ایصال ثواب کا مفہوم اور مطلب ہے کہ ایک کا عمل خیر دوسرے کے لیے نفع بخش ہو۔ فاتحہ تیجا، دسواں، چالیسواں وغیرہ اسی ایصال ثواب کے افراد ہیں۔ ان میں تلاوت قرآن جو کہ بدنی عبادت ہے اور صدقہ یعنی مالی عبادت ہے ان دونوں کو جمع کر کے ثواب پہنچایا جاتا ہے۔ وہابیہ ایصال ثواب کو تو دبی زبان سے مان لیتے ہیں لیکن فاتحہ تیجہ وغیرہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہ ایصال ثواب کے افراد ہیں گویا کہ وہابیہ افراد یا جزء ایصال

ثواب کو کلیات فرضیہ یا مثل افلاطونیہ سے تصور کرتے ہیں کہ ایصال ثواب ایسی کلی ہے جس کا کوئی فرد ہی نہیں ہے حالانکہ یہ وہابیہ کا ایک خود ساختہ عقیدہ ہے جو کہ قرآن اور حدیث کے بالکلیہ خلاف ہے۔ قرآن پاک اور حدیث میں ایصال ثواب کا ثبوت واضح طور پر موجود ہے۔ انکار جہالت اور محض تعصب ہے۔

انوار ساطعہ ص۱۴۵ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت سیدنا حمزہ کے لیے تیسرے، ساتویں، چالیسویں دن، چھٹے ماہ اور سال بھر بعد صدقہ دیا اور درّ مختار میں ہے کہ حدیث میں ہے کہ جو شخص گیارہ بار سورہ اخلاص پڑھے پھر اس کا ثواب مردوں کو بخشے تو اس کو تمام مردوں کے برابر ثواب ملے گا۔

فتاوٰی شامی میں ہے جو ممکن ہو قرآن پڑھے۔ سورہ فاتحہ، سورہ بقر کی اوّل آیات اور آیۃ الکرسی اور اٰمن الرسول اور سورہ یٰسین اور سورہ ملک اور سورہ تکاثر اور سورہ اخلاص بارہ یا گیارہ یا سات یا تین مرتبہ۔ پھر کہے یا اللہ جو کچھ میں نے پڑھا اس کا ثواب فلاں کو یا فلاں لوگوں کو پہنچا دے۔ معلوم ہوا کہ ایصال ثواب کا ثبوت قرآن اور حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال سے روزِ روشن کی طرح موجود ہے۔ بلکہ بطور عقیدہ اور تعامل ایصال ثواب امت مسلمہ میں رائج ہے اور ہر عمل خیر جس کا ثواب عامل کو پہنچتا ہے اس کا ایصال اموات کی طرف ہو سکتا ہے اور تیجا جو کہ ہے اس میں بھی ایصال ثواب ہی ہوتا ہے اور سائل نے جو قل اور تیجے کے ختم کے تیسرے دن کی وجہ پوچھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تیسرے دن عام طور پر مسلمان جمع ہو کر ایصال ثواب کے لیے فاتحہ قل وغیرہ پڑھتے ہیں یہ تیسرا دن تعزیت کا آخری دن ہے اس کے بعد سوائے غائب کے تعزیت کرنا منع ہے۔ فتاوٰی ہندیہ میں ہے:

ووقتها من حين يموت الى ثلاثة ايام ويكره بعدها الا ان يكون المعزّى او المعزّى اليه غائباً

اور ماتم پرسی کا وقت مرنے کے وقت سے تین دن تک ہے اس کے بعد

مکروہ ہے مگر یہ کہ تعزیت (ماتم پرسی) دینے والا یا لینے والا غائب ہو۔ تیسرے دن تو لوگ عام طور پر تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں۔ اسی لیے تمام لوگ جمع ہو کر ایصال ثواب کے لیے قل اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ جب تعزیت تین دن تک ہی ہے۔ سوائے غائب کے لیے اسلئے تیجا کا دن تیسرا روز مقرر کیا ہے۔ پھر تیجا کا ثبوت حدیث پاک سے بھی گزر چکا ہے۔ لہذا قل کے لیے تیسرا دن مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ تاریخ کا تعین بھی جائز ہے بلکہ شرعی طور پر ثابت ہے۔ اسی لیے تو تعزیت کی تقیید ایام ثلاثہ تک ہے۔ بعض وہابیہ اور دیابنہ ایصال ثواب کے قائل تو ہو جاتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہم تاریخ کے تعین کے مخالف ہیں حالانکہ ان کے پاس کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ نہ تو قرآن میں تعین ایام کی ممانعت ہے اور نہ حدیث و آثار صحابہ سے حرمت کا ثبوت ملتا ہے بلکہ تعین کے خلاف کسی شرعی ممانعت کا نہ ہونا تعین ایام کے لیے کافی ہے کیونکہ مجتہدین و محدثین و فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے۔ کسی چیز کی حرمت کے لیے شریعت کی طرف سے حرمت پر نص ضروری ہے کیونکہ ہر چیز مرتبہ جواز میں ہے جب تک حرمت کی تصریح نہ ہو گی حرمت ثابت نہ ہو گی پھر بھی ہم جب شرعی واجبات و فرائض پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان میں اکثر احکام کسی واقعہ سے متعلق ہیں اور ان کی تعمیل میں دن اور تاریخ اور وقت کا باقاعدہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً عید قربان، ماہ رمضان، شب قدر، جمعہ۔ اسی طرح شریعت میں اور بھی کافی امثلہ ہیں جن میں تاریخ کا تعین شارع علیہ السلام کی طرف سے کیا گیا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے۔ جب تک تاریخ کا تعین نہ کیا جائے تمام دنیاوی امور انتظامیہ سر انجام نہیں ہو سکتے۔ دیکھئے شادی اور نکاح، ولیمہ یا کسی اجتماع کے لیے تاریخ معین نہ کی جائے تو کیا یہ امور ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ لہذا تاریخ کا تعین لازمی اور ضروری ہے۔

وہابیہ اور دیابنہ بھی اپنے اجتماعات اور جو اجلاس کرتے ہیں ان کے لیے بھی تاریخ کا تعین کرتے ہیں۔ ان کو اگر اعتراض ہی ہے تو پھر وہ بلا تاریخ ہی اپنے اجتماعات کر کے دکھائیں۔ بہر صورت قل اور فاتحہ تیسرے دن صرف کرتے جائز ہی نہیں ہیں بلکہ مرنے والے

کے لیے مفید اور باعث ثواب بھی ہیں۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر میں ایک آدمی فوت ہوگیا اس کے پیرو مرشد بھی اس کے جنازہ کے لیے تشریف لائے۔ جب اُس آدمی کو دفن کرنے لگے تو ان کے پیر صاحب نے ایک شجرہ جو وہ وقت بیعت مریدوں کو دیتے ہیں اور وہ پڑھتے ہیں وہی شجرہ انہوں نے اس مرنے والے آدمی کی قبر میں سرہانے کی طرف بطور برکت رکھا ہے۔ یہ شجرہ رکھنا جائز ہے یا نہیں۔ بینوا و توجروا۔

سائلین از بڈو ملھی ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں شجرہ مبارکہ قبر میں رکھنا جائز ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ شجرہ قبر میں رکھنا بزرگوں کا طریقہ ہے لیکن اس کے رکھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ میت کے سینے پر کفن کے اندر یا کفن کے باہر رکھا جائے لیکن اس طریقہ کو فقہاء نے پسند نہیں کیا کیونکہ میت کے بدن سے خون یا پیپ نکلتے وقت بزرگوں کے نام کی بے ادبی ہونے کا اندیشہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میت کے سرہانے طاق کھود کر شجرہ اس میں رکھا جائے۔ معلوم ہوا کہ شجرہ رکھنا جائز اور بزرگان دین کا طریقہ ہے اور بہترین صورت یہی ہے کہ میت کے سرہانے جگہ کھود کر وہ شجرہ مبارکہ رکھ دیا جائے تاکہ بزرگان کے اسماء مبارکہ سے برکت بھی حاصل ہو۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ صاحب قبر کے پاس جب انسان زیارت کے لیے جائے تو اس کا طریقہ کیا ہے اور کیا پڑھا جائے تاکہ صاحب قبر متوجہ ہو؟
ایک سائل باسی والا ضلع گوجرانوالا۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جب آدمی، عام مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کے لیے جائے تو پیٹھ قبلہ کی طرف اور منہ صاحب قبر کے سینہ کی طرف کر کے سورہ فاتحہ ایک بار اور سورہ اخلاص تین مرتبہ پڑھے اور جب قبرستان میں داخل ہو یہ الفاظ کہے:

السلام علیکم یا اهل الدیار من المومنین والمسلمین لیغفر اللہ لنا ولکم وان شاء اللہ بکم لاحقون۔

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں اگر صاحب مزار صاحب ولایت یعنی ولی ہو تو منہ صاحب مزار کے سینہ کی طرف کر کے بیٹھ جائے اور اکیس مرتبہ سبوح قدوس ربنا و رب الملائکۃ والروح پڑھے اور سورہ لیلۃ القدر تین مرتبہ پڑھے اور اپنے دل کو تمام خطرات دنیاوی سے خالی کر کے مکمل توجہ اس بزرگ کی طرف منعطف کرے تو اس بزرگ کی روح کی برکتیں زائر کے دل میں پہنچیں گی اور اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ بزرگ صاحب کمال ہے یا کوئی صاحب قبر کمالیت کا مالک ہے تو ایک مرتبہ فاتحہ اور درود شریف کے بعد اکیس مرتبہ سبوح قدوس پڑھے اس کے بعد اپنا دل صاحب قبر کے سینہ کے مقابل کر کے دل کو صاحب قبر کی طرف ملتفت کرے۔ اگر اپنے دل میں سکون محسوس کرے تو سمجھ لے کہ یہ صاحب مزار صاحب کمال ہے اور صاحب مزار سے اگر مدد لینی مقصود ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ قبر کے سر کی جانب ہو کر انگلیاں قبر پہ رکھ کر سورہ بقرتا مفلحون پڑھے اور پھر پائیں قبر کی طرف آمن الرسول آخر سورہ تک پڑھے اور یہ کہے کہ اے حضرت فلانے کام کے سلسلے میں درگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہوں آپ بھی

دعا اور شفاعت سے میری امداد کیجئے۔ اس کے بعد رو بقبلہ ہو کر اپنے مطلب کی اللہ تعالیٰ سے درخواست اور عرض کرے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ انسان کے مرنے کے بعد جو لوگ میت کے ختم دلواتے ہیں۔ چاول کھانا وغیرہ پکا کر میت کے لیے میت کو ثواب پہنچاتے ہیں۔ یہ جائز ہے نہیں؟

ایک سائل از ڈسکہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

اہل السنت والجماعت کے نزدیک میت کو طعام وغیرہ کا ثواب پہنچانا جائز ہے جس کو ایصال ثواب کہا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب زبدہ صہ ۱۳۲ میں لکھتے ہیں:

شیر و برنج و نیاز فاتحہ بزرگے باقصد ایصال ثواب روح ایشاں بپزند و بخورند مضائقہ نیست۔ اگر فاتحہ بنام بزرگے دادہ شود اغنیاء را ہم خوردن جائز است۔

دودھ چاول کسی بزرگ کے فاتحہ کے لیے ان کو ثواب پہنچانے کی نیت سے پکائیں اور کھائیں تو کوئی حرج نہیں اور اگر کسی بزرگ کی فاتحہ کی جائے تو اس سے مالداروں کو بھی کھانا جائز ہے۔

شرح عقائد صہ ۱۲۳ میں ہے: زندوں کے دعا کرنے میں میت کے لیے اور ان کے صدقے دینے میں میت کی طرف سے نفع ہے واسطے میت کے اور یہی سبب ہے کہ نماز جنازہ میں میت کے واسطے دعا واقع ہوئی ہے۔ (میں نے دعا بعد از نماز جنازہ کے مسئلہ پر مستقل کتاب "السلطان القوی علی ابطال المذہب الغوی" بھی لکھی ہے)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

نمازِ عید پڑھی۔ آپ کے پاس دو مینڈھے لائے گئے۔ حضور علیہ السّلام نے ان دونوں کو ذبح کیا اور پھر ارشاد فرمایا:

اے اللہ ایک میری طرف سے قبول فرما اور ایک میری اس امت کی طرف سے جو قربانی دینے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور کی قربانی کا ثواب آپکی تمام امت کو پہنچا ہے جو اس وقت موجود تھے اور ان کو بھی پہنچ رہا ہے جو قیامت تک ہوں گے دیابنہ اور وہابیہ بعض موقع پر ایصال ثواب کا انکار نہیں کرتے لیکن وہ تیجا، دسواں اور چالیسواں وغیرہ کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں بھی مقصد ایصال ثواب ہی ہوتا ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں قرآن پاک اور درود پڑھا جاتا ہے۔ پھر تبرک طعام مٹھائی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے اور ان تمام چیزوں کا ثواب میت کو پیش کیا جاتا ہے۔

فتاویٰ عزیزیہ صفحہ ۴۱ میں ہے دوسری صورت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہیئت اجتماعیہ (یعنی جمع ہوکر) کے ساتھ قرآن کا ختم کریں اور مٹھائی یا طعام پر فاتحہ پڑھ کر حاضرین میں تقسیم کریں۔ ایسی صورت حضور اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اگرچہ عمل میں نہیں آئی لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص اس طرح کرے تو کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس سے زندوں اور مردوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے وضاحت کر دی ہے کہ اگرچہ ایک کام حضور علیہ السّلام کے زمانہ میں نہ ہو تو وہ شرعاً ناجائز نہیں ہوتا۔ ہیئت اجتماعیہ میں ایصال ثواب کرنا اگرچہ حضور علیہ السّلام کے زمانہ میں نہ تھا لیکن ایصال ثواب یقیناً تھا۔ لہٰذا اب چونکہ ایصال ثواب کے یہ تیجا، دسواں چالیسواں افراد ہیں لہٰذا جائز ہوگا۔ صرف فرق تو ہیئت اجتماعیہ کا ہے اور ہیئت اجتماعیہ پر بھی ممانعت ثابت نہیں اور اصل اشیاء میں اباحت ہے بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے ساتھ عمل شرعاً مندوب و مستحسن ہے۔ نماز میں، جمعہ میں، عیدین میں اور حج میں اجتماعی ہیئت کے ساتھ عبادت کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ ہیئت اجتماعی کوئی شرعاً قبیح نہیں ہے اور ایصالِ

ثواب پہلے ہی شرعاً ثابت ہے لہذا ہیئت اجتماعیہ کے ساتھ بھی ایصال ثواب جائز ہوگا۔ تیجا دسواں اور چالیسواں وغیرہ ایصال ثواب کے افراد اور جزئیات ہیں اور ایصال ثواب ان تمام کیلئے قائم مقام کلی کے ہے۔ کلی اپنے اجزاء کے ضمن میں ہمیشہ متحقق ہوتی ہے۔ ایصال ثواب مثل مثل افلاطونیہ سے تو نہیں کہ اس کا کوئی فرد ہی نہ ہو کیونکہ ایصال ثواب تو ایک امر شرعی ہے جس کے افراد کا وجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں بھی تھا۔ مثل افلاطونیہ کا تعلق تو مقدرات اور فرضیات کے ساتھ ہے جن کا وجود ہی نہیں۔ مثلاً لاشیٔ، لاموجود، لاممکن وغیرہ۔ ان کا کوئی فرد نہیں ہے ایصال ثواب تو نفس الامر اور امر واقعی ہے جس کے افراد یقینی ہیں لہذا جب ایصال ثواب جائز ہوا تو یقیناً تیجا، دسواں، چالیسواں اور طعام چاول وغیرہ پکا کر بزرگان دین اور اپنے اسلاف کو ثواب پہنچانا شرعاً جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الزکوٰۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے زکوٰۃ نکالی ہے لیکن زکوٰۃ کی رقم کے ساتھ کپڑے خرید کر غریبوں میں تقسیم کیے ہیں۔ کیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ بینوا توجروا۔

غلام محی الدین ۔ منگلا کالونی۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مستفسرہ میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ زکوٰۃ میں تملیک فرض ہے۔ یہاں بھی تملیک مستحق ہو گئی ہے۔ لہذا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

ادا خواہد شد زیر انچہ در ادائی مال زکوٰۃ تملیک است۔

یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی میں شرط تملیک ہے وہ موجود ہے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ صورت مسئولہ میں بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی کیونکہ تملیک پائی گئی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زکوٰۃ کی رقم ایک بار ہی دو تین فقیروں کو دی جائے تو اچھا ہے یا روپے پیسے اور آنے چونی وغیرہ میں تبدیل کر کے آہستہ آہستہ

فقیروں اور مانگنے والوں کو دیئے جائیں جیساکہ بعض دوکاندار پیسے رکھ لیتے ہیں جو فقیر آیا اس کو آنا یا دو پیسے دے دیئے۔ ان سے کونسی صورت بہتر ہے۔

محمد اسماعیل ۔ جہلم

الجواب بعونہ تعالیٰ

زکوٰۃ کی رقم ایک ایک پیسہ یا آنہ کر کے دینا جیساکہ بعض دوکاندار کرتے ہیں اور سوال میں مذکور ہے ٹھیک نہیں ہے بلکہ بہترین صورت یہ ہے کہ ایک دو یا تین فقیروں کو ان کے حال کے مطابق رقم دے دی جائے۔

نقل فی البحر عن فخر الاسلام من اراد ان یتصدق بدرھم فاشترٰی بہ فلوسا ففرقھا فقد قصر فی امر الصدقۃ لان الجمع اولٰی من التفریق ولان رفع الکثیر اشبہ بعمل الکرام فکان اولٰی قال صلی اللہ علیہ وسلم ان یحب المعالی الامور ویبغض سفسافھا وقد ذم اللہ تعالیٰ علی اعطاء القلیل فقال افرایت الذی تولّٰی واعطٰی قلیلاً ۰

بحر میں فخر الاسلام سے نقل کیا گیا ہے کہ جس نے ایک درہم صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تو اُس نے ایک درہم کے پیسے خریدے پھران کو کئی فقیروں کو دیا پس تحقیق اس نے صدقہ کے امر میں کوتاہی کی اس لیے کہ جمع تفریق سے بہتر ہے کیونکہ بہت دینا شریفوں کے عمل کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے پس یہی اولیٰ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ اونچے کاموں کو پسند کرتا ہے اور گھٹیا کاموں کو ناپسند فرماتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے تھوڑے دینے کی مذمت کی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب آپ نے اس کو نہیں دیکھا جس نے پیٹھ پھیری اور تھوڑا دیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ پیسہ پیسہ دینے سے فقیر کے حال کے مطابق اس کو یکمشت دینا بہتر اور افضل ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت محترم حضرت مولانا صاحب!

یہ مسئلہ معلوم کرنا ہے کہ زکوٰۃ اپنے حقیقی غریب بہن یا بھائی، بیٹا یا بیٹی، ماں یا باپ کو دی جا سکتی ہے یا نہیں۔

پرنسپل زاہد حسن فریدی از گورنمنٹ کالج تلہ گنگ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اپنے غریب بھائی یا بہن کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے لیکن بیٹی بیٹے اور ماں باپ کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے۔ فتاوی شامی میں ہے:

ولا الی من بینھما ای بینہ وبین المرفوع الیہ ولاد ای اصلہ وان علی کابویہ واجدادہ وجداتہ من قبلھما وفرعہ وان سفل کاولاد الاولاد۔

یعنی جن کے درمیان رشتہ اصلیت اور فرعیت کا ہے ان کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا نہ اپنے اصول ماں باپ دادہ وغیرہ اور نہ ہی اپنے فروع بیٹا بیٹی وغیرہ کو، بھائی بہن اگر صاحب نصاب نہیں ہیں اور غریب ہیں تو ان کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت جناب استاذی المکرم حضرت مولانا غلام رسول صاحب

ایک مسئلہ دریافت طلب ہے امید ہے کہ آپ جواب بمعہ حوالہ جات کتب فقہ و حدیث تحریر فرمائیں گے۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ زکوٰۃ سادات کو دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے ایک رسالہ میں پڑھا ہے کہ سادات اگر غریب ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینی جائز ہے اگر

جائز نہیں تو کوئی حیلہ بھی ہے کہ ان کو زکوٰۃ دی جائے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔

سعید الرحمٰن ضلع ہزارہ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں سیّد اگرچہ غریب ہو وہ مستحق زکوٰۃ نہیں۔ اگر سیّد کو کسی نے زکوٰۃ دی ہے تو قول مفتیٰ بہ کے مطابق زکوٰۃ ہرگز ادا نہ ہوگی۔ اسی پر ایمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد) کا اتفاق ہے۔ امام شعرانی میزان میں لکھتے ہیں؛

اتفق الایمۃ الاربعۃ علی تحریم الصدقۃ المفروضۃ علیٰ بنی ھاشم وبنی عبد المطلب وھم خمس بطون آل علی وآل عباس و آل جعفر و آل عقیل و آل الحارث بن عبد المطلب ھذا من مسائل الاجماع والاتفاق۔

ایمہ اربعہ نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کے صدقہ فرضی (زکوٰۃ وغیرہ) لینا حرام ہے اور یہ پانچ قبیلے ہیں۔ آل علی[۱]، آل عباس[۲]، آل جعفر[۳]، آل عقیل[۴]، آل حارث بن عبد المطلب۔ یہ مسئلہ ان مسائل سے ہے جن پر تمام کا اتفاق ہے۔ حدیث پاک میں ہے؛

ان ھٰذہ الصدقات من اوساخ الناس وانھا لا تحل لمحمد ولا لآل محمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم)

یہ صدقہ کا مال لوگوں کا میل کچیل ہوتا ہے محمد اور محمد کے کنبہ والوں کو یہ حلال نہیں۔
اس حرمت کے حکم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ حضور کا کنبہ، چچے، پھوپھیاں، چچیرے بھائی اور ان کی سب اولاد اور ان سب کے لونڈی غلام بھی داخل ہیں تاکہ کسی شخص کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ عالی پر کسی قسم کے وہم کا شائبہ نہ ہو۔ درمختار میں ہے؛

ثم ظاھر المذھب اطلاق المنع۔ (ج۲ ص۹۸

پھر ظاہر مذہب یہی ہے کہ بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینی مطلقاً منع ہے اور فتاوی عالمگیری صد ۱۸۹
میں ہے کہ بنی ہاشم کو زکوٰۃ نہ دی جائے اور وہ آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل اور
آل حارث بن عبد المطلب ہیں اور ان کے سوا دوسروں کو جائز ہے۔ جیسا کہ ابولہب کی اولاد کیونکہ
انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد نہیں کی۔ بہر صورت سادات کرام کو زکوٰۃ دینی قول مفتی بہ
کے مطابق منع ہے اور جو آپ نے رسالہ میں جواز کے متعلق پڑھا ہے وہ روایت ابو عصمہ
نوح بن مریم المروزی المتوفی ۱۷۳ھ نے ابوحنیفہ سے بیان کی ہے جو کہ مرجوح ہے۔
در مختار میں ہے:

الحکم والفتیا بالقول المرجوح جهل وخرق للاجماع۔

قول مرجوح کے متعلق ہم نے اپنی کتاب "القول التفقیح" میں بھی بیان کیا ہے کہ اس پر
فتوٰی دینا غیر معتمد علیہ ہے۔ بحر الرائق میں ہے:

اذا اختلف التصحيح وجب الفحص عن ظاهر الرواية والرجوع اليها۔

اور جب تصحیح میں اختلاف ہو جائے تو ظاہر الروایت کی تلاش کے بعد ظاہر روایت
کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ رد المحتار کتاب احیاء الموات میں ہے:

ماخالف ظاهر الرواية ليس مذهبنا لاصحابنا۔

جو ظاہر روایت کے خلاف ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی
نور اللہ مرقدہٗ "تجلی المشکوٰۃ" صہ۱۸ میں فرماتے ہیں:

لاجرم ملاحظہ کیجئے کہ بکثرت علماء اصحاب متون و شرح و فتاوی اپنی تصانیف عظیمہ جلیلہ
معتمدہ مثل قدوری، ہدایہ، وافی، کنز، وقایہ، نقایہ، اصلاح، ملتقی، تنویر، بدایہ،
کافی، شرح وقایہ، ایضاح، اشباہ، در مختار، طریقہ محمدیہ، حدیقہ ندیہ، خانیہ، خلاصہ،
خزانۃ المفتیین، جواہر اخلاطی، عالمگیری وغیرہا میں نوح بن مریم کی روایت کا نام تک نہیں
لیا گیا اور تمام ہی منع اور تحریم کی روشن تصریحیں کرتے آئے گیا وہ اس روایت شاذہ سے

گناہ نہ تھے یقیناً تھے مگر اسے قابل التفات نہ سمجھے۔ علماء کرام کا اس روایت کو ذکر نہ کرنا ہی مرجوح ہونے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا روایت نوح ابن مریم مرجوح ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں ہے اور نہ ہی اس پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ حضرت تجلّی المشکوٰۃ میں ہی لکھتے ہیں کہ امام طحاوی شرح معانی الآثار، اسی باب اور اسی بحث میں جہاں ان سے ترجیح معکوس کا وقوع بتایا جاتا ہے خاص اسی بھذا نأخذ سے متصل صاف صریح فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بنی ہاشم کے غلام تو غلام موالی پر بھی زکوٰۃ حرام ہے اور ہمارے ایمہ سے اس کا خلاف معلوم نہیں ہے اور فرماتے ہیں ہمارے ایمہ ثلاثہ کا یہی قول ہے پھر انہیں قائل بالجواز ماننا کیسے ہو سکتا ہے بلکہ قول بالمحال ہے اور فتویٰ امام طحاوی بھی یقیناً جانب ظاہر الروایۃ ہی راجع ہے۔ ثابت ہوا کہ سادات کرام کو زکوٰۃ دینی منع ہے اور جو امام طحاوی کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ جواز کے قائل ہیں وہ مرجوح روایت ہے۔ امام طحاوی کے نزدیک معتمد اور مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ ناجائز ہے کیونکہ امام طحاوی ظاہر الروایۃ کے متعلق فرماتے ہیں بھذا نأخذ ہم اسی پہ عامل ہیں کہ بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینی ناجائز ہے۔ مزید اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ بنی ہاشم کو مال زکوٰۃ سے عمل صدقات کی اجرت لینا بھی فقہاء ناجائز ٹھہراتے ہیں حالانکہ یہ اغنیاء کے لیے بھی جائز ہے کہ من کل الوجوہ زکوٰۃ نہیں ہے مگر آخر شبہ زکوٰۃ ہے اور بنی ہاشم کی جلالت شان شبہ لوث سے بھی براءت کی شایاں، تبیین الحقائق میں ہے عاملین کو بھی زکوٰۃ دی جائے گی کیونکہ مستحقین زکوٰۃ سے ہیں مگر اس میں شبہ ہے کہ زکوٰۃ اصحاب اموال سے ساقط ہو گئی ہے بوجہ ادائیگی لہٰذا یہ عامل ہاشمی کو نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رشتہ داروں سے ہیں وہ اس میل کے مستحق نہیں اور غنی عامل لے سکتا ہے کیونکہ غنی عزت اور احترام میں ہاشمیوں کا مساوی نہیں ہو سکتا لہٰذا غنی کے لیے جائز ہے اور ہاشمی کے لیے ناجائز ہے ہاشمی جلالت شان کی وجہ سے شبہ لوث سے برتر ہیں اور غنی کے حق میں یہ کوئی شبہ لوث نہیں ہے۔ بہر نوع مفتیٰ بہ قول اور ظاہر روایت کے مطابق سادات کو زکوٰۃ دینی منع ہے البتہ

ان کو تحفے تحائف وغیرہ دے کر اپنی سعادت اور خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل کریں۔ علامہ ابن عساکر علی بن حسن المتوفی ۵۷۱ھ فرماتے ہیں:

من صنع الی اهل بیتی یداً کافانه علیها یوم القیامة۔

مولا علی فرماتے ہیں کہ جس نے میری اہل بیت سے اچھا سلوک کیا قیامت کے دن میں اس کا صلہ عطا کروں گا۔ اور اگر کوئی آدمی مصارف مستحبہ نذرانہ صدقہ نفلی تحائف کی وسعت نہیں رکھتا تو پھر یہ زکوٰۃ کی رقم کسی غریب جو کہ مستحق ہے اس کو دے کر کہے قبول کرلے پھر کہے کہ یہ رقم سادات کو پیش کردے اب زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی اور سادات کی خدمت کی بجاآوری بھی ہوجائے گی۔

الحیلة ان یتصدق بمقدار زکوٰته علی فقیر ثم یامره بالصرف الی هذه الوجوه۔

بہرکیف سادات کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہیئے البتہ یہ حیلہ کرکے کہ کسی غریب آدمی کو دے کر جس پر اس کو اعتماد ہو اس کو کہے قبول کر پھر اس کو کہے کہ یہ بطور نذرانہ فلاں سید کی خدمت میں پیش کردے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الصوم

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ سگریٹ پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالیٰ

سگریٹ نوشی سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے بلکہ کفارہ بھی لازم ہو گا۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں:

وعلی ھذا البدعۃ التی ظھرت الاٰن فھو الدخان اذا شربہ فی لزوم الکفارۃ۔

یعنی جب سگریٹ پیئے گا تو روزہ بھی فاسد ہو گا اور کفارہ بھی لازم ہو گا (مراقی الفلاح ۱۱۱)

اسی حکم میں حقہ بھی داخل ہے۔ بہر صورت اگر حقہ یا سگریٹ نوشی روزہ کی حالت میں کرے تو روزہ فاسد ہو جائے گا اور کفارہ بھی لازم ہو گا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ہمارے علاقہ (ڈنمارک) میں بعض دفعہ دن لمبا ہو جاتا ہے تو کیا قریبی ممالک کے ٹائم سے کہ وہاں فلاں وقت سورج غروب ہو جاتا ہے ہم روزہ افطار

کر سکتے ہیں یا جبکہ اس علاقہ میں سورج غروب ہو جہاں ہم نے روزہ رکھا ہے افطار کریں شرعی حکم تحریر کریں؟

محمد اشرف ڈنمارک ص ن ب نمبر ۴۰۰۰...

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں روزہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے یہ مسئلہ قرآن پاک سے ثابت ہے جس میں کسی قسم کی کمی و بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

ثم اتموا الصیام الی اللیل۔

چونکہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اسلام نے روزہ کے لیے ماہ رمضان کا تعین کیا ہے۔ رمضان کا مہینہ قمری حساب سے رکھا گیا ہے کیونکہ جب نصف دنیا پر سردی کا موسم ہوتا ہے تو دوسرے حصہ پر گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ قمری مہینہ ادل بدل کر آنے سے کل دنیا کے مسلمانوں کیلئے مساوات قائم کر دیتا ہے۔ اگر شمسی مہینہ مقرر کر دیا جاتا تو نصف دنیا کے مسلمان ہمیشہ سرما کی سہولت میں اور نصف دنیا کے مسلمان ہمیشہ گرما کی تکلیف اور سختی میں رہا کرتے جہاں سورج غروب اور طلوع ہوتا ہے اور دن اور رات ہیں وہاں ضروری ہے کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک روزہ رکھا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر دن بڑا ہو تو اپنی مرضی کے مطابق روزہ کے لیے ٹائم تھوڑا مقرر کر لیا جائے بلکہ روزہ کا ٹائم صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب ہو گا ورنہ روزہ ہی نہیں ہو گا۔ آپ پہلے تو پاکستان میں رہتے تھے یہاں سردی کے موسم میں دن چھوٹا ہوتا ہے اور گرمی میں دن بڑا ہوتا ہے روزہ میں پھر بھی غروب اور طلوع فجر کا لحاظ کیا گیا ہے لہذا جہاں طلوع اور غروب وہ خواہ دن بڑا ہو یا چھوٹا مکمل دن کا روزہ ہو گا کمی نہیں ہو سکتی۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت جناب مفتی صاحب دار العلوم نقشبندیہ علی پور شریف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ایک مسئلہ دریافت طلب ہے کہ جن شہروں میں چھ ماہ رات

اور چھ ماہ دن ہو وہاں روزہ اور نماز کے لیے کیا حکم ہے۔

محمد اشرف ڈنمارک ص ب نمبر ۴۰۰۰

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مستفسرہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تو ایسے مقامات پر آبادی کا انکار کیا ہے کہ ایسے مقامات پر حیوان زندہ نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ انسان زندگی بسر کرے۔ البتہ فتاویٰ نظامیہ میں صریحہ جزئیہ کے جواب میں لکھتے ہیں کہ جن شہروں میں مسلسل چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات رہتی ہے ایسے مقام کے رہنے والوں پر رات کی تمام نمازیں ادا کرنا فرض ہے۔ درمختار میں ہے:

وفاقد وقتهما مكلف بهما اور ردالمحتار میں ہے: والحاصل انهما قولان مصححان و تايد القول بالوجوب بانه قال به امام مجتهد وهو الامام الشافعي كما نقله في الحليه۔

مگر چونکہ ادا کے لیے وقت معین نہیں ہے اس لیے ان نمازوں کو بطریقہ قضا پڑھنا چاہیئے چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

اذا علمت ذالك ظهر لك ان من قال بالوجوب يقول به على سبيل القضا مع ان القائلين عندنا بالوجوب صرحوا بانها قضاء ويفقد وقت الاداء۔ ل

لیکن روزہ و زکوٰۃ و عدت و بیع مسلم و اجارہ وغیرہ کے متعلق ان لوگوں کو آس پاس کے شہروں کے دن کا اندازہ کر کے ادا کرنا چاہیئے۔ ردالمحتار ج ۱ ص ۲۰۵ میں ہے:

وكذالك يقدر جميع الآجال كالصوم والزكوٰة والحج والعدة وآجال البيع والسلم والاجارة وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الاربعة بحسب مايكون كل يوم من الزيادة والنقصان كذا في كتب الايمة الشافعية ونحن نقول بمثله۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں۔ شرعی جواب تحریر فرمایا جائے ۔ بینوا و توجروا ۔

غلام حسین خطیب ٹھٹھروالی ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

ٹیکہ اور انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بدن کو صلاحیت ہو۔ اس کا جوف (پیٹ) میں داخل ہونا مفسد صوم (روزہ) ہے ۔ درمختار صـ۱۱۱ میں ہے:

والضابط وصول مافیہ صلاح بدنہ بجوفہ

ہدایہ صـ۲۰۰ میں ہے:

وھو وصول مافیہ صلاح البدن الی الجوف ۔

بحرالرائق میں ہے:

الداخل فی الجوف شرط الفساد ۔ (صـ۲۷۹)

یعنی وہ چیز جس سے بدن کو صلاحیت ہو اس کا جوف میں داخل ہونا مفسد روزہ ہے اور فقہاء نے جوف کا اطلاق جوف دماغ اور جوف مثانہ پر بھی کیا ہے۔ لہذا مطلب یہ بنے گا کہ جو چیز کسی منفذ کے ذریعہ شکم یا کسی اندرون حصہ میں داخل ہو جائے تو اس سے روزہ فاسد فاسد ہو جائے گا بلکہ بعض دفعہ چیز جوف تک بھی نہیں پہنچتی لیکن پھر بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے مثلاً وہ قطرہ جو ناک کے ذریعے پہنچ رہا ہے اتنا قلیل ہے کہ وہ جوف تک نہیں پہنچتا۔ اسی طرح اگر ایک روزہ دار کا حلق خشک ہو چکا ہے اس کے حلق میں ایک قطرہ پانی کا ڈالا جاتا ہے روزہ فاسد ہو جائے گا اور انجکشن بعض تو ایسے ہیں کہ پوری بوتلیں انسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں لہذا انجکشن کے ساتھ روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اگر انسان مریض اور بیمار ہے تو شرعی طور پر اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔ یہ نہ چاہیئے کہ روزہ رکھ کر ساتھ ٹیکے لگواتا ہے

کیونکہ انجکشن سے جسم میں صلاحیت اور طاقت ہوتی ہے اور بیرونی چیز اندر جاتی ہے۔اس مسئلہ پر ہماری کتاب " القول التنقیح " اور " التعاقب علی التعاقب " ملاحظہ کیجئے جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انجکشن اور ٹیکہ لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الحج

الاستفتاء

ایک استفتاء پہلے بھیجا تھا جس کے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ ملا علی القاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حج سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ حالانکہ بہار شریعت حصہ ۶، عرفہ کا وقوف حدیث نمبر ۷، ابن ماجہ اور بیہقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں دعا مانگی تو حقوق العباد معاف کر دیئے گئے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر کسی کو یہ کہنا کہاں درست ہے کہ حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ اس حدیث شریف کے متعلق بتایا جائے کہ کیسی ہے۔ براہ کرم اس کا جواب عنایت فرمایا جائے۔

زاہد حسن فریدی پرنسپل کالج چکوال ضلع جہلم۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

پہلے جو میں نے جواب لکھا ہے اس وقت بھی جو حدیث آپ نے پیش کی ہے میرے پیش نظر تھی غالباً پہلے میں نے اس کی توجیہہ کر دی ہے۔ رئیس الحنفیہ ملا علی قاری فرماتے ہیں:

واما حقوق العباد فلا تسقط بالحج والھجرۃ اجماعاً۔

دیکھئے علی قاری حقوق العباد کے متعلق اجماع نقل کر رہے ہیں کہ حقوق العباد حج اور ہجرت سے معاف نہیں ہوتے۔ جو حدیث ابن ماجہ کی آپ نے نقل کی ہے اس کے ساتھ بعض شوافع

نے استدلال پکڑا ہے لیکن علماء احناف اس حدیث کو بر تقدیر صحت مقید بتاتے ہیں۔

وعلی تقدیر صحتہ یمکن حمل المظالم علی مالا یمکن تدارکہ او یقید بالتوبۃ او التخصیص بمن کان معہ علیہ الصلوٰۃ و السلام من امتہ فی حجتہ فانہ لا یعرف احد منہم ان یکون مصراً علی معصیۃ ولہذا قال الجمہور ان الصحابۃ کلہم عدول۔

یعنی پہلے تو حدیث جس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (اور آپ نے بھی جس پر سوال کی بنیاد رکھی ہے) اس کو متعدد محدثین نے موضوع، منکر اور ضعیف قرار دیا ہے۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ حقوق العباد ہیں جن کا تدارک محال ہے یا حضور علیہ السلام نے خصوصاً اپنے صحابہ کے لیے ارشاد فرمایا تھا جو کہ آپ کی معیت میں تھے یا یہ حدیث توبہ کے ساتھ مقید ہے ایک اور مقام پر مزید وضاحت کرتے ہوئے علی القاری لکھتے ہیں کہ گناہ چار قسم پر ہے ایک وہ ہے جو معاف نہیں ہوگا وہ شرک ہے۔ دوسری قسم معاف ہو جائے گی جو کہ صغیرہ ہیں ایک تحت المشیئتہ داخل ہیں جو کہ حقوق باری تعالیٰ ہیں۔ ایک چوتھی قسم ہے جو کہ حقوق العباد ہیں یہ معاف نہیں ہوں گے البتہ اگر تراد ہو یعنی یا تو چیز بعینہ یا اس کی مثل واپس کی جائے یا آخرت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے کر معافی دے دی جائے گی۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مظلوم کے دل میں ڈال دے گا کہ وہ اس کو معاف کر دے گا۔

عنایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ یہ حدیث جو ابن ماجہ نے حقوق العباد معاف ہونے کے متعلق لکھی ہے مقید بالشرط ہے

بان یرضی المظلوم بالازدیاد فی مثو باتہم حتی یترکوا خصوماتہم فی الدماء والمظالم۔

یعنی مظلوم کے ثواب میں زیادتی کی جائے گی حتیٰ کہ وہ اپنے حقوق معاف کر دے گا جیسا کہ محدثین اس حدیث کو مقید فرما رہے ہیں (سوائے چند شوافع کے) تو ہم ہر صورت میں حدیث کو مقید

سمجھتے ہوئے یہی کہیں گے کہ حقوق العباد معاف نہیں ہوتے معاف ہونے کی صورتیں صرف یہی ہیں کہ وہ ظالم یا تو خود وہ حقوق یا ان کی مثل ادا کرے۔ اگر دنیا میں اس نے ایسی صورت اختیار نہ کی تو آخرت میں اس کے مثوبات مظلوم کو دیئے جائیں گے یا اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرماتے ہوئے اس کے دل میں ڈال دے گا کہ وہ معاف کر دے اور صاحب بہار شریعت نے صرف حدیث کا ترجمہ کیا ہے وہ یہاں پر صرف فضیلت حج کے بیان میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کو بیان کر رہے تھے وہ حقوق العباد کے مسئلہ کی وضاحت نہیں کر رہے تھے اس لیے انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق اس حدیث کے ماتحت ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ صرف حج کرنے سے حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ علماء کرام نے تو اس پر اجماع فرمایا ہے۔ معاف ہونے کی صورتیں وہی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں زیادہ تفصیل کے لیے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ کا رسالہ "اعجب الامداد فی مکفرات حقوق العباد" ملاحظہ کیجئے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ہمارے قصبہ میں ایک حاجی صاحب ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب انسان مدینہ منورہ جائے تو مسجد نبوی کی نیت کرے روضہ مطہرہ کی نیت نہ کرے بلکہ نیت مسجد نبوی کی ہی کرے پھر روضہ مبارکہ کی زیارت کر لے۔ وہ کہتے ہیں کہ حدیث پاک میں ہی اس طرح حکم ہے اور بعض علماء سے سنا ہے کہ روضہ پاک کی نیت کر کے ہی مدینہ منورہ جائے آپ اس سے جو مسئلہ صحیح ہو وہ تحریر کریں۔

سائلین از اوکاڑہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں مسلمان جب زیارت مدینہ منورہ کے لیے جائے تو یہی نیت کرے کہ میں بارگاہ نبوت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ حاجی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ مسجد نبوی کی نیت کرے وہ حاجی دیوبندی اور وہابی ہے۔ وہابیہ مذہب کا طبل بجانے والا ابن تیمیہ تقی الدین ابو العباس

احمد بن شہاب الدین الحرانی المتوفی ۷۲۸ھ بھی یہی کہتا ہے کہ روزہ مطہرہ کی نیت نہ کی جائے، یہ غلط ہے صحیح وہی ہے جو کہ اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ روضہ انور کی نیت کی جائے۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ خالص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مطہرہ کی نیت کرنی چاہیئے۔ جب بارگاہ نبوت میں پہنچے گا تو مسجد نبوی کی بھی زیارت ہوجائے گی (انوار البشارۃ ص۴۲) اور یہ بھی عقیدہ رکھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سچی حقیقی دنیاوی جسمانی حیات سے ویسے ہی زندہ ہیں جیسا کہ عالم دنیا میں اور عوام کی نظر سے پوشیدہ ہونے سے پہلے تھے۔ امام احمد قسطلانی المتوفی ۹۲۲ھ مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

لا فرق بین موتہ وحیاتہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی مشاھدتہ لامتہ ومعرفتہ باحوالھم ونیاتھم وعزائمھم وخواطرھم وذلک عندہ جلی لاخفاءبہ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و وفات میں اس بات میں کچھ فرق نہیں کہ وہ اپنی امت کو دیکھ رہے ہیں اور ان کی حالتوں، ان کی نیتوں، ان کے ارادوں، ان کے دلوں کے خیالوں کو پہچانتے ہیں اور یہ سب حضور پر روشن ہے جس میں اصلاً پوشیدگی نہیں۔ علی قاری فرماتے ہیں:

"بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیری حاضری اور تیرے کھڑے ہونے اور تیرے سلام بلکہ تیرے افعال واحوال وکوچ ومقام سے آگاہ ہیں"۔ معلوم ہوا کہ جو بارگاہ رسالت میں حاضر ہو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیات حیات حقیقی سمجھے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حقیقتاً روضہ مطہرہ میں زندہ تشریف فرما ہیں۔ انور شاہ کاشمیری (العرف الشذی ص۱۵۹) میں کہتے ہیں:

وقال مالک بن انس ان الارض الملاصق لجسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم المبارک اعلیٰ وافضل من کل شیٔ حتی العرش والکرسی ایضاً

اور امام مالک بن انس فرماتے ہیں وہ زمین پاک جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کیساتھ ملی ہوئی ہے وہ ہر چیز سے اعلیٰ و افضل اور مبارک ہے حتیٰ کہ عرش اور کرسی سے بھی پھر بیت اللہ افضل ہے اس کے بعد مسجد نبوی اور پھر مسجد حرام اور پھر مدینہ منورہ مکہ سے افضل ہے۔ پس فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی میں نماز کا ثواب دو لاکھ نمازوں کے برابر ہے اور امام مالک نے مدینہ منورہ کی افضلیت پر دعا برکت کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے کیونکہ مدینہ منورہ میں جب ہر چیز میں دوگنا برکت رکھی گئی ہے تو نماز میں بھی دوگنا ثواب ہوگا (مسجد حرام میں ایک لاکھ کا ثواب اور مدینہ منورہ میں ایک نماز کے لیے دو لاکھ کا ثواب ہوگا۔ امام مالک نے مسجد نبوی کا مرتبہ بیت اللہ کے بعد اور مسجد حرام سے قبل بیان فرمایا ہے اور روضہ مقدسہ کا مرتبہ تمام سے زیادہ لہذا بارگاہِ رسالت میں حاضری کی نیت کی جائے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ امام مالک کے نزدیک مدینہ طیبہ افضل ہے اور یہی مذہب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ایک صحابی نے کہا مکہ معظمہ افضل ہے فرمایا کیا تم کہتے ہیں کہ مکہ مدینہ سے افضل ہے انہوں نے کہا واللہ بیت اللہ و حرم اللہ حضرت عمر نے فرمایا میں بیت اللہ اور حرم اللہ میں کچھ نہیں کہتا کیا تم کہتے ہو کہ مکہ مدینہ سے افضل ہے۔ انہوں نے کہا بخدا خانہ خدا و حرم خدا فرمایا میں خانہ خدا و حرم خدا میں کچھ نہیں کہتا کیا تم کہتے ہو کہ مکہ مدینہ سے افضل ہے وہ وہی کہتے رہے اور سیدنا امیر المومنین یہی فرماتے رہے اور یہی میرا مسلک ہے

صحیح حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

المدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون۔

مدینہ ان کے لیے بہتر ہے اگر وہ جانیں۔

دوسری حدیث نص صریح ہے کہ فرمایا:

المدینة افضل من مکة۔

مدینہ مکہ سے افضل ہے اور تفاوت (تفرق) ثواب کا جواب باصواب محقق عبدالحق

محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب دیا کہ مکہ میں کمیت (مقدار) زیادہ ہے اور مدینہ میں کیفیت (قدر) زیادہ ہے یعنی مکہ میں مقدار زیادہ ہے اور یہاں مدینہ میں قدر افزوں جیسے یوں سمجھیے کہ لاکھ روپیہ زیادہ ہیں یا پچاس ہزار اشرفیاں گنتی میں لاکھ زیادہ ہیں اور مالیت میں اشرفیاں دس گنا ہیں۔ مکہ معظمہ میں جس طرح ایک نیکی لاکھ نیکیاں ہیں یوں ہی ایک گناہ لاکھ گناہ ہیں اور مکہ میں گناہ کے ارادہ پر بھی گرفت ہے جس طرح نیکی کے ارادہ پر ثواب مدینہ طیبہ میں گناہ کے ارادے پر کچھ نہیں اور گناہ کرے تو ایک ہی گناہ اور نیکی کرے تو پچاس ہزار نیکیاں عجب نہیں کہ حدیث میں خیبر مسلم کا اشارہ اسی طرف ہو کہ ان کے حق میں مدینہ منورہ ہی افضل ہے اور حاجی وہابی نے جو حدیث پیش کی ہے وہ یہ ہے :

لا تشد والرحال الا الی ثلاثۃ مساجد

یعنی سامان سفر نہ باندھو مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اس حدیث کے ساتھ وہابیہ دلیل پکڑتے ہیں کہ مسجد نبوی کی نیت کرنی چاہیے، روضہ مطہرہ کی نیت نہیں چاہیے حالانکہ اس حدیث کے ساتھ وہابیہ کا استدلال غلط ہے بلکہ یہ تو بدلالۃ النص جواز پر دلالت کرتی ہے کیونکہ جو علت تین مساجد کے دیگر (دوسری) مسجدوں اور مقامات سے مستثنیٰ ہونے کی قرار پائی ہے وہاں مساجد کی فضیلت ہی تو ہے یعنی تین مساجد کی طرف سفر کرنا صرف اس لیے ہے کہ یہ دیگر مقامات سے افضل ہیں اور روضہ مطہرہ میں بھی فضیلت (علت) زیادتی کے ساتھ از روئے مساجد کے موجود ہے اس لیے کہ وہ حصہ زمین کا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کو مس کیے ہوئے ہے مطلقاً ہر چیز سے افضل یہاں تک کہ کعبہ، عرش، کرسی سے بھی افضل ہے اور جب فضیلت مقیدہ خاصہ کی وجہ سے تین مسجدیں عموم نہی سے مستثنیٰ ہو گئیں تو بدرجہا اولیٰ ہے کہ روضہ مطہرہ فضیلت مطلقہ اور عامہ کے سبب اس سے مستثنیٰ ہو۔ سید انور شاہ کاشمیری کہتے ہیں :

واحسنها ماذکر الحافظان فی شرح البخاری و آتنیا بالروایتہ

اخرجها احمد فی مسندہ لا تشد و الرحال الی مسجد یصلی فیه

الا الی ثلاثة مساجد (العرف الشذی ص۱۶۰)

کہ بہترین جواب وہ ہے جو حافظ ابن حجر اور حافظ عینی نے شرح بخاری میں ذکر کیا اور ان دونوں نے وہ روایت پیش کی جو امام احمد نے مسند میں ذکر کی ہے کہ کسی مسجد کی طرف کوچ نہ کرو تاکہ اس میں نماز پڑھی جائے مگر تین مسجدوں کی طرف نماز کے ثواب کی زیادتی کے حصول کیلئے سفر کر سکتے ہو۔

اب اس حدیث لا تشد و الرحال کا تعلق روضہ مطہرہ سے دور کا بھی نہیں ہے کہ وہابیہ اس کے ساتھ ممانعت پر دلیل پیش کریں کیونکہ اس حدیث کا معنی تو صرف یہ ہے کہ بہ نیت تضاعف صلوٰۃ (یعنی نماز کے ثواب کا زیادہ ہونا) اور کسی مسجد کی طرف (ان کے سوا) سفر کرنا منع ہے نہ کہ روضہ مطہرہ کی طرف بھی سفر کرنا منع ہے۔ اس حدیث کا چونکہ روضہ مطہرہ کیساتھ کسی قسم کا لگاؤ نہیں لہذا روضہ اقدس کی طرف سفر کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ علاوہ ازیں حدیث شد رحال سے تو کسی ولی اللہ کے مزار کی طرف بھی سفر کر کے جانے کی ممانعت نہیں نکلتی چہ جائیکہ سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم کے روضہ پاک کے ارادہ سے سفر کرنا اس حدیث کی رو سے منع ہو کیونکہ الا الی ثلاثة مساجد استثناء ہے اصل استثناء متصل ہوا کرتی ہے لہذا مستثنیٰ منہ مسجد نکالنا پڑے گا معنیٰ یہ بنے گا کہ کسی مسجد کی طرف سفر نہ باندھو مگر تین مسجدوں کی طرف جیسا کہ مسند شریف کی روایت بھی اس کی مؤید ہے کہ وہاں مستثنیٰ منہ مسجد مذکور ہے اگر مستثنیٰ منہ مسجد مذکور نہ ہو تو پھر علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر مستثنیٰ مفرغ ہو یعنی مستثنیٰ منہ ذکر نہ ہو تو پھر مستثنیٰ کی جنس کا ہی مستثنیٰ منہ مقرر کیا جائے گا چونکہ مستثنیٰ ثلاثہ مساجد ہے مستثنیٰ منہ بھی مساجد ہی نکالا جائے گا۔ لہذا معنی وہی ہوگا کہ بہ نیت تضاعف کسی مسجد کی طرف سوائے ان مسجدوں کے سفر نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ اس حدیث کا سفر روضہ مطہر کے ساتھ کسی قسم کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے لہذا روضہ مطہرہ کی طرف سفر کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور لازم اور ضروری

ے مسلمان کو چاہیئے کہ جب بھی مدینہ منورہ جائے تو روضہ مطہرہ کی حاضری کی ہی نیت کرے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

ستفسار

بخدمت جناب استاذ العلماء مولانا غلام رسول صاحب مدظلہ العالی

لام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کے بعد عرض ہے کہ حدیث توسل (وسیلہ والی حدیث)

ھم انی اسئلك واتوجه اليك بمحمد نبی الرحمة يا محمد انی قد توجهت

الی ربی فی حاجتی هذه کیا صحیح ہے۔ بعض وہابیہ نے اس کو ضعیف کہا ہے،

یقی جواب دیا جائے۔

محمد یوسف خطیب چھتر دہ میرپور آزاد کشمیر۔

اب بعونہ تعالیٰ

یہ حدیث توسل صحیح ہے۔ امام محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی المتوفی ۲۷۳ھ نے اس کو صلوٰۃ الحاجۃ میں ذکر کیا ہے کہ عثمان بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم حضور علیہ لام کے دربار میں تھے ایک صاحب جو نابینا تھے بارگاہ نبوت ورسالت میں حاضر ہوئے۔ ض کی میری آنکھوں کے لیے دعا فرمائیے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر تو صبر کرے تو اچھا ہے اگر تو چاہتا ہے تو تیرے لیے دعا کر دیتے ہیں۔ اس نے عرض کی حضور میرے لیے دعا فرمائیے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اچھا وضو کر اور دو رکعت نماز پڑھ اور پھر یہ دعا اللھم انی اسئلك خرہ مانگ۔ حدیث پاک کے آخر میں ہے کہ جب اس فقید البصر نابینا نے نماز پڑھ کر دعا نگی فقام وقد الصبر ببركته صلی اللہ علیه وسلم وہ کھڑا ہوا اس کی آنکھیں حضور علیہ لسلام کی برکت سے روشن ہو گئیں پھر وہ صاحب خود فرماتے ہیں کہ میری آنکھیں ایسی روشن

سند عثمان بن حنیف انصاری کی وفات معاویہ کی خلافت میں ہوئی (تقریب التہذیب ص ۲۵۹)

ہوئیں گویا کہ مجھے تکلیف ہی نہیں ہوئی اور بہت ہی خوش ہوئے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی لکھتے ہیں :-

جب آگئی ہیں جوشِ رحمت پہ ان کی آنکھیں
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں

یہ حدیث ضعیف نہیں ہے جو لوگ ضعیف کہتے ہیں وہ اپنی غلطی سے کہتے ہیں کہ اس کی سند میں عثمان بن خالد بن عمر متروک الحدیث ہے لہٰذا حدیث ضعیف ہے حالانکہ اس کی سند میں عثمان بن خالد بن عمر کوئی راوی نہیں ہے بلکہ راوی عثمان بن عمر ہے جس کو حافظ ابن حجر نے تقریب میں ثقہ اور مضبوط کہا ہے۔ عثمان بن خالد اور ہے جو کہ متروک الحدیث ہے اس حدیث توسل میں تو عثمان بن عمر ہے جو کہ ثقہ ہے تمام کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حدیث توسل صحیح ہے، امام حاکم محمد بن عبداللہ صاحب مستدرک المتوفی ۴۰۵ھ نے فرمایا کہ حدیث توسل شرط شیخین (یعنی بخاری مسلم) کے مطابق صحیح ہے، ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ ھذا حدیث صحیح۔ معلوم ہوا کہ تمام محدثین اس حدیث کی صحت کے قائل ہیں وہابیہ عدم علم کی وجہ سے ضعیف ہونے کی رٹ لگا رہے

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب النکاح

الاستفتاء
کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نکاح کا خطبہ بیٹھ کر پڑھنا چاہیئے یا جمعہ کی طرح کھڑے ہوکر ۔ حکم شرعی تحریر کیا جائے ۔
محمد طفیل شکر گڑھی ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ
تمام خطبوں میں خواہ جمعہ کے ہوں یا عیدین کے قیام (کھڑا ہونا) افضل ہے اور خطبہ نکاح میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے ۔ سیدنا عمر فاروق نے بیٹھ کر بھی پڑھا ہے ۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے کہ خطبہ نکاح نفل ہے اگر بیٹھ کر پڑھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ الغرض اگر خطبہ نکاح بیٹھ کر پڑھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے ۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء
کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جس عورت کے یکے بعد دیگرے دو شوہر ہوں یا زیادہ تو قیامت کے دن وہ کس کے ساتھ ہوگی ۔
المستفتی
محمد شفیع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

قیامت والے دن عورت کو اختیار دیا جائے گا جس مرد نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ رہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اس عورت کو اختیار دیا جائے گا جو اس کے ساتھ زیادہ اچھا سلوک اور برتاؤ کرتا تھا اس کے ساتھ رہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ کیا سیدزادی کا نکاح غیر سید کے ساتھ ہوسکتا ہے یا نہیں؟

سائل جہانگیر خاں لندن برطانیہ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

سید زادی کا نکاح غیر سید کے ساتھ جائز نہیں ہے اگر نکاح کیا گیا ہے تو اصلاً منعقد ہی نہیں ہوا کیونکہ غیر سید ما سید زادی کا کفو نہیں ہے اور جہاں کفو نہ ہو وہاں روایت مفتی بہ کے مطابق بالکلیہ نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے:

الکفاءۃ تعتبر فی العرب والعجم دیانتہ

یعنی عرب و عجم میں دیانت کے لحاظ سے کفو کا اعتبار کیا گیا ہے۔

اب فاسق صالحہ کا کفو نہیں ہوگا یفتی فی غیر الکفوء بعدم جوازہ اصلاً وھو المختار للفتوی لفساد الزمان۔ غیر کفو میں نکاح کے عدم جواز کا بالکلیہ فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ فساد زماں کی وجہ سے یہی مختار اور مفتی بہ قول ہے۔ فتاویٰ رضویہ میں ہی ہے:

نکاح غیر کفو میں باطل محض ہے اصلاً منعقد نہیں ہوگا۔ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں فان الموجب ھو استنقاص اھل العرف فید ورمعہ۔ جہاں عار اور ننگ اور شرم ہو وہاں کفو نہیں ہوگی اور جہاں کفو نہ ہو وہاں روایت مفتی بہ کے مطابق بالکلیہ نکاح منعقد

نہیں ہوگا والعجمی لایکون کفوا للعربیۃ کوئی عجمی کسی عرب عورت کا ہم کفو نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ عجمی عالم یا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو اور یہی بات سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اور طحاوی میں ہے کہ اصح یہ ہے کہ بلند مرتبہ جیساکہ بادشاہ اور عالم یہ علویہ کے لیے کفو نہیں ہیں۔ شرح وقایہ میں ہے کہ حضرت حسن بن زیاد امام ابی حنیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ نکاح غیر کفو میں منعقد نہیں ہوسکتا قاضی خاں نے بھی اس کو مفتی بہ کہا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں کہ یہی محتاط اور معتبر ہے کہ غیر کفو میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ علامہ نسفی کفو کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کفو میں دیانت معتبر ہے کہ عرب و عجم میں دیانت کے لحاظ سے کفو کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جب ایک نیک ماں باپ کی بیٹی فاسق شخص کی ہم کفو نہیں ہوسکتی اور نہ ہی بقول ابن ہمام عجمی کسی عرب عورت کا ہم کفو ہوسکتا ہے اور علامہ طحاوی کے قول کے مطابق عجمی خواہ عالم ہو یا بادشاہ وہ علویہ غیر سیدہ کا ہم کفو نہیں بن سکتا تو پھر سیدہ فاطمیہ، حسینیہ کے لیے عالم یا بادشاہ وغیرہ کیسے کفو بن سکتے ہیں اور غیر سید، سیدزادی کے لیے ہرگز ہرگز کفو نہیں ہوگا۔ لہذا صورت مسئولہ میں نکاح قطعاً منعقد نہیں ہوگا بلکہ سادات کے لیے عرب بھی کفو نہیں ہیں اور قریش اور بنی ہاشم اور بنی عباس اور علوی غیر فاطمی بھی ہم کفو نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن حجر مکی اپنے فتاوی کبری میں فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے خصائص کریمہ میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کی صاحبزادیوں کی اولاد حضور کی طرف بحیثیت نسب منسوب ہے۔ حضور کا کوئی ہم کفو اور مثل نہیں ہے۔ آپ کی اولاد کا بھی کوئی کفو نہیں ہے مگر وہی جو آپ کے نسب عترت میں سے ہو۔

فالعباسی لا یکون کفوً للشریفۃ وان کانا من بنی ھاشم

پس عباسی، سیدہ کے لیے ہم کفو نہیں ہے اگرچہ دونوں بنی ہاشم سے ہیں تو اس ضابطہ سے اس قول عام کی تخصیص ہوگئی کہ بنی ہاشم و بنی عبد المطلب ایک ہی ہیں۔ یعنی مال غنیمت و صدقات وغیرہ میں ایک ہیں اور کفو میں ہرگز ایک نہیں۔ علامہ ابن حجر مکی کا مطلب یہ ہے کہ عباسی اور سیدہ میں ہم کفو نہیں بن سکتے اگرچہ دونوں بنی ہاشم سے ہیں۔ جہاں فقہاء نے

یہ بیان کیلئے ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقات مال غنیمت وغیرہ میں ایک ہیں نہ کہ کفو میں ایک ہیں۔ جب کفو میں ایک نہ ہوئے تو اب عباسی مرد کا نکاح سیّد زادی سے نہیں ہوگا۔ جب عرب، قریش، بنی ہاشم، بنی عباس، علوی غیر فاطمی سیّدہ کے لیے کفو نہیں بن سکتے تو عالم، پٹھان، مغل، عجمی، غیر سیّد کیسے سیّدہ کے لیے ہم کفو بن سکتے ہیں۔ سیّد زادی کے لیے سیّد زادہ ہی ہم کفو ہوگا۔ اگر کسی غیر سیّد نے سیّد کے ساتھ نکاح کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

اگر سوال کیا جائے کہ قریش باہمی ایک دوسرے کے کفو ہیں اور سیّد بھی قریش ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: قریش بعضھم اکفاء بعض۔

تو جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس حدیث کی محدثین نے تضعیف کی ہے۔ اگر اس کی صحت ثابت ہو بھی جائے تو یہ عام مخصوص عنہ البعض ہے جیسا کہ ابن حجر مکّی نے کہا ہے کہ یہ حضور علیہ السلام کی خصوصیات سے ہے کہ آپ کی اولاد کا کوئی بھی ہم کفو نہیں ہے۔ قریش اگرچہ باہمی ایک دوسرے کے کفو ہیں لیکن قریش سے سادات فاطمیہ مخصوص ہیں ان کی قریش بھی کفو نہیں بن سکتے جیسا کہ ابن حجر نے نص کی ہے: فالعباسی مثلا لیس کفوا للشریفۃ۔ عباسی مرد سیّدہ فاطمیہ کے لیے کفو نہیں ہے اگرچہ دونوں بنی ہاشم سے ہیں۔ اب جبکہ عباسی مرد، سیّدہ کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتا جو کہ ہاشمی قریشی ہے تو کیا قریش بعضھم اکفاء بعض مخصوص نہیں ہوگا۔ یا تو اس کی تخصیص کرنی پڑے گی یا تضعیف جیسا کہ محدثین نے کہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ سیّدہ فاطمیہ کے لیے غیر سیّد ہم کفو نہیں بن سکتا اور نہ ہی نکاح ہوسکتا ہے۔ صواعق محرقہ میں ہے:

فاذا ثبت ھذا۔ لعموم القریش فاھل البیت اولیٰ۔

جب یہ فضائل قریش کے لیے ہیں تو اہل بیت رسول زیادہ حقدار ہیں کیونکہ وہ ان خصوصیات کے ساتھ ممتاز ہیں جن میں قریش ان کے شریک نہیں۔ صواعق محرقہ کی عبارت سے صاف

معلوم ہوا کہ اہل بیت رسول کا ان کے فضائل میں کوئی شریک اور ہم مثل نہیں ۔ نہ ہی قریش اور نہ ہی غیر قریش ۔ جب اہل بیت کا کوئی ہم کفوء اور ہم مثل نہیں تو پھر سید زادی کے ساتھ غیر سید کا نکاح بھی نہیں ہوگا اور صواعق محرقہ کی عبارت سے واضح طور پر یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اہل بیت کرام قریش سے مستثنیٰ ہیں اسی لیے صاحب صواعق محرقہ خود ہی فرمارہے ہیں کہ ان کی فضیلت میں دیگر قریش مشترک نہیں ہیں بلکہ مستثنیٰ ہیں ۔ اس کے علاوہ قریش بعضہم اکفا بعض کونسا قضیہ کلیہ ہے کہ لازمی طور پر اہل بیت رسول کو داخل کر کے قریش کی کفو قرار دیا جائے بلکہ خود قضیہ کے لفظ ہی جزئیت اور بعضیت پر دال ہیں بہر کیف سید زادی غیر سید کا ہم کفو نہیں ہوسکتی اور نہ ہی غیر سید کا سید زادی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے ۔

اگر سائل کہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی تو فرماتے ہیں کہ غیر سید کا نکاح سیدہ کے ساتھ ہوسکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ پہلے تو یہ عبارت ہی الحاقی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس مسئلہ میں کوئی دلیل معتبر بلکہ بالکلیہ دلیل ہی نہیں بیان کی گئی باوجودیکہ مفتیٰ بہ قول قاضی خاں اور امام سرخسی کا گذر چکا ہے کہ غیر کفو میں نکاح نہیں ہوسکتا اور ابن حجر کی تحقیق بھی یہی ہے کہ نکاح منعقد نہیں ہوتا ۔ پھر اعلیٰ حضرت مفتیٰ بہ قول کو ترک کر کے مرجوح قول پر کیسے فتویٰ دے سکتے ہیں ۔ لہذا یا تو یہ انتساب اعلیٰ حضرت کی طرف غلط ہے اور عبارت الحاقی ہے یا بوقت ضرورت جزوی صورت مراد ہے جبکہ تمام اولیاء کو ننگ اور شرم نہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تفقہات ظنیہ سے ہو جو کہ امور مذہبیہ میں قابل اعتماد نہیں ہے دیگر روایات جو کہ ہیں ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ ضرورت شرعیہ عدم استنقاص اولیاء کل جب ہو تو ایک صورت ہے جس کا تعلق مستثنیات سے ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کا نکاح وحی اور الہام پر مبنی تھا اور یہاں پر استنقاص اولیاء بھی نہ تھا اور ضرورت بھی پیش نظر تھی اگر کہیں ضرورت شرعیہ ہو اور تمام ولیوں کے لیے عیب اور عار بھی نہ ہو ۔ اگر ایسے مخصوص حالات میں کوئی جزوی صورت متحقق ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ضابطہ اور کلیہ ہے بلکہ ایک خاص اور استثنائی صورت ہے جس میں

حل مبحث سے کسی قسم کا لگاؤ اور تعلق نہیں اعلیٰحضرت کی عبارت کا بھی یہی مفہوم اور مصداق ہے
ورنہ محافظ ناموس رسالت اور عاشق رسول نہایت درجہ متقی اور پرہیزگار ہے ایسے اقوال کا صادر ہونا عمل
اور علم کے درمیان تضاد کے ماسوا کچھ نہیں ہے۔ اتنی عظیم شخصیت سے تضاد بھی ناممکن ہے تو پھر
لازماً الحاقی صورت ہوگی یا مخصوص صورت اور استثنائی ہوگی۔ بہر نوع صورت مستفسرہ میں نکاح
غیر سید کا سیدزادی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ بنام
الادلۃ القاطعہ فی نکاح اولاد فاطمہ لکھا ہے جس میں تفصیل سے لکھا ہے کہ
سیدہ فاطمیہ کا نکاح غیر سید کے ساتھ بنیادی طور پر منعقد نہیں ہوسکتا بالخصوص ہمارا زمانہ نہایت
شر اور فساد کا زمانہ ہے اس میں ہرگز غیر سید کا نکاح سیدزادی کے ساتھ نہ کیا جائے ورنہ
سادات کرام کا ادب اور احترام بالکلیہ ختم ہو جائے گا جو کہ معتقدات اہل السنۃ والجماعۃ میں شامل ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ محمد اکرم نے
اپنے دونوں لڑکوں کا نکاح علم دین کی دو لڑکیوں کے ساتھ کیا ہے ایک بھائی کا ایک بہن کیساتھ
اور دوسرے بھائی کا دوسری بہن کے ساتھ۔ رات کے وقت جو بڑے بھائی کی بیوی تھی وہ چھوٹے
کے پاس چلی گئی اور چھوٹے کی بیوی بڑے بھائی کے ساتھ رات کو جمع ہوگئی۔ اب شرعی طور پر
ان کا حکم بمعہ حوالجات کتب فقہ تحریر فرمائیں۔ بینوا وتوجروا۔

ضیا احمد از لاہور

الجواب بعونہ تعالیٰ

سائل نے یہ صورت از خود فرض کر لی ہے اگر حقیقتاً یہ واقع ہوا ہے تو اس کا جواب علماء
نے یہ دیا ہے:

فاجابوا بان کل واحد یجتنب اللتی وطیھا وتعتد لتعود الی زوجھا

یعنی وہ دونوں خاوند ان عورتوں سے پرہیز کریں اور عورتیں عدت بیٹھیں بعد از عدت اپنے خاوندوں کی طرف رجوع کریں۔ یہ واقعہ جو سائل نے ذکر کیا ہے ایک مرتبہ امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں بھی ہوا تھا تو آپ نے یہ جواب دیا تھا،

ان رضی کل واحد بموطوئته یطلق کل واحد زوجته و یعقد علی موطوئته ویدخل علیها فی الحال لانہ صاحب العقد ولا عدۃ الطلاق علیها لان کل واحد منها لم یطأ المطلق (عمدۃ الرعایہ صـ۱۴۵)

یعنی اگر وہ ان عورتوں کے ساتھ ہی راضی ہو گئے ہیں جن کے ساتھ انہوں نے جماع کیا ہے تو وہ اپنی اپنی منکوحہ کو طلاق دے دیں اور جن کے ساتھ جماع کیا ان کیساتھ نکاح کریں اور ان کی عدت بھی کوئی نہیں ہوگی کیونکہ جن کو طلاق دی گئی ان کے ساتھ جماع نہیں ہوا، عدت کیسے ہو۔ صورت مسئولہ میں اگر وہ دونوں بھائی اپنی منکوحہ بیویاں رکھنی چاہتے ہیں تو دونوں عورتوں کو کہا جائے گا کہ وہ عدت بیٹھیں۔ بعد از عدت اپنے اپنے خاوندوں کی طرف چلی جائیں۔ اگر وہ دونوں بھائی اپنی اپنی موطوءہ (جن کے ساتھ جماع ہوا ہے) رکھنا چاہتے ہیں تو اپنی اپنی منکوحہ کو طلاقیں دیں اور جن کے ساتھ جماع کیا ہے ان کے ساتھ نکاح کر لیں۔ اب عدت گزارنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ذریں مسئلہ کہ والدہ کے چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب بمعہ حوالہ جات کتب تحریر کریں۔

صوفی احمد دین نزد نارنگ منڈی ضلع شیخوپورہ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ نکاح درست اور جائز ہے فتاویٰ نظامیہ میں جزئیہ صریحیہ لکھا ہے کہ والدہ کے چچا کی لڑکی چونکہ محرمات سے نہیں ہے لہٰذا اس کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ قرآن پاک میں ہے؛

واحل لکم ما وراء ذالکم

کہ ماسوائے محرمات کے تمہارے لیے عورتیں حلال کی گئی ہیں۔ یہ لڑکی بھی ماسوائے محرمات کے ہے لہذا اس کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

وَاللهُ وَرَسُولُہٗ اَعْلَمُ بالصّواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ایک عورت حاملہ زنا سے ہے۔ کیا اس کا نکاح اگر کسی سے کیا جائے تو جائز ہے یا نہیں۔ شرعی حکم تحریر فرمایا جائے۔

جمال دین سنکھترہ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جو عورت زنا سے حاملہ ہے اس کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے خواہ زانی سے نکاح کیا جائے یا غیر زانی سے۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

رجل اتھم بامراۃ ظھر بھا حبل فزوجھا ابوھا منہ والزوج ینکر ان یکون الحبل منہ جاز النکاح۔

ایک مرد ایک عورت کے ساتھ متہم ہوا اس کو حمل ہوگیا اس لڑکی کے باپ نے اسی مرد کے ساتھ نکاح کو دیا اور خاوند اس کا منکر ہے کہ اس کا حمل ہے۔ یہ نکاح جائز ہے۔

ہدایہ میں ہے:

وان تزوج حبلی من زنا جاز النکاح ولا یطاءھا حتی تضع حملھا۔

اور اگر حاملہ بالزنا سے نکاح کیا ہے تو جائز ہے اور اس کے ساتھ جماع نہ کرے جب تک وضع حمل نہ ہو جائے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: جب عورت نے اس مرد کے ساتھ نکاح کیا ہے جس کے

ساتھ پہلے زنا کیا ہے اور اس کو حمل ہو گیا ہے فالنکاح جائز عند الکل یہ تمام کے نزدیک نکاح جائز ہے اور اس کے لیے تمام کے نزدیک جماع بھی جائز ہے اور یہ عورت نفقہ کی بھی مستحق ہوگی۔ صورت مسئولہ میں نکاح جائز ہے خواہ زانی کے ساتھ کیا جائے یا غیر زانی کے ساتھ لیکن اگر زانی کے ساتھ ہوا ہے تو پھر یہ زانی عورت کے ساتھ جماع بھی کر سکتا ہے۔ اگر غیر زانی کے ساتھ نکاح ہوا ہے تو نکاح جائز ہے لیکن یہ نکاح کرنے والا اس کے ساتھ جماع نہ کرے حتیٰ کہ وضع حمل ہو جائے۔ وضع حمل کے بعد جماع کرے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ: ایک لڑکی سنی العقیدہ تھی اس کا نکاح مقصود احمد سے کیا گیا جو عقیدتاً شیعہ تھا۔ کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب شرعی رُو سے بتایا جائے۔

سائل: محمد نواز و بینہ والا ضلع گوجرانوالہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں بنیادی طور پر نکاح منعقد نہیں ہوا کیونکہ شیعہ رافضی مرتدین اور کفار سے ہیں۔ ردالمحتار میں ہے:

وبهذا ظهر ان الروافض ان كان ممن يعتقد الالوهية في علي او ان جبريل غلط في الوحي او كان ينكر صحبة الصديق او يقذف السيدة الصديقة فهو كافر لمخالفة القواطع المعلومة من الدين بالضرورة۔

یعنی اگر شیعہ حضرت علی علیہ السّلام کو خدا تصوّر کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ جبریل نے وحی لانے میں غلطی کی ہے یا ابوبکر صدیق کی صحبت کے منکر ہیں یا صدیقہ علیہا السّلام کو متہم

گردانتے ہیں تو وہ کافر ہیں کیونکہ وہ قطعی ضروریات دین کے منکر ہیں لہذا ان کے کفر میں کسی قسم کا شک نہیں ہے بلکہ من شك فی کفرہ وعذابہ فقد کفر (جو ان کے کفر میں شک کرے وہ خود کافر ہے) ۔ فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ جزئیہ صریحہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:
معاذ اللہ رافضی قاذف باجماع مسلمین کافر ملعون ہے یہاں تک کہ جو ان کو کافر نہ جانے وہ خود کافر ہے ۔ شامی میں ہے:

لا شك فی تکفیر من قذف السیدۃ الصدیقۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا ۔

اسی کے باب البغاۃ میں ہے: لان ذالك تکذیب صریح القرآن ۔ جو شخص اپنی دختر یا خواہر ایسے رافضی کے نکاح میں دے وہ یقیناً دیوث ہے وہ اپنی بیٹی یا بہن صریح زنا کے لیے دینے والا ہے کیونکہ شیعہ یقیناً قطعاً اجماعاً کافر مطلق ہیں اور ان کے احکام مرتدین والے ہیں ۔ فتاویٰ ظہیریہ و فتاویٰ ہندیہ وحدیقہ وغیرہا میں ہے:

احکامھم احکام المرتدین ولا نکاح لمرتد مع احد اور مرتد کا

اور مرتد کا نکاح کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتا لہذا صورت مستفسرہ میں بالکلیہ نکاح نہیں ہوا کیونکہ روافض کے کفر اور ارتداد میں کسی قسم کا شک نہیں ہے ۔ جب بنیادی طور پر نکاح منعقد نہیں ہوا تو اب وہ سنی لڑکی اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے شرعی طور پر نکاح کر سکتی ہے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک مرد نے نکاح کیا پھر وہ سفر میں چلا گیا ۔ اس کو چار یا پانچ سال ہو چکے ہیں وہ باہر ہی ہے ۔ عورت نے تین سال بعد لڑکا جنا کیا یہ لڑکا حلال کا ہوگا اور اسی مرد کا ہوگا جس نے نکاح کیا ہوا ہے یا حرام ہوگا ۔ لوگ کہتے ہیں یہ لڑکا اس کا کیسے ہوسکتا ہے جو کہ چار یا پانچ سال سے سفر میں گیا ہوا ہے ۔ بینوا توجروا
غلام حسین پنڈدادنخاں ضلع جہلم ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ لڑکا حلال کا سمجھا جائے گا اور نسب ثابت ہوگا اور اسی مرد کا ہوگا جس کا عورت کے ساتھ نکاح ہوا ہے۔ ہدایہ صد ۱۴۹ میں ہے:

وان جاءت به لستة اشهر فصاعداً يثبت نسبه منه اعترف به الزوج او سكت لان الفراش قائم والمدة تامة ـ

اور اگر چھ ماہ یا زائد مدت میں بچہ جنا ہے تو اس خاوند کا بچہ ہوگا خواہ خاوند اقرار کرے یا خاموش رہے کیونکہ فراش (یہ عورت اسی مرد کی ہے)، قائم ہے اور مدت بھی مکمل ہے اور شرح وقایہ میں ہے کہ منکوحہ نے چھ ماہ کی مدت میں وقت نکاح سے کہ بچہ جنا (نسب ثابت ہوگا) خواہ خاوند اقرار کرے یا خاموش رہے۔ فان ثبوت نسب ولد المنكوحة لا يحتاج الى الاقرار۔ کیونکہ منکوحہ کے لڑکے ثبوت نسب اقرار کے محتاج نہیں ہیں۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ نکاح صحیح میں نسب ثابت بغیر دعویٰ کے ہو جائے گا اور محض انتفاء کے ساتھ منتفی نہیں ہوگا اور درمختار میں ہے:

وقد اكتفو بقيام الفراش بلا دخول كتزوج المغربي بمشرقية بينهما مسافة سنة فولدت لستة اشهر منذ تزوجها لتصور كرامته ـ

اور فقہاء نے ثبوت نسب کے لیے قیام فراش کو بغیر دخول کے کافی سمجھا ہے جیسا کہ مغربی مرد مشرقی عورت کے ساتھ نکاح کرے اور ان کے درمیان ایک سال کی مسافت ہو پھر عورت وقت نکاح سے لے کر چھ ماہ کی مدت یا اس کے بعد بچہ پیدا کرے تو نسب ثابت ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بطور کرامت پہنچ گیا ہو اور اس نے جماع کر لیا ہو۔ مولوی عبدالحیٰ لکھتے ہیں کہ فقہاء نے کہا ہے۔ اگر مشرقی مرد نے مغربیہ عورت سے نکاح کیا ہے اور اس کے وصول کا عورت کی طرف علم نہیں ہو سکا یا حبشی سے نکاح کیا ہے وہ مرد غائب

ہو گیا ہے اور خلوت نہیں ہوئی اور عورت نے بچہ جن دیا ہے نسب ثابت ہو گا کیونکہ ممکن ہے کہ اس مرد کا وصول عورت کی طرف بلحاظ کرامت ہو گیا ہو۔ لہذا صورت مسئولہ میں نسب ثابت ہو گا اور یہ لڑکا اپنے والد کا ہو گا کیونکہ نکاح بھی صحیح ہے اور فراش کا قیام بھی ہے۔ فقہائے کرام کی عبارات سے جیسا یہ ثابت ہوا کہ جب فراش کا قیام ہو اور نکاح کا بھی ثبوت ہو تو نسب ثابت ہو جائے گا اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ اولیاء کی کرامتیں برحق ہیں اور ان کا تصرف بھی متحقق ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک شخص ایک عورت کے ساتھ پہلے زنا کرتا رہا اب اس عورت نے اپنی لڑکی کی شادی اس مرد زانی کے ساتھ کر دی ہے اس کے نکاح کا کیا حکم ہے اور پھر ایسے مرد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور تعلقات رکھنے کہاں تک صحیح ہیں۔ باحوالہ کتب فقہ جواب تحریر فرمائیں۔

صوفی نذیر احمد۔ نور کوٹ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ نکاح مذکور باطل اور ناجائز ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

وفرع مزنیۃ ای یحرم علی المرء فرع مزنیۃ۔

مرد زانی پر مزنیہ عورت کی لڑکی حرام ہے اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

فمن زنی بامرأۃ حرمت علیہ امھا وان علت وابنتھا وان سفلت

اور جو شخص کسی عورت کے ساتھ زنا کرے اس پر اس کی ماں اور اس سے اوپر تک حرام ہو جائیں گی اور مزنیہ کی بیٹی اور اس سے نیچے آخر تک بھی حرام ہو جائیں گی۔ ان عبارات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ مزنیہ کی بیٹی زانی پر حرام ہے اور یہ نکاح ناجائز ہے۔ ایسے شخص کیساتھ

بیٹھنا اور کھانا پینا تعلقات کا قیام بھی ہرگز نہ چاہیئے۔ حدیث میں ہے:

اذا لقیت الفاجر فالقہ بوجہ خشن۔ (تفسیر فتح العزیز)

جب تو فاجر گنہگار کے ساتھ ملاقات کرے تو اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہیئے

اور حقائق التنزیل میں ہے:

من صح ایمانہ واخلص توحیدہ فانہ لا یأنس الی مبتدع ولا یجالسہ ولا یواکلہ ولا یشاربہ ویظہر من نفسہ العداوۃ۔

جس کا ایمان صحیح اور توحید خالص ہو وہ بدمذہب کے ساتھ محبت نہیں رکھتا اور نہ اس کے ساتھ بیٹھتا ہے اور نہ اس کے ساتھ کھاتا ہے اور نہ اس کے ساتھ پیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ دلی طور پر عناد رکھتا ہے اور جو بدمذہب کے ساتھ محبت کا اظہار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے نور ایمان ختم کر دیتے ہیں۔ بہرصورت مستفسرہ صورت میں نکاح حرام اور ناجائز ہے اس مرد کو چاہیئے کہ جس عورت کے ساتھ نکاح کیا ہے اس کو جدا کر دے اور ایسے آدمی کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے۔ اب وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر رکھے یا نہ رکھے، شرعی فیصلہ سے مطلع کیا جائے۔

خالد محمود صدیقی ضلع جھنگ چک نمبر گ ب۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں واقعی گواہوں سے ثابت ہو جائے کہ اس نے اپنی بیوی کی ماں (ساس) کے ساتھ زنا کیا ہے تو پھر اس مرد پر اس کی بیوی حرام ہو جائے گی لیکن نکاح بھی نہیں ٹوٹے گا اس پر فرض ہے کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے ورنہ سخت گنہگار ہوگا۔ در مختار میں ہے:

بحرمۃ المصاھرۃ لا یرتفع النکاح حتی لا یحل لہ التزوج

باٰخر الا بعد المتارکۃ وعبارۃ الحاوی[1] الا بعد تفریق القاضی او

بعد المتارکۃ۔

خاوند کو چاہیئے کہ اپنی عورت کو چھوڑ دے کیونکہ یہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی ہے اس کو وہ نہیں رکھ سکتا جب تک یہ عورت کو چھوڑ نہ دے وہ آگے کسی دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح بھی نہیں کر سکتی کیونکہ نکاح ابھی تک مرتفع نہیں ہوا۔ اس مرد پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی سے تعلقات ختم کر دے اور اس کو چھوڑ دے۔ پھر وہ اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے شرعاً نکاح کرے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے ہندہ کے ساتھ نکاح کیا لیکن یہ نکاح حلالہ کے لیے تھا۔ زید نے نکاح کے وقت حلالہ کی نیت بھی کی تھی پھر زید نے طلاق دے دی۔ کیا حلالہ صحیح ہوگیا ہے یا نہیں۔ بعض لوگوں سے سنا گیا ہے کہ حلالہ کی نیت نہیں کرنی چاہیئے۔

محمد اصغر کینٹ کھاریاں ضلع گجرات۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ نکاح حلالہ کا بھی صحیح ہے اور پہلے مرد کے لیے یہ عورت حلال ہوگئی ہے اور حلالہ کی شرط نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ شرط تحلیل (حلالہ) مکروہ ہے لیکن اگر شرط کرلیں تو پھر بھی نکاح صحیح ہوگا اور یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

---

[1] حاوی القدسی المتوفی ۵۷۹ھ ۱۲۔

والحاصل انہا اذا تزوجت ومن قصد ہما التحلیل الا انہما لم یشترطاذالک حلت للاول فان شرط الاحلال فی القول و تزوجہا علی ذالک صح النکاح وتحلل الاول فی قول ابی حنیفۃ ویکرہ ذالک ۔

خلاصہ یہ ہے جب اس عورت نے نکاح کیا اور ان دونوں کا قصد حلالہ ہے مگر وہ شرط نہیں کرتے ۔یہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی ۔اگر انہوں نے حلالہ کی شرط کرلی ہے اور اسی شرط پر نکاح ہوا ہے تو نکاح صحیح ہے اور امام ابوحنیفہ کے قول پر یہ عورت پہلے مرد کے لیے حلال ہو جائے گی اور ایسی شرط لگانی مکروہ ہے ۔فتاوی عالمگیریہ میں ہے :

ولو شرطا یکرہ وتحل عند ابی حنیفۃ کذا فی الخلاصۃ وھو الصحیح

اور در مختار میں ہے :

اما اذا اضمر ذالک لا یکرہ وکان الرجل ماجورا لقصد الاصلاح وتاویل اللعن اذا شرط الاجر ذکرہ البزازی ۔

جب دل میں حلالہ کی نیت ہے تو کراہت نہیں ہے اور اگر مرد نے اصلاح کا قصد کرتے ہوئے نکاح کیا ہے تو ثواب کا مستحق ہوگا اور حدیث میں جو محلل اور محلل کے لیے لعنت کا ذکر ہے ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نکاح حلالہ پر مرد نکاح کرنے والا اجرت کا مطالبہ کرے تو پھر وہ مستحق لعنت ہے یعنی پہلا خاوند کہتا ہے کہ تو نکاح کرکے میری بیوی میرے لیے حلال کر دے میں تجھے اتنی رقم دوں گا ۔ ایسے نکاح میں حضور علیہ السّلام نے محلل اور محلل لہ کے لیے لعنت فرمائی ہے اور صورت مسئولہ میں نکاح صحیح ہے اور جو نیت اس نے کی ہے اس کا اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کراہت ہے ہاں شرط تحلیل پہ نکاح ہو تو پھر کراہت ہوتی ہے لیکن نکاح

پھر بھی صحیح ہوتا ہے اور عورت اپنے سابقہ خاوند کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نکاح ہونے کے بعد جو یہ رسم ہے کہ چھوہارے اور بادام وغیرہ تقسیم کرتے ہیں اور لوگوں پر پھینکتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے۔

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالیٰ

چھوہارے اور بادام وغیرہ پھینکنے جائز ہیں۔ نفع المفتی والسائل صفحہ ۱۳۲ میں ہے:

لا باس به کما فی السراجیه۔ یعنی اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وفی شرعة الاسلام نثر السکر واللوزة علی رأس الزوج وانتهاب القوم به تبرکا به ثبت بالآثار والاخبار۔

اور شرعۃ الاسلام میں ہے کہ کھانڈ بادام خاوند کے سر پر پھینکنے اور قوم اور لوگوں کا ان کو اچکنا تبرک سمجھتے ہوئے آثار اور اخبار کے ساتھ ثابت ہے۔ بہرصورت نکاح کے منعقد ہونے کے بعد چھوہارے بادام، کھانڈ وغیرہ تقسیم اور ان کو لوگوں کی طرف پھینکنا اور دولہا کے سر سے لطور تبرک پکڑنا جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے۔ اخبار اور آثار سے بھی ثبوت جواز ہی ہے بلکہ بطور تبرک پکڑنا امر مستحسن ہے۔

وَاللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ نابینا حافظ ہے اس نے نکاح پڑھایا ہے کیا نابینا آدمی نکاح پڑھا سکتا ہے۔ جو حکم شرعی ہو اس کے متعلق آگاہ کریں۔

خان محمد اکرم خاں از مریدکے ضلع گوجرانوالہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نکاح ہوجائے گا۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے: اگر نکاح پڑھانے والا نابینا ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

کما نص علیہ فی المتون کالکنز والوقایہ والمختار والھدایۃ والملتقی والتنویر وغیرھا۔

نکاح پڑھانے والے کی بینائی کی کیا ضرورت ہے کہ وہ خود نکاح کے لیے ضروری نہیں ہے کیونکہ عاقدین کا باہمی ایجاب وقبول کافی ہے۔ بہرکیف نکاح اگر نابینا نے پڑھایا تو ہوجائے گا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ نکاح کا خطبہ قبل از نکاح مسنون ہے یا بعد از نکاح۔ بینوا و توجروا۔

نکاح رجسٹرار۔ حلقہ سمبڑیال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نکاح کا خطبہ ایجاب وقبول سے پہلے پڑھا جائے۔ فقہاء فرماتے ہیں:

والفرق ان النکاح لا یخلوا عن تقدم الخطبۃ والخطبۃ۔

کہ نکاح میں خطبہ (منگنی) اور خطبہ مقدم ہوتا ہے۔ درمختار میں ہے:

یندب اعلانہ وتقدیم خطبۃ وکونہ فی مسجد یوم الجمعۃ۔

اور نکاح کا اعلان اور پہلے خطبہ اور جمعہ کے دن اور مسجد میں ہونا مستحب ہے۔ معلوم ہوا کہ نکاح سے پہلے خطبہ پڑھنا مستحب ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ محمد اسماعیل کی حقیقی بہن ہے اور اس حقیقی بہن کی ایک رضاعی بہن ہے اب محمد اسماعیل اس رضاعی بہن کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟

حافظ محمد اسلم خطیب دھنیالہ ضلع جہلم۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نکاح کر سکتا ہے بشرطیکہ محمد اسماعیل کی حقیقی بہن نے اس رضاعی بہن کی ماں کا دودھ پیا ہے یا دونوں بہنوں نے کسی تیسری عورت کا دودھ پیا ہے کیونکہ رشتہ سبب حرمت نہیں ہے۔ ہاں اگر اسماعیل کی حقیقی بہن کی رضاعی بہن نے اس کی ماں کا دودھ پیا ہے تو وہ خود اس کی رضاعی بہن ہوئی پھر نکاح نہیں ہوگا کیونکہ ایسی رضاعی بہن کیساتھ نکاح حرام ہے۔

فتاوی رضویہ ج۵ ص۹۱ میں ہے کہ حقیقی بہن کی رضاعی بہن ہونا خود یہ رشتہ موجب حرمت نہیں ہے جبکہ اس کے ساتھ کوئی وجہ حرمت نہ پائی جائے مثلاً اگر حقیقی بہن کی رضاعی بہن یوں ہے کہ اس نے اس کے ماں یا باپ کا دودھ پیا ہے تو وہ خود اس کی بھی رضاعی بہن ہوئی اور اس پر حرام ہے اور اگر یوں ہے کہ اس کی بہن نے اس لڑکی کی ماں کا دودھ پیا ہے یا دونوں نے تیسری عورت کا دودھ پیا ہے جس سے اس کو کوئی علاقہ نہیں ہے تو اس صورت میں وہ لڑکی رضاعی بہن اس مرد پر حرام نہیں ہے۔ بہر صورت محمد اسماعیل کی حقیقی بہن نے اگر اپنی رضاعی بہن کی ماں کا دودھ پیا ہے یا دونوں بہنوں نے کسی تیسری عورت کا دودھ پیا ہے تو نکاح جائز ہے۔

وَاللهُ وَرَسُولُهٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں۔ جواب مدلل بحوالجات کتب فقہ ارقام فرمائیں۔

مسمی الٰہی بخش کے سات پسران تھے۔ ضلع ملتان میں ان کی برادری میں بٹہ کا رواج ہے۔ الٰہی بخش مذکور نے اپنے بیٹے علی محمد کا رشتہ قادر بخش کی بیٹی سے طے کیا۔ یہ ہر دو بالغان تھے اور قادر بخش کو اس کے بٹہ میں الٰہی بخش نے برضامندی غلام حسین پسر خود اپنی پوتی نابالغہ دختر غلام حسین کا رشتہ اللہ دتہ نابالغ پسر قادر بخش کو دینا منظور کیا۔ الٰہی بخش کے ساتوں لڑکے اپنے باپ کے اس کی سربراہی میں آباد اکٹھے تھے۔ دختر قادر بخش بالغہ کا نکاح مسمی علی محمد بالغ پسر الٰہی بخش سے ہوگیا۔ یہ دونوں گھرانوں کی رضامندی سے دختر غلام حسین نابالغہ پوتی الٰہی بخش کی شادی کی تاریخ برضا و رغبت جس میں غلام حسین کی رضامندی شامل تھی مقرر کی گئی۔ قادر بخش مذکور اپنے پسر اللہ دتہ نابالغ کی باقاعدہ برات بہمراہی کثیر التعداد باراتیاں الٰہی بخش کی بھیانی لے گیا۔ اللہ دتہ نابالغ کا نکاح منظوری و رضامندی قادر بخش والد بہمراہ دختر غلام حسین نابالغہ باجازت الٰہی بخش دادا حقیقی روبرو و برادری حاضر آمدہ پڑھا گیا۔ الٰہی بخش نے جملہ لوازمات برات بردے کار لائے بارات کو دعوت دی۔ بوقتِ نکاح غلام حسین والد دختر نابالغہ بگار میں ملتان شہر ملکوں کے پاس بھیجا ہوا تھا۔ جو بوقتِ نکاح انعقاد موقعہ نکاح سے غائب تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں دادا حقیقی کی اجازت سے نکاح ہوا۔ غلام حسین چند دن بعد واپس آیا، نکاح پر کوئی اعتراض نہ کیا اس نکاح کے دو سال بعد تک الٰہی بخش زندہ رہا کوئی اعتراض نہ ہوا نکاح سے تقریباً دو سال بعد الٰہی بخش فوت ہوگیا ازاں بعد غلام حسین اپنے بھائیوں سے علیحدہ ہوگیا۔ پانچ چھ سال تک اس نکاح دختر پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ دریں اثنا دختر غلام حسین بالغہ ہوگئی۔ بوقت بلوغ لڑکی نے نکاح فسخ کرانے کا کوئی اعلان نہیں کیا اور نہ ہی اس پر اس نے کوئی اعتراض کیا۔ کچھ لوگوں کے

بہکانے سے اس منکوحہ غلام حسین کا نکاح ثانی غلام حسین نے دوسری جگہ کر دیا۔ غلام حسین نے قادر بخش کو دوسرا رشتہ بٹے میں دینے کو کہا۔ اس نے کہا میں ایک رشتہ پہلے دے چکا ہوں جو آباد ہے دوسرا نہ دوں گا۔ شنید ہے غلام حسین نے کسی مولوی سے فتویٰ لیا ہے کہ پہلا نکاح نہیں ہوا تھا لہذا دوسرا نکاح اس لڑکی کا کر دیا گیا اولاد والی ہو گئی اور دوسرے خاوند کے گھر لڑکی آباد ہو گئی۔ حالات مندرجہ بالا کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور کا شرعی فقہی مدلل جواب مطلوب ہے۔

۱۔ کہ کیا مندرجہ حالات کی روشنی میں پہلا نکاح درست ہے یا نہیں؟

۲۔ یہ کہ اگر پہلا نکاح درست ہے تو دوسرے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۳۔ یہ کہ ان حالات میں یہ لڑکی کس کی زوجہ شرعی منکوحہ ہے۔ اگر پہلا نکاح درست ہے تو دوسرا نکاح پڑھانے والوں کے متعلق شرعی حکم کیا ہے۔

قادر بخش بھٹی۔ ساکن موضع عمر پور تحصیل و ضلع ملتان۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں جب نکاح دادا (ولی ، البعد) نے بعدم موجودگی (ولی اقرب) باپ کے کیا ہے تو یہ نکاح باپ کی اجازت پر موقوف ہے۔ در مختار میں ہے:

فلو زوج الابعد حال قیام الاقرب توقف علی اجازتہ۔

اور عدم موجودگی بھی غیبت غیر منقطعہ ہو۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولو زوجها الابعد حال قیام الاقرب حتی توقف علی اجازۃ الاقرب

فتاویٰ نظامیہ میں ہے: اگر ولی بعید نے نکاح کیا ہے تو ولی بمجرد اطلاع کے اس نکاح کی اجازت نہ دے تو نکاح ناجائز وغیر نافذ ہے۔

فتاویٰ رضویہ میں ہے: ولی الابعد ولی اقرب کی غیبت غیر منقطعہ میں نکاح کر دے تو ولی اقرب کی اجازت پر موقوف ہے۔

اگر غلام حسین نے اس وقت اجازت صراحتہً یا دلالتہً دے دی ہے کہ کہا ٹھیک کیا ہے یا حق مہر قبول کر لیا ہے تو پھر الٰہی بخش کا کیا ہوا نکاح ہی حقیقت میں نکاح ہے۔ دوسرا غلام حسین نے جو بعد میں نکاح کیا ہے وہ صحیح نہیں ہوا اور یہ اللہ دتہ کی شرعی منکوحہ ہے جس کے ساتھ غلام حسین کے باپ نے نکاح کیا تھا۔ اگر غلام حسین نے اس وقت اجازت دے دی تھی تو ولی ابعد دادا کا نکاح کیا ہوا ہی صحیح ہے۔ اب جس نے نکاح پڑھایا ہے وہ اپنے نکاح کی تجدید کرے اور توبہ و استغفار کرے۔ بعد از بلوغ لڑکی کے فسخ یا اعتراض کا صورت مذکورہ میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

اذا بلغ الصغیر او الصغیرۃ قد زوجھا الاب والجد فلا خیار لھما۔

جب باپ یا دادا نے نکاح نابالغ بچے یا بچی کا کیا تو ان دونوں کو بعد از بلوغت نکاح فسخ کرانے کا حق اختیار نہیں ہے۔ باپ اور دادا کے نکاح میں بعد از بلوغت لڑکی کی نجات طلاق یا خاوند کی موت میں ہے۔ بہرکیف اگر غلام حسین نے اجازت صراحتہً یا دلالتہً دے دی تھی تو نکاح الٰہی بخش کا کردہ صحیح ہوا۔ غلام حسین کی خاموشی صرف اجازت تصور نہ ہو گی بلکہ صراحتہً یعنی جو کچھ والد الٰہی بخش نے کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا دلالتہً کسی نے مبارک دی ہے مبارک قبول کر لی ہے یا مہر قبول کر لیا ہے وغیرہ وغیرہ تو پھر پہلا ہی نکاح صحیح ہے اور دوسرا باطل ہے اور ناجائز ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے اپنی بچی کا نکاح بحالت نابالغی کر دیا۔ اب وہی لڑکی نابالغہ منکوحہ غیر موطوءہ مر گئی ہے اور لڑکی کا حق مہر پانچ سو روپیہ مقرر ہوا تھا اور والد نے مطالبہ مہر کا کیا ہے۔ مہر دینے والے لیت و لعل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مہر کوئی نہیں ہے آپ شرعی حکم فرمائیں کہ کیا مہر کا مطالبہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔

غلام حسین ... پالموٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں لڑکی کو کل مہر ملے گا۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

المھر یتاکد ثلث بالوطی و موت احدالزوجین وبالخلوۃ الصحیحۃ۔

اور مہر کا وجوب تین چیزوں سے ہوتا ہے:

۱۔ جماع ہو جائے۔

۲۔ دونوں میاں بیوی سے ایک فوت ہو جائے یا

۳۔ خلوت صحیحہ ہو جائے۔

صورت مذکورہ میں چونکہ لڑکی (زوجہ) فوت ہو گئی ہے لہذا مہر کل کا مطالبہ کیا جائے مہر کو مہر دینا چاہیئے اور مرد پر فرض ہے کہ مہر کو ادا کرے۔

وَاللهُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ میں کہ قاضی خاں نے جو لکھا ہے کہ وقت نکاح رسول اللہ کو گواہ رکھا جائے تو نکاح منعقد نہیں ہوتا بلکہ وہ کافر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خیال رکھتا ہے کہ حضور غیب جانتے ہیں۔ اس عبارت مطلب اور وضاحت تحریر کریں۔ مہربانی ہوگی۔

غلام محی الدین منگلا کالونی $\frac{1}{25}$

الجواب بعونہ تعالیٰ

نکاح میں شہادت اور گواہوں کی موجودگی شرط ہے چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

ن الشہادۃ شرط فی باب النکاح۔

یعنی شہادت نکاح میں شرط ہے اور علامہ فخرالدین قاضی خاں المتوفی سنہ ۵۹۱ھ

اولی میں فرماتے ہیں :

منها الشهادة عندنا ۔

کہ گواہوں کی موجودگی جواز نکاح کے لیے شرط ہے ۔ امام علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی متوفی ۵۸۷ھ فرماتے ہیں کہ چونکہ شہادت ارکان عقد کی شرائط میں سے ہے اور عقد کے رکن ایجاب وقبول ہیں اور قبول کے بغیر عقد کے ایک رکن کا وجود نہیں ہے ۔ پس جس طرح قبول کے حقیقتاً عقد کا ایک رکن موجود نہیں ہوتا اسی طرح شرعاً بغیر شہادت کے اس رکن کا کوئی وجود نہیں ہوتا ۔ لہٰذا نکاح تب ہوگا جبکہ دو گواہ بوقت نکاح موجود ہوں ورنہ نکاح منعقد نہیں ہوگا ۔ شافعیہ کے نزدیک گواہ دونوں مرد ہوں اور احناف کے نزدیک دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں گواہ ہوں جب گواہ مردوں نے ہونا ہے تو اب اگر خدا اور رسول اور ملائکہ کو گواہ کیا تو نکاح نہیں ہوگا ۔ قاضی خاں لکھتے ہیں :

رجل تزوج امراۃ بغیر شهود فقال الرجل والمرأۃ ۔ خدارا و پیغمبر را گواہ کردیم ۔ قالوا یکون کفراً لانه اعتقد ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یعلم الغیب وهو ما کان یعلم الغیب حین کان فی الاحیاء فکیف بعد الموت ۔

یعنی ایک مرد نے ایک عورت سے بغیر گواہوں کے نکاح کیا ۔ پس مرد اور عورت نے خدا اور رسول کو ہم نے گواہ بنایا کہتے ہیں کہ یہ کفر ہوگا ۔ اس لیے کہ اس نے اعتقاد کیا کہ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم غیب جانتے ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ زندگی میں بھی غیب نہیں جانتے تھے پس بعد وفات کیونکر جان سکتے ہیں ۔ دیابنہ اور وہابیہ کہتے ہیں کہ جو حضور علیہ السّلام کو عالم الغیب سمجھتا ہے وہ کافر ہے کیونکہ حضور غیب نہیں جانتے اسی لیے رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نکاح پر گواہ نہیں بن سکتے ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قاضی خاں کی کلام سے تو لازم آئے گا جو خدا تعالیٰ کو عالم الغیب جانے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کو بھی نکاح پر گواہ بنایا جائے تو نکاح نہیں ہوگا ۔

اب خدا کو بھی غیب نہیں ہوگا۔ قاضی خاں کے قول کے مطابق تمام وہابیہ اور دیابنہ کافر ہوں گے
کیونکہ وہابیہ خدا کو عالم الغیب سمجھتے ہیں اور قاضی خاں نے خدا کے گواہ نہ بننے پر بھی نص کر دی
ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی خدا کو بھی گواہ نکاح پر بنائے گا تو نکاح نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ
قاضی خاں کی عبارت میں لفظ قالوا ہے جو کہ قاضی خاں کے نزدیک بلکہ دیگر فقہا کے نزدیک
بھی یہ مقولہ غیر مستحسن ہے۔ قالوا کا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں اختلاف ہو اور قالوا کے
قائلین کا مقولہ غیر پسندیدہ ہوتا ہے۔ علامہ ابن عابدین ردالمحتار ج ۴ ص ۴۲۵ پر لکھتے ہیں:

لفظة قالوا تذکر فیما فیه خلاف۔

یعنی لفظ قالوا وہاں بولا جاتا ہے جہاں اختلاف ہو۔

تملیہ المستملی میں ہے:

کلام قاضی خاں یشیر الی عدم اختیارہ له حیث قال قالوا لا
یصلی علیه فی القعدة الاخیرة ففی قوله قالوا اشارة الی عدم
استحسانه والی انه غیر مروی عن الائمة کما قلنا فان
ذالك متعارف فی عباراتهم۔

قاضی خاں کا کلام ان کی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے
قالوا الخ۔ پس ان کے قالوا کہنے میں اشارہ ہے کہ یہ قول غیر پسندیدہ ہے اور
اماموں سے مروی نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کیونکہ یہ فقہا کی عبارات
متعارف ہے۔

معلوم ہوا کہ قاضی خاں کی عبارت خود قاضی خاں کے نزدیک غیر پسندیدہ ہے
غیر مروی وضعیف و مرجوح ہے۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ فتویٰ دینا اور حکم لگانا حد درجہ
جہالت ہے۔ دیکھئے در مختار ج ۱ ص ۳۰ میں ہے:

ان الحکم والفتیا بالقول المرجوح جهل وخرق للاجماع۔

بے شک ضعیف اور مرجوح قول کے ساتھ حکم کرنا اور فتویٰ دینا جہالت ہے اور خلاف اجماع ہے۔

اب گویا کہ جو حضور علیہ السلام کو عالم غیب کہتا ہے اس کو وہابیہ کا کافر کہنا حد درجہ جہالت ہے شامی صـ۲۷۶ ج۲ میں ہے کہ جو حضور علیہ السّلام کو عالم غیب جانتا ہے وہ کافر نہیں ہوگا۔

لان الاشیاء تعرض علی روح النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم۔

یعنی تمام چیزیں روحِ مصطفیٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم پر پیش کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے حضور علیہ السّلام تمام چیزوں کو جانتے ہیں جب حضور علیہ السّلام عالم الغیب ہوے۔ اب اگر کوئی حضور علیہ السّلام کو نکاح پر گواہ رکھتا ہے تو اس کو اس وجہ سے کافر نہیں کہنا چاہیئے کہ اس نے حضور علیہ السّلام کو عالم الغیب سمجھا ہے اور اس کا نکاح اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حضور کو عالم الغیب سمجھتا ہے۔ پھر تو چاہیئے کہ جو اللّٰہ تعالیٰ کو گواہ رکھے تو نکاح ہو جائے کیونکہ وہابیہ کے نزدیک اللّٰہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہے حالانکہ نکاح پھر بھی نہیں ہوتا۔ نکاح نہ ہونے کی وجہ وہ نہیں ہے جو وہابیہ اور دیابنہ نے سمجھی ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ معاملات کا تعلق باہمی ہوتا ہے اللّٰہ تعالیٰ نے معاملات اور مداینۃ میں عمومی طور پر تعین شہادت کر دیا ہے اور ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔

چونکہ یہ حکم عام ہے اس کے ماتحت ہی فقہاء نے معاہدہ نکاح کے لیے بھی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت رکھی ہے۔ جب آیت مداینہ میں تعین شہادت کر دیا گیا ہے تو اب ایسی شہادت کے سوا نکاح کا انعقاد ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر نکاح کی اجازت سوائے شہادت معینہ کے دی جائے تو پھر لاقانونیت کی مرض اور وبا پھیل جائے۔

ہر مرد اور عورت آوارگی اختیار کرے۔ حسب ونسب اور کفو اور برادری وغیرہ کا ہرگز خیال نہ رکھا جائے بلکہ ہر آدمی یہ کہہ دے گا کہ میرا نکاح فلاں عورت کے ساتھ ہو گیا ہے ہمارے درمیان اللہ اور اس کا رسول گواہ ہے۔ تمدنی حالات بالکلیہ تباہ ہو جائیں۔ آوارگی کا دور دورہ اور معاشرہ میں غیر معمولی بگاڑ پیدا ہو جائے و لہذا شریعت اسلامیہ نے انتظامی امور کو مدّ نظر رکھتے ہوئے شہادت اور گواہوں کی صورت کا تقرر کر دیا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ آجکل اکثر شادیوں میں ڈھول باجے وغیرہ ہوتے ہیں۔ جب باجے وغیرہ حرام ہیں تو نکاح ہو جائے گا یا نہیں۔

صوفی علم دین پیش امام۔ گھنگور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نکاح شرعاً ہو جائے گا کیونکہ نکاح کے انعقاد کے لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت ایجاب وقبول کریں اور گواہ سنتے سمجھتے ہوں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں:

وینعقد بایجاب وقبول عند حرین عاقلین بالغین مسلمین۔

(کنز الدقائق ص ۹۷)

کہ نکاح ہو جاتا ہے کہ جبکہ مرد اور عورت ایجاب وقبول گواہوں کے سامنے کریں جو کہ عاقل بالغ مسلمان ہوں۔ باجے وغیرہ اگرچہ حرام ہیں لیکن نکاح کے لیے مانع نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ باجے شرعاً منع ہیں اور ان کا بجانے والا اور سننے والا فاسق وگنہگار ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

لیکونن فی امتی اقوام لیستحلون الحر والحریر والخمر والمعازف۔

کہ ضرور میری امت میں وہ لوگ ہونے والے ہیں جو حلال ٹھہرائیں گے عورتوں کی شرمگاہ یعنی زنا

اور ریشمی کپڑوں اور شراب اور باجوں کو ۔ (احکام شریعت صہ ۶) اور شادی بیاہ میں باجے وغیرہ نہیں ہونے چاہئیں ۔ اگر شادی میں باجے بجائے گئے ہیں تو یہ گناہ ہے ، لیکن اس سے نکاح کے ہونے میں کوئی دخل نہیں ہے نکاح شرعاً ہو جائے گا ۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ خالد محمود اور محمد زبیر دونوں حقیقی بھائی ہیں ۔ خالد محمود اپنے پوتے محمد طارق کا نکاح محمد زبیر کی لڑکی سکینہ بی بی سے کرنا چاہتا ہے کیا یہ نکاح شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟ بینوا و توجروا ۔

مولوی غلام حسین خطیب جامع مسجد ٹھٹھر والی ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ نکاح جائز ہے کیونکہ سکینہ بی بی محمد طارق کی رشتہ میں پھپھی ہے ، حقیقی پھپھی نہیں ہے اور فتاوی رضویہ میں یہ صریحہ جزئیہ بھی موجود ہے ۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اسی صورت کے جواب میں فرماتے ہیں یہ نکاح جائز ہے کہ حقیقی پھپھی نہیں ، رشتہ کی پھپھی ہے ۔ قال تعالیٰ واحل لکم ما وراء ذالکم (کہ ان محرمات کے علاوہ تمہارے لیے جائز ہیں) جیسے بھتیجی سے بیٹے کا نکاح جائز ہے حالانکہ وہ رشتہ میں اس کی بہن ہے ۔

(فتاوی رضویہ صہ ۱۴۵)

لہٰذا خالد محمود کے پوتے محمد طارق کا نکاح محمد زبیر کی لڑکی سکینہ بی بی کے ساتھ شرعاً صحیح ہے ۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ نکاح کے وقت دولہا اور دلہن کو کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت اور ایمان مجمل اور ایمان مفصل پڑھانے ضروری ہیں یا نہیں ۔ ان کے

سوا بھی نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

ایک سائل از ہڑپہ ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت یا ایمان مجمل اور مفصل پڑھایا جائے تو بہتر ہے فتاویٰ عزیزیہ ص۴۷ میں ہے کہ اکثر لوگوں سے لاعلمی یا سہو سے کلمات کفریہ نکل جاتے ہیں ۔ اس لیے علمار متاخرین نے بطور احتیاط اس کو پسند کیا ہے ۔ پھر یہ کلمات برکت سے خالی نہیں ہیں ۔

فتاویٰ رضویہ میں ص۹۶ پر ہے کہ ذکر خدا و رسول جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم خیر محض ہے ۔ خصوصاً تجدید ایمان کہ ویسے بھی حدیث میں اس کا حکم ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں :

ان الایمان لیخلق فی جوف احدکم کما یخلق الثوب فاسئلوا اللّٰہ تعالیٰ ان یجددوا الایمان فی قلوبکم ۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عمر بسند حسن والحاکم فی المستدرک)

بے شک ایمان تم میں کسی کے باطن میں پرانا پڑجاتا ہے جیسا کہ کپڑا کہنہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ تمہارے دلوں میں ایمان کو تازہ فرمائے ۔ اس کو امام طبرانی سلیمان بن احمد المتوفی ۳۶۰ھ اور حاکم المتوفی ۴۰۵ھ نے روایت کیا ہے ۔

الغرض بوقت نکاح دولہا اور دلہن کو کلمات طیبات اور ایمان مجمل و مفصل پڑھانا بہتر ہے لیکن نکاح کا انعقاد ان پر موقوف نہیں ۔ نکاح تو ان کے سوا بھی ہو جاتا ہے ۔ البتہ بطور برکت پڑھا دیئے جائیں تو بہتر ہے ۔

واللّٰہ و رسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ اکرم دین کی خالہ کی لڑکی سعیدہ ہے کرم دین اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ کرم دین کے بھائی امام دین کے ساتھ اس سعیدہ نے دودھ پیا ہے۔ اب کیا نکاح جائز ہے یا نہیں۔ بینوا و توجروا۔

غلام حسین از رحیم یار خاں۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر سعیدہ نے کرم دین کی والدہ کا دودھ پیا ہے تو شرعاً سعیدہ کرم دین پر حرام ہے کیونکہ ایسی صورت میں کرم دین کی والدہ اس سعیدہ کی مرضعہ (دودھ پلانے والی ماں) ہے اور مرضعہ کی تمام اولاد شرعاً رضیع یعنی دودھ پینے والے پر حرام ہے فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ويحرم على الرضيع ابواه من الرضاع واصولهما وفروعهما من النسب والرضاع جميعاً۔ (ص ۳۴۳)

دودھ پینے والے پر اس کے ماں باپ اور ان کے اصول و فروع نسبی اور رضاعی ہر دونوں طرح سے حرام ہو جاتے ہیں اور صورت مسئولہ میں کرم دین کی سعیدہ رضاعی بہن ہے لہٰذا اس کے ساتھ کرم دین کا نکاح شرعاً حرام ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الطلاق

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محمد اسلم نے بیوی کو کہا کہ تو مجھ پہ حرام ہے اس صورت میں حکم شرعی کیا ہوگا کیا اس عورت کو طلاق ہوگی یا نہیں ؟

ایک سائل از بڈو ملہی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن ہوگی۔ شرح وقایہ میں ہے؛

وانت علی حرام ان نوی به الطلاق فبائنة ۔

اگر کہا تو مجھ پر حرام ہے اس کے ساتھ طلاق کی نیت کرتا ہے تو طلاق بائنہ ہوگی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے : جب عورت کو کہتا ہے تو مجھ پر حرام ہے سئل عن نیتہ مطلق سے اس کی نیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اگر اس نے کہا میری مراد طلاق ہے تو طلاق بائنہ ہوگی وعن المشایخ من یصرفه الی الطلاق من غیر نیته للعرف و علیه الفتویٰ ۔

اور بعض مشایخ نے اس کو طلاق ہی کہا ہے اگرچہ نیت نہ ہو اس پر ہی فتویٰ ہے۔

جب محمد اسلم نے اپنی بیوی کو کہا ہے کہ تو مجھ پر حرام ہے اس سے طلاق بائن ہوگی۔ کیونکہ عرف عام میں حرام سے لوگ طلاق ہی لیتے ہیں۔ لہذا عورت پر طلاق بائن ہو جائے گی۔ اگر محمد اسلم اس مطلقہ عورت کو دوبارہ گھر آباد رکھنا چاہتا ہے تو دوبارہ نکاح کرلے نکاح ہو جائے گا اگر محمد اسلم نہ رکھے تو لبعد از عدت عورت شرعاً جہاں چاہے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ محمود خالد نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور گواہوں سے دو گواہ کہتے ہیں کہ اس نے دو طلاقیں دی ہیں اور دو گواہ کہتے ہیں کہ تین دی ہیں۔ خود محمود خالد مبہم بات کرتا ہے اب شرعی فیصلہ اس کے متعلق کیا ہے۔

محمد اصغر، کھاریاں چھاؤنی ضلع گجرات

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں تین طلاقیں ہوں گی اور جو گواہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے تین طلاقیں دی ہیں ان کی گواہی معتبر ہوگی۔ حموی میں ہے:

ولھذا لتقدم احدی البینتین علی الاخری اذا کانت اکثر اثباتا۔

یعنی جو زیادتی کا اثبات کرے گا اس کی گواہی معتبر ہوگی۔ لہذا جن گواہوں نے تین طلاقوں کے متعلق شہادت پیش کی ہے ان کی شہادت اور گواہی کا اعتبار کرتے ہوئے تین طلاقیں ہی صورت مذکورہ میں متصور ہوں گی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلہ میں کہ منظور احمد نے اپنی بیوی کو کہا کہ تجھ کو میں نے طلاق دی اور تجھ کو میں نے طلاق دی پھر اس کے والد نے اس کو منع کیا وہ

خاموش ہو گیا بس اُس نے اس سے زیادہ کوئی لفظ نہیں بولا ۔ اب کیا منظور احمد اپنی عورت کو گھر آباد کر سکتا ہے نہیں ؟

مقبول احمد ، پسرور ضلع سیالکوٹ ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں دو طلاقیں رجعی واقع ہوئی ہیں ۔ منظور احمد اپنی بیوی کے ساتھ رجوع کر سکتا ہے ۔ عدت کے اندر بلا نکاح رجوع کر لے اور عدت گزرنے کے بعد نکاح کرنا پڑے گا ۔ ہدایہ میں ہے :

واذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية او تطليقين فله ان يراجعها في العدة

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے :

اگر عورت کو کہا تو طالق ہے ، طالق ہے ۔ یا تو طالق ہے ، تو طالق ہے ۔ یا کہا میں نے تجھے طلاق دی ہے ، میں نے تجھے طلاق دی ہے یا کہا تو طالق ہے اور میں نے تجھے طلاق دی ہے ۔ جب عورت مدخول بہا (جس کے ساتھ جماع کیا گیا ہے) ہو تو ان صورتوں میں دو طلاقیں واقع ہوں گی ۔

صورت مسئولہ میں دو طلاقیں ہوں گی جو کہ رجعی ہوں گی ۔ منظور احمد اپنی بیوی کے ساتھ رجوع کر لے یا زبانی کہہ دے کہ میں نے بیوی کے ساتھ رجوع کیا ہے یا اس کے ساتھ جماع کرے یا اس کو ہاتھ وغیرہ لگا دے تو رجوع ہو جائے گا ۔ اگر عدت گزر چکی ہے تو پھر دوبارہ نکاح کرے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ عورت کو بلا وجہ

طلاق دینی جائز ہے یا نہیں اور سنا ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام عورتوں کے ساتھ نکاح کر کے طلاق دے دیتے تھے۔ یہ حوالہ کس کتاب میں ہے۔

ایک سائل نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

طلاق دینی دو قسم پہ ہے۔ ایک سنت اور دوسری مباح۔

سنّت یہ ہے کہ بلا وجہ طلاق نہ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتے اور طلاق بحالت مجبوری جائز رکھی گئی ہے اور دوسری مباح یہ ہے کہ آدمی اس میں مختار ہے۔ اگر بلا وجہ بھی طلاق دے تو طلاق کا وقوع ہو جاتا ہے۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فتاویٰ عزیزیہ صـ۲۴۷ میں طلاق دینے کی تقسیم لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مباح صورت میں بھی ثواب نکاح کی زیادتی اگر مقصود ہو تو یہی امر قریب سنّت ہو جاتا ہے بلکہ خلفاء راشدین کی سنّت میں داخل ہے چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام المتوفی ۵۹ھ عورتوں کو نکاح کرتے تھے اور پھر ان کو طلاق دے دیتے تھے اور دوسری عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے مگر اس میں حضرت امام حسن علیہ السلام کا مقصد ثواب ہوتا تھا۔ پس اس قدر بسبب طلاق کے مسنون ہونے میں کافی ہے۔ لوگوں نے حضرت امام حسن علیہ السلام سے اس طلاق دینے کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے سبب بہت سی قوم کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصاہرت کا رشتہ پیدا ہو جائے اور وہ محشر کے دن ان کے حق میں کار آمد ہو۔
بہر صورت بلا وجہ طلاق نہ دینی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ امر مبغوض ہے۔ اگر کوئی وجہ ہو مثلاً زوجہ نافرمان ہے یا شریعت اسلامیہ کے خلاف قدم اٹھاتی ہے تو پھر طلاق دینی جائز ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے طلاق نامہ

لکھوایا اور خود دستخط کر دیئے اور اب وہ کہتا ہے کہ میں نے زبان سے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ آپ حکم شرعی تحریر فرمائیں کہ طلاق ہو گی یا نہیں۔

صوفی نذیر احمد مقام مانک نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں طلاق ہو جائے گی خواہ طلاق نامہ خود لکھے یا کسی سے لکھوا کر خود دستخط کر دے کیونکہ کتابت اور لکھنا بمنزلہ خطاب و عبارت کے ہے۔ اشباہ میں ہے:

قال فی الھدایۃ والکتاب کالخطاب۔

یعنی کتابت مثل خطاب کے ہے۔

وان کتب امراتہ طالق فھی طالق۔

اگر اس نے لکھا ہے کہ اس کی عورت طالق ہے تو طلاق ہو جائے گی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

رجل استکتب من رجل آخر الی امراتہ کتابا بطلاقھا وقرأہ علی الزوج فاخذہ وطواہ وختم وکتب فی عنوانہ وبعث الی امراتہ فاتاھا الکتاب واقر الزوج انہ کتابہ فان الطلاق یقع علیھا۔

ایک مرد نے دوسرے مرد سے طلاق نامہ لکھوایا اس نے طلاق نامہ لکھ کر خاوند کے سامنے پڑھا اور اس نے اس کو پکڑا اور لپیٹا اور اس پر مہر لگائی اور اس کا پتہ لکھ کر عورت کو طلاق بھیج دی۔ پس وہ طلاق نامہ عورت کو مل گیا اور خاوند اقرار بھی کرتا ہے کہ یہ میرا خط ہے پس عورت کو طلاق ہو جائے گی۔ ابن عابدین لکھا جائے لکھتے ہیں

کتب اما بعد فانت طالق فکما کتب ھذا یقع الطلاق فتلزمھا العدۃ من وقت الکتابت۔

یعنی اما بعد لکھا پھر لکھا تو طالق ہے اسی وقت طلاق ہو جائے گی اور تحریر کے وقت سے عدۃ شروع ہو گی۔

صورت مستفسرہ میں اگرچہ زبان سے طلاق نہیں دی لیکن پھر بھی طلاق ہو جائے گی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ کو یک وقت تین طلاقیں دیں اور کہا کہ تجھے تین طلاقیں ہیں۔ اب احناف تو کہتے ہیں کہ تین طلاقیں ہی ہوں گی اور سوائے حلالہ کے اس خاوند کے لیے یہ جائز ہی نہیں لیکن مسلم شریف میں حدیث ہے کہ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ زمانہ نبوی اور عہد صدیقی میں تین طلاقیں ایک ہی تصور ہوتی تھیں اور یہ بھی روایت ہے کہ ابو رکانہ نے جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ایک ہی شمار کیا۔ اگر احناف کے نزدیک تین طلاقیں تین ہی واقع ہوتی ہیں تو ان احادیث کا مفہوم کیا ہے۔

حافظ غلام محی الدین منگلا کالونی۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں ایک مرد نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دی ہیں، تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی۔

وان كان الطلاق ثلاثا فى الحرة لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها او يموت عنها۔

(قدوری ص۱۶۷)

اگر عورت کو تین طلاقیں مرد نے دی ہیں تو وہ اس کے حلال نہیں، حتیٰ کہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور اس کے ساتھ مجامعت کرے پھر وہ مرد یا تو اس کو طلاق دے یا مر جائے۔ اب یہ عورت اس مرد مطلق پر قطعاً حرام ہو چکی ہے۔ جب تک تحلیل (حلالہ) نہ کرے اس کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں :

والاصل فیہ قولہ تعالیٰ فان طلقہا فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ ۔

یعنی قرآن دلیل ہے کہ فان طلقہا سے مراد تیسری طلاق ہے ۔ جب تین طلاقیں ہوجائیں تو یہ عورت مرد پر حرام ہوجاتی ہے جب تک کسی دوسری جگہ نکاح نہ کرلے ۔

تفسیر صاوی ج ۱ ص ۹۸ میں ہے :

فان طلقہا ای طلقۃ ثالثۃ سواء وقع الاثنتان فی مرۃ او مرتین والمعنی فان ثبت طلاقہا ثلاثا فی مرۃ او مرات فلا تحل لہ الخرۃ کما اذا قال لہا انت طالق ثلاثا وھذا ھو المجمع علیہ

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تین طلاقیں دیں تو واقع ہوجائیں گی خواہ ایک مرتبہ دے یا الگ الگ عورت حلال نہیں رہے گی جیسا کہ اگر کوئی شخص اس طرح کہہ دے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو تین ہی واقع ہوں گی ۔ یہ بات تمام لوگوں کے درمیان متفقہ ہے ۔ باقی جو آپ نے لکھا ہے کہ مسلم شریف میں عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضور کے زمانہ اور عہد صدیقی میں تین طلاقیں ایک تصور کی جاتی تھیں ۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب عورت غیر مدخول بہا ہو (یعنی خاوند قبل از جماع طلاق دے) اگر عورت غیر مدخولہ کو تین طلاقیں دی جائیں تو ایک واقع ہو گی ۔ دیکھئے ابوداؤد کتاب الطلاق باب نسخ المراجعۃ میں ہے :

قال ابن عباس بلی کان الرجل اذا طلق امرأتہ ثلاثا قبل ان یدخل بہا جعلوہا واحدۃ ۔

یعنی ابن عباس فرماتے ہیں ۔ ہاں مرد جب عورت کو تین طلاقیں (تجھے طلاق ہے

طلاق ہے طلاق ہے) قبل از دخول دے تو وہ ایک ہی سمجھی جائے گی یہی ابن عباس کا مطلب ہے اس کو حنفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ عورت پہلی طلاق سے ہی بائن ہو جاتی ہے دوسری واقع ہی نہیں ہوتیں لہذا یہاں تین میں ایک ہی سمجھی جائے گی۔ اگر عورت مدخول بہا ہو تو ابن عباس تین طلاقیں بحال رکھتے ہیں جیسا کہ حنفیہ نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص تین طلاقیں مدخول بہا کو دیتا ہے تو تین ہوں گی۔ امام بیہقی فرماتے ہیں:

ان رجلا جاء الی ابن عباس وقال طلقت امرأتی الفا فقال تأخذ ثلاثا ودع تسع مائة وسبعة وتسعین۔

ایک شخص نے عبداللہ بن عباس سے عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں۔ آپ نے فرمایا تین پکڑ لو اور نو سو ستانوے ۹۹۷ چھوڑ دو۔ یعنی تین طلاقیں تمہاری عورت کو ہو گئی ہیں۔ امام بیہقی نے ایک اور روایت ذکر کی ہے:

عن ابن عباس انہ قال لرجل طلق امرأتہ ثلاثا حرمت علیک۔

ابن عباس نے اس شخص سے فرمایا جس نے اپنی بیوی کو یکدم تین طلاقیں دی تھیں کہ تجھ پر تیری بیوی حرام ہو گئی اگر ایک اعتبار ہوتی تو بیوی ہرگز حرام نہ ہوتی۔ معلوم ہوا کہ ابن عباس بھی اگر تین طلاقیں دی جائیں تو تین ہی شمار کرتے ہیں۔ جہاں آپ نے تین میں ایک کا اعتبار کیا ہے وہ عورت غیر مدخول بہا ہے۔ یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ابن عباس کی وہ حدیث جو سوال میں ذکر کی گئی ہے منسوخ ہے کیونکہ ابن عباس سے کئی روایات ہیں کہ ابن عباس تین طلاقوں کو تین طلاقیں ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ پہلے بیہقی کے حوالہ سے گزرا ہے بلکہ یہ آپ کا مفتی بہ قول ہے لہذا جب راوی حدیث کا عمل اپنی روایت کے خلاف ہو وہاں معلوم ہو گا کہ اس راوی کے علم میں یہ حدیث منسوخ ہے۔ اس پر قوی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام کی موجودگی میں حضرت عمر فاروق نے یہ قانون بنا دیا کہ یکدم تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، اس پر عمل کا شروع ہو جانا

کسی صحابی کا اعتراض نہ کرنا بلکہ خود ابن عباس کا نہ بولنا اور اس مسئلہ پر گفتگو نہ کرنا اس کا واضح ثبوت ہے کہ یہ حدیث مذکورہ (سوال میں) منسوخ ہے یا مؤول ہے کہ غیر مدخول بہا عورت کو اگر اس طرح تین طلاقیں دے (تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے) تو ایک طلاق ہو گی، کیونکہ یہ عورت پہلی طلاق سے بائن ہو جاتی ہے۔ دوسری دو طلاق کا وہ محل ہی نہیں رہتی۔ لیس یہ صورت اتنی ہی مؤول ہے اس عورت پر عدت بھی واجب نہ ہو گی اور طلاق کے لیے عدت یا نکاح ہوتا ہے۔ اگر غیر مدخول بہا کو یوں کہے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو تینوں یک دم پڑ جائیں گی کیونکہ اس صورت میں تینوں طلاقیں نکاح کی موجودگی میں واقع ہوئیں۔

تلخیص کلام یہ ہے کہ یا تو حدیث مسئولہ منسوخ ہے یا مؤول بصورت مخصوصہ ہے ورنہ جو عورت مدخول بہا ہو اگر اس کو تین طلاقیں (کہ تجھے تین طلاقیں ہیں یا تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے) دی جائیں تو تین ہی واقع ہوں گی۔ یہ عورت سوائے تحلیل (حلالہ) کے پہلے خاوند مطلّق کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی اور ابو رکانہ کی روایت جو آپ نے ذکر کی ہے وہ بھی ضعیف ہے۔ ابو داؤد نے اس کو اس طرح روایت کیا ہے:

طلق عبد یزید ابو رکانۃ ام رکانۃ فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم ارجع بامرأتك فقال انی طلقتها ثلاثا قال قد علمت ارجعها۔

عبد یزید ابو رکانہ نے اپنی بیوی ام رکانہ کو طلاق دی حضور علیہ السلام نے فرمایا طلاق سے رجوع کر لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور میں نے تین طلاقیں دی ہیں۔ فرمایا ہم جانتے ہیں مگر رجوع کر لو۔

امام نووی شافعی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں کہ یہ تین طلاقوں والی حدیث اور روایت ضعیف ہے اور مجہول لوگوں سے مروی ہے۔ ان کی طلاق کے متعلق صرف وہی روایت صحیح ہے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے طلاق بتہ دی تھی اور لفظ بتہ میں ایک کا بھی احتمال ہے اور تین کا بھی۔ شاید تین طلاق کے ضعیف راوی نے یہ سمجھا کہ بتہ تین طلاق کو کہتے ہیں۔

بجائے بتہ کے تین کی روایت بالمعنی کردی جس میں اس نے غلطی کی اور صحیح روایت وہ ہے جو عبداللہ بن علی بن یزید ابن رکانتہ

عبد اللہ بن علی بن یزید ابن رکانۃ عن ابیہ عن جدہ انہ طلق امراتہ البتۃ فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسئلہ فقال ماا ردت بہا قال واحدۃ قال او اللہ ماا ردت بہا الا واحدت قال واللہ ماا ردت بہا الا واحدۃ قال فردھا الیہ ۔

وہ فرماتے ہیں کہ میرے دادا نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی پھر وہ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوے اور حضور علیہ السلام سے سوال کیا اور عرض کیا کہ میں نے ایک کی نیت کی تھی ، حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا اللہ کی قسم تم نے ایک کی نیت کی تھی۔ عرض کیا قسم ہے رب کی میں نے نہ نیت کی مگر ایک کی۔ لبس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی کو ان پر واپس کردیا۔ اس کے متعلق ابن ماجہ فرماتے ہیں :

ما اشرف الحدیث ۔

اس کی سند بہت عمدہ ہے ۔

ابو داؤد فرماتے ہیں :

ھذا اصح ۔

یہ حدیث بہت صحیح ہے ۔

پھر گھر والے ایسے معاملات میں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ واقف ہوتے ہیں اسی لیے امام بیہقی فرماتے ہیں کہ طلاق بتہ زیادہ صحیح ہے ۔

لانہم ولد الرجل واھلہ اعلم بہ ان رکانۃ انما طلق امراتہ وجعلھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واحدۃ ۔

کہ مرد کی اولاد اور اس کے اہل اس بات کو زیادہ جانتے ہیں ۔ رکانتہ نے اپنی

عورت کو طلاق بتہ دی تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک فرمایا۔

جد سے مراد حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال صفحہ ۲۶۳ میں رکانتہ لیا ہے۔ رکانتہ بن عبد یزید بن ہاشم ہی مطلق ہیں۔ رکانتہ کی وفات ۴۲ھ میں ہوئی اور مدینہ طیبہ میں آپ کا مزار ہے اور عبد یزید کے متعلق تو حاکم نے بیان کیا کہ انہوں نے لم یدرک الاسلام یعنی اسلام کو نہیں پایا۔ یہ بھی ابو رکانہ کی حدیث کی تضعیف کا قوی سبب ہے۔ بہر صورت ابو رکانہ کی روایت مسئولہ جس میں تین کا ذکر ہے وہ ضعیف ہے جس کے راوی مجہول ہیں اور امام بیہقی کے قول کے مطابق روایت بتہ صحیح اور قوی ہے۔

اگر کسی مرد نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دی ہیں جیسا کہ زید نے ہندہ کو تین طلاقیں دی ہیں تو تین ہی واقع ہوں گی۔ امام ابو حنیفہ امام شافعی امام مالک اور امام احمد اور تمام علماء نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ اس صورت میں تین طلاقیں ہوں گی۔

سوال : امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر ج ۲ صفحہ ۱۴۷ میں الطلاق مرتٰن کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ایک دم تین طلاقیں دینی حرام ہیں لہذا تین طلاقیں یکدم شرعی طلاقیں نہیں ہیں۔

جواب : اگرچہ یہ فعل یعنی یکدم طلاقیں دینی ٹھیک نہیں ہیں لیکن طلاقیں ضرور ہو جائیں گی۔ امام رازی وقوع کا انکار نہیں کرتے کسی چیز کا حرام ہونا اور چیز ہے اور اس پر شرعی احکام کا مرتب ہونا اور چیز ہے۔ رمضان شریف میں کھانا حرام ہے لیکن اگر کوئی روزہ رکھ کر کھاتا ہے باوجودیکہ یہ فعل حرام ہے لیکن روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی یک دم طلاقیں دیتا ہے تو پھر طلاقیں ہو جائیں گی۔

انتباہ : امام فخر الدین رازی کے ہم نام اور ہم لقب تین امام ہوئے ہیں۔ ایک امام فخر الدین رازی حنفی المتوفی ۳۷۰ھ تھے۔ یہ پہلے علماء میں شمار کئے گئے ہیں۔

دوسرے امام محمد بن عمر فخر الدین رازی شافعی المتوفی ۶۰۶ھ جو کہ صاحب تفسیر کبیر ہیں۔

تیسرے محمد بن عمر فخر الدین رازی حنفی المتوفی ۶۰۶ھ شہر ہرات میں فوت ہوئے ہیں۔ یہ دونوں لقب اور نام اور باپ کے نام اور مکان وفات اور سن وفات میں برابر ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک مرد نے اپنی عورت کو ماں بہن کہا ہے۔ اس کو طلاق ہو گئی ہے یا نہیں؟

علم دین از گھنگور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں طلاق نہیں ہوتی اور نہ ہی ظہار ہوتا ہے بلکہ یہ لفظ لغو اور بیہودہ ہیں۔ ایسے لفظ بولنے مکروہ ہیں۔ درمختار میں ہے:

او حذف الکاف لغا۔

یعنی کاف (حرف تشبیہ) کو حذف کر کے یہ کہا کہ تو میری ماں ہے یا بہن تو طلاق نہ ہو گی بلکہ یہ لفظ بے ہودہ ہیں۔ فتاویٰ شامیہ میں ہے:

او حذف الکاف بان قال انت امی۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

ولو قال لہا انت امی لا یکون مظاہرًا وینبغی ان یکون مکروھا

فتاویٰ حمادیہ میں ہے:

ولو قال لہا انت امی فلیس بشئی

جوہرہ نیرہ میں ہے:

لان التحریم انما یکون اذا جعلہا مثل امہ فاما اذا قال انت امی فہو کذب۔

یعنی حرمت اس وقت آتی جبکہ اس طرح کہتا کہ تو میری ماں کی مثل ہے ۔ جب لفظ لفظ مثل نہیں کہا صرف یہ کہا کہ تو میری ماں ہے تو یہ لفظ جھوٹ اور لغو اور بیہودہ ہے ، اس سے طلاق نہیں ہوگی لہذا صورت مستفسرہ میں بھی طلاق نہیں ہوئی ۔ البتہ ایسے الفاظ خاوند کو استعمال نہیں کرتے چاہئیں ۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کو کہا کہ تو چلی جا ، از روئے شرع شریف کیا ان الفاظ سے طلاق ہوگی یا نہیں ؟ اگر ہوئی تو پھر کیا بائن ہوگی یا رجعی ۔ اگر مرد کہے کہ میں نے طلاق کی نیت نہیں کی تو پھر طلاق ہوگی یا نہ ۔ جواب باحوالہ جات تحریر فرمائیں ۔

ایک مستفتی از شاہ درہ لاہور ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

بہ تقدیر صحت صورت مسئولہ میں اگر خاوند نے طلاق کی نیت کی ہے تو طلاق بائن ہوگی اگر طلاق کی نیت نہیں کی تو طلاق نہیں ہوگی کیونکہ تو چلی جا کی عربی اذھبی ہے اور اذھبی کنایات میں داخل ہے اور عنایہ میں ہے :

الکنایۃ ما استتر المراد بہ و حکمھا ان لا یجب العمل الا بالنیۃ ۔

کنایہ وہ ہے جس کی مراد واضح نہ ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے ساتھ عمل واجب نہیں ہوتا مگر نیت کے ساتھ اور صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ کنایات تین قسم پر ہیں۔

ما یصلح جوابا وردا او ما یصلح جوابا لا ردا او ما یصلح جوابا ویصلح سبا و شتیمۃ ۔

ایک وہ ہیں جو جواب اور رد دونوں کا جواب ہو سکتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو

جواب بن سکتے ہیں لیکن رد نہیں اور تیسری قسم وہ ہے جو جواب بھی بن سکتے ہیں اور بجائے جواب کے وہ مرد کی طرف سے عورت کے لیے شتم اور سب تصور کیے جائیں گے اور اذھبی کے متعلق لکھتے ہیں:

ویصدق فیما یصلح جوابا وردًا مثل قولہ اذھبی ۔

کہ اذھبی میں، کہ تو چلی جا مرد کی بات تسلیم کی جائے گی۔ اگر مرد نے عورت کو بحالت رضا یہ الفاظ کہے کہ تو چلی جا تو اس نے اگر طلاق کی نیّت کی ہے تو طلاق ہو جائیگی۔

ففی حالۃ الرضا لا یکون شئ منھا طلاقا الا بالنیۃ اور طلاق بھی بائن ہو گی ۔ ہدایہ میں ہی ہے:

اذا نوی بھا الطلاق کانت واحدۃ بائنۃ ۔

اگر مرد کہے کہ میں نے طلاق کی نیّت نہیں کی تو پھر طلاق نہیں ہو گی۔

فتاوٰی عالمگیری میں ہے:

والقول قول الزوج فی ترك النیۃ مع الیمین ۔

ہدایہ میں ہے:

والقول قولہ فی انکار النیۃ

بہر نوع صورت مسئولہ میں اگر مرد نے طلاق کی نیت کی ہے تو طلاق بائنہ ہو گی اور اگر نیت نہیں کی تو طلاق نہیں ہو گی اور شرعاً قول مرد کا بمعہ قسم معتبر ہو گا۔

یعنی اگر مرد کہتا ہے کہ میں نے طلاق کی نیّت نہیں کی تو پھر اس سے قسم لے کر یہی فیصلہ کیا جائے گا کہ طلاق نہیں ہوئی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصّواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین در ایں مسئلہ کہ ایک آدمی نے زید سے کہا عمرو نے تمہاری

دعوت کی ہے۔ زید عمرو کے مکان پر جاتا ہے لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے ہیں۔ عمرو کہتا ہے چھوٹا گوشت ختم ہو چکا ہے بڑا کھالو۔ زید نے کہا بڑا کھالوں گا پھر مذاق سے کہا کہ گوشت ہو خواہ کتے کا ہو۔ زید نے نہ کتے کا گوشت حلال کہا ہے نہ دل سے حلال سمجھا بلکہ مذاق سے بات کہہ دی۔ زید کے بارہ میں شرعی حکم کیا ہے۔ ایک مولوی صاحب نے فتویٰ لگا دیا ہے کہ زید کا نکاح ٹوٹ گیا ہے طلاق ہو گئی ہے دوبارہ نکاح پڑھے دس آدمیوں کو کھانا کھلائے۔ کیا یہ فتویٰ درست ہے۔ اگر فتویٰ درست نہیں تو فتویٰ دینے والے نکاح خواں اور گواہوں کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

ڈاکٹر جان محمد چھور سکھاں چک نمبر ۱۱۸

ڈاک خانہ سانگلہ ہل ضلع شیخوپورہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر سبقت لسانی سے زید کے منہ سے یہ نکل گیا کہ گوشت ہو خواہ کتے کا ہو تو کوئی بات قابل گرفت نہیں ہوئی۔ اگر وہ قسم بھی کھالیتا تو قسم کا بھی اس صورت میں انعقاد نہ ہوتا۔ بحر الرائق میں ہے

لان استحلال ذالك لا یکون کفراً لا محالۃ فانہ حالۃ الضرورۃ تصیر حلالاً۔

کیونکہ اس کا حلال سمجھنا کفر نہیں ہے یہ مجبوری کے وقت حلال ہو جاتے ہیں شریعہ مطہرہ میں جو محرمات ایسے ہیں کہ کبھی ان کی حرمت ہی ساقط نہیں ہوتی جیسا کہ کفر ہے یہ کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اگر کسی کے کام کرنے پر اس کے حلال سمجھنے کی قسم کھائی تو وہ شرعاً قسم معتبر ہوگی اور جو محرمات شریعہ ایسے ہیں کہ بعض اوقات ان کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے یعنی جان بچانے کے لیے ان کا کھانا جائز ہے اگر کسی کام کے کرنے پر ان چیزوں کے حلال سمجھنے کی قسم کھائی تو شرعاً قسم ہی نہ ہوگی۔

وکل شئ هو حرام بحیث تسقط حرمة بحال کالمیتة والخمر والخنزیر واشباه ذالك فاستحلاله معلقا بالشرط لایکون معلقا کذا فی المحیط -

جب خنزیر اور کتے کے گوشت کے حلال سمجھنے پر قسم کھلائے تو قسم کا انعقاد نہیں ہوتا، اور نہ ہی کفارہ دینا پڑتا ہے۔ اگر بلا قصد زید کی زبان سے یہ لفظ نکل گئے ہیں کہ خواہ کتے کا گوشت لاؤ تو کوئی جرم شرعی نہیں ہوا لیکن ایسے الفاظ سے پرہیز اور احتیاط لازم اور ضروری ہے۔ ایسے الفاظ سے نکاح نہیں ٹوٹتا اور نہ طلاق ہوتی ہے، بلا علم اور بلا تحقیق فتویٰ دینا حرام ہے اور دس آدمیوں کے کھانا کھلانے کا حکم بھی غلط ہے کہ شریعت میں جرمانہ جائز نہیں ہے۔ اگر نکاح کی تجدید ہو گئی ہے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ نکاح خواں یا گواہوں پر کسی قسم کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ البتہ فتویٰ دینے والے کو ایسے فتوے نہیں دینے چاہئیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب - ۱۲

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں بارہ کہ ایک شخص نے جو کہ شیعہ تھا حلف اٹھا کر کہ اب میں شیعہ نہیں ہوں ایک لڑکی حنفی سُنّی سے نکاح کیا ہے لیکن اب دوبارہ شیعہ ہو گیا ہے۔ کیا نکاح درست ہے یا منسوخ ہو گیا ہے یا ابھی طلاق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ فقہ حنفی کے تحت وضاحت فرمائیں کہ کیا لڑکی کہیں دوبارہ نکاح کر سکتی ہے ؟

محمد یٰسین سُنی حنفی

چک نمبر ۲۴۲ ڈاک خانہ خاص براستہ پکا انا تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں آج کل تمام شیعہ رافضی ہیں۔ شیعہ رافضی مرتد اور کافر ہیں بعض موقعہ پر تقیۃً سنّی بن جاتے ہیں تقیہ ان کے مذہب کا اہم جز ہے جس نے سنّی ہونے کا

حلف اٹھایا پھر وہ شخص شیعہ ہوگیا یقیناً مرتد ہے۔ اس کا سنی بننا بھی صرف تقیہ تھا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

والصحیح انہ کافر وکذالک من انکر خلافۃ عمر رضی اللہ عنہ فی اصح الاقوال کذا فی الظھیریۃ وھولاء القوم خارجون عن ملۃ الاسلام واحکامھم احکام المرتدین۔

مرتد اور کافر کے ساتھ سنیہ مسلمان عورت کا نکاح ہرگز جائز نہیں ہے جو ابتداءً ہوا ہے اس کا بنیادی طور پر انعقاد ہی نہیں ہوا۔

ولا یجوز ان یتزوج المرتد مسلمۃ ولا مرتدۃ ولا کافرۃ

مرتد کا نکاح مسلمان عورت بلکہ کافر عورت کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے۔ فتاوی رضویہ میں ہے:

رافضی قاذف باجماع مسلمین۔

کافر ملعون ہیں جو ان کو کافر نہ سمجھے وہ خود کافر ہے۔ جو شخص اپنی لڑکی یا اپنی بہن شیعہ رافضی کو دیتا ہے وہ یقیناً دیوث ہے۔ اپنی بہن بیٹی کو صریح زنا کے لیے دینے والا ہے لہذا صورت مسئولہ میں ابتدائی طور پر نکاح ہی نہیں ہوا۔ اگر ظاہراً ہوا ہے تو ارتداد کے ساتھ فسخ ہوگیا ہے۔ طلاق حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سُنی حنفی لڑکی اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے کسی سُنی مسلمان مرد کے ساتھ نکاح کرلے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ محمد اسلم نے اپنی بیوی سلیمان بی بی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ طلاق نامہ درج ذیل ہے:

منکہ محمد اسلم ولد غلام رسول ساکن کلہ بھاگ تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کی شادی مسماۃ

سلیماں بی بی دختر ابراہیم ساکن نت تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ کے ساتھ ہوئی۔ عرصہ تقریباً آٹھ سال ہو چکا ہے۔ منظور کا نباہ اس کے ساتھ بہت مشکل ہو گیا ہے اس لیے میں اس کو سہ بار طلاق (طلاق طلاق طلاق) دے رہا ہوں کیونکہ یہ میری نافرمان ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سلیماں بی بی کسی اور جگہ نکاح کر سکتی ہے یا نہیں۔

سائل ابراہیم ساکن نت تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں جب مطلق نے تین طلاقیں دے دی ہیں تو یہ تین طلاقیں واقع ہو گئی ہیں اور محمد اسلم پر اس کی زوجہ سلیمان بی بی ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی ہے۔

وان کان الطلاق ثلاثا لہ تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ۔

اب محمد اسلم کے لیے سلیماں بی بی سوائے (حلالہ) کے حلال نہیں ہے اور سلیماں بی بی اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے شرعی طور پر نکاح کر سکتی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک آدمی نے اپنی عورت کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں۔ اب اس نے وہابی علماء سے مسئلہ پوچھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک ہی طلاق ہوتی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت رکانہ نے تین تین طلاقیں دی تھیں۔ حضور علیہ السلام نے ان کو رجوع کا حکم فرمایا اور ایک طلاق اعتبار کی لیکن طلاق دینے والا سُنّی ہے لہذا علمائے اہلسنت حنفیہ کے مطابق اس مسئلہ کا ثبوت قرآن و حدیث و کتب فقہ سے چاہیے۔ آپ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ بینوا و توجروا۔

ایک سائل

نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

مرد جب عورت کو تین طلاقیں بیک وقت بھی دے دے تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی
یہ عورت مرد پر سوائے حلالہ کے جائز نہ ہوگی۔ قرآن پاک میں ہے:

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ۔

تفسیر صاوی[1] ص۹۸ میں ہے:

فان طلقها طلقة ثالثة سواء وقع الاثنتان فی مرة امرتین والمعنی
فان ثبت طلاقها فی مرة او مرات فلا تحل له کما اذا قال لها انت
طالق ثلاثا وهذا هو المجمع علیه۔

آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تین طلاقیں دے تو واقع ہو جائیں گی خواہ ایک مرتبہ دے یا
الگ الگ، عورت حلال نہیں رہے گی جیسا کہ کوئی شخص اس طرح کہہ دے کہ تجھے تین
طلاقیں ہیں تو تین ہی واقع ہوں گی۔ یہ تمام امت مسلمہ کے درمیان متفقہ بات ہے۔ امام نووی شافعی
فرماتے ہیں:

من قال لامرأته انت طالق ثلاثا فقال الشافعی ومالك وابوحنیفة
واحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف یقع الثلث۔

یعنی جو کوئی اپنی بیوی سے کہے کہ تجھے تین طلاقیں تو ایمہ اربعہ اور سلف اور خلف کے عام
علماء فرماتے ہیں کہ تین ہی واقع ہوں گی۔ موجودہ زمانہ کے وہابیہ ابن تیمیہ کا اتباع کرتے ہیں
ابن تیمیہ کہتا ہے کہ تین طلاقیں جو بیک وقت ہوں ایک ہی واقع ہوتی ہے۔

ورد علیه ایمة مذهبه حتی قال العلماء انه الضال المضل۔

ابن تیمیہ کی خود اس کے مذہب کے اماموں نے تردید کر دی ہے اور علماء تو فرماتے ہیں کہ

---

[1] مصنفہ علامہ شیخ احمد صاوی مالکی المتوفی ۱۲۴۱ھ ۱۲

ابن تیمیہ خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے لہٰذا تین طلاقیں ہی ہوں گی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو بحالت حیض ایک طلاق ہی دی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجوع کا حکم دیا کیونکہ طلاق بحالت طہر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ مسلم شریف جلد اول باب تحریم الطلاق الحائض میں ہے :

عن نافع عن عبد اللہ انہ طلق امرأۃ لہ وھی حائض تطلیقۃ واحدۃ فامرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یراجع ثم یمسکھا حتی تطھر ۔

امام نووی شافعی فرماتے ہیں کہ حدیث ابن عمر وہ روایات صحیحہ ہیں جن میں طلاق واحد کا ذکر ہے ان طلاق کے متعلق تمام روایات ضعیفہ ہیں ۔ اسی طرح رکانہ کی صحیح روایت یہی ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی تھی تین روایتیں بالکلیہ ضعیف ہیں (نووی شرح مسلم کتاب الطلاق)

امام بیہقی اور امام طبرانی نے روایت کی کہ حضرت امام حسن ابن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی عائشہ خشعمیہ کو یکدم تین طلاقیں دے دیں لبعد میں خبر ملی کہ وہ بہت روتی ہیں تو فرمایا کہ اگر میرے والد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ سنا ہوتا کہ جو کوئی ایکدم تین طلاقیں دے دے تو وہ عورت بغیر حلالہ کیے اسے جائز نہیں تو میں اس سے رجوع کر لیتا۔

ابن ماجہ میں ہے کہ فاطمہ بنت قیس کو ان کے شوہر نے تین طلاقیں دیں ۔ حضور علیہ السلام نے ان تینوں کو جائز رکھا۔

امام مالک ، امام شافعی ، ابوداؤد اور امام بیہقی نے معاویہ بن ابی عیاش سے روایت کی کہ ابوہریرہ اور عبداللہ بن عباس سے پوچھا گیا جو کوئی اپنی بیوی کو ایکدم تین طلاقیں دیدے اس کا حکم کیا ہے ۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ ایک طلاق اسے جدا کر دے گی اور تین حرام کر دیں گی کہ بغیر حلالہ نکاح ثانی درست نہ ہوگا۔ ابن عباس نے اس کی تائید فرمائی ۔

بیہقی نے روایت کی ہے کہ جعفر بن محمد فرماتے ہیں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو نادانی سے

یا جان بوجھ کر تین طلاقیں دیدے تو وہ عورت اس پر حرام ہو گئی۔

ہدایہ اور دیگر تمام کتب فقہ میں ہے کہ جب تین طلاقیں دی جائیں تو یہ عورت مرد پر مغلظاً حرام ہو جاتی ہے۔

صورت مسئولہ میں جب سائل مطلق نے تین طلاقیں دی ہیں تو تین ہی واقع ہو گئی ہیں اب یہ عورت مرد پر قطعی طور پر حرام ہو گئی ہے۔ اس مرد کے لیے یہ عورت سوائے حلالہ کے جائز نہیں ہے۔ یہی تمام ایمہ اور فقہاء کا مذہب ہے صرف وہابیہ جو کہ ابن تیمیہ کے متبع ہیں وہ مخالفت کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ خود بھی گمراہ ہے اور اس کے متبعین بھی گمراہ ہیں۔

هو الهادی ومن یضلل الله فلن تجد له ولیاً مرشداً

والله ورسوله اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین در ایں مسئلہ کہ مسمات نسرین اختر کا نکاح پانچ سال کی عمر میں مسمی عطا محمد عمر نو سال کے ساتھ روبرو گواہان ہوا۔ ایجاب وقبول لڑکی اور لڑکے کے والدین نے کیا۔ لڑکے نے بالغ ہونے کے بعد قبل از جماع اپنے والد کے کہنے پر اپنی بیوی کو تین طلاق ایک وقت میں دے دیں۔ کیا یہ تینوں طلاقیں واقع ہو گئیں۔ اب عطا محمد مذکور نسرین اختر سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے کیا اس کا نکاح نسرین اختر سے بغیر حلالہ کے ہو سکتا ہے اور کیا نابالغہ لڑکی کے لیے حلالہ کے لیے وہی شرط ہے جو بالغہ کے لیے ہے۔

سائل جلال دین ساکن سرانوالی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مذکورہ میں باپ نے اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح اپنی رضامندی سے روبرو گواہوں کے کیا ہے جس سے نکاح منعقد ہو گیا۔ اس لیے ولی، صغیر (چھوٹے) لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر سکتا ہے اور ولی کے نکاح کرنے سے ان کا نکاح منعقد ہو جاتا ہے

جوہرہ نیرہ قدوری ج ۲ صد ۴ پر ہے :

ویجوز نکاح الصغیر والصغیرۃ اذا زوجھما الولی بکرا کانت الصغیرۃ او ثیباً -

اور جب باپ اپنی نابالغہ بیٹی کا نکاح کر دے تو بیٹی کو بالغہ ہونے کے بعد نہ ہی خیار بلوغ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی اپنا نکاح فسخ کرا سکتی ہے - جوہرہ نیرہ ج ۲ صد ۴ پر ہی ہے :

فان زوجھما الاب او الجد فلا خیار لھما بعد البلوغ -

جب انعقاد نکاح ہو گیا تو خاوند کو از روئے شرع طلاق دینے کا حق مل گیا ہے اور وہ بالغ ہونے کے بعد جب چاہے اس حق کو استعمال کر سکتا ہے اس لیے کہ طلاق دینے کے لیے خاوند کا بالغ ہونا شرط ہے اور بچے کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

ویقع طلاق کل زوج اذا کان بالغا ولا یقع طلاق الصبی والمجنون -

صورت مذکورہ میں خاوند نے اپنا حق طلاق استعمال کرتے ہوئے اپنی بیوی غیر مدخولہ کو ایک وقت میں تین طلاق دی ہیں جو تینوں واقع ہو گئی ہیں۔

واذا طلق امراتہ قبل الدخول بھا ثلاثا وقعن علیھا -

شرح وقایہ ج ۲ صد ۵ پر ہے :

ومن طلقھا ثلاثا قبل الوطی وقعن -

عمدۃ الرعایہ صد ۵ پر ہے :

ای تلک الطلقات الثلاث حیث لا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ و من ظن ان الثلاث لا یقع علی غیر المدخول بھا او انہ لا یشترط فیہ التحلیل مع وقوع الثلاث فقد اخطاء -

اب اگر عطا محمد نسرین اختر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے حلالہ شرط ہے اور حلالہ کے بغیر عطا محمد کا نکاح نسرین اختر کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ حلالہ کا معنی

یہ ہے کہ نسرین اختر کسی اور شخص کے ساتھ نکاح کرے اور وہ شخص نکاح کے بعد نسرین کیساتھ جماع کرے پھر اس کو طلاق دے تو اس نکاح ثانی کی عدت گزرنے کے بعد نسرین اختر عطا محمد سے نکاح کر سکتی ہے ورنہ نہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت حضرت قبلہ مفتی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

ہمارے موضع میں ایک طلاق کا مسئلہ صورت تنزع میں ہے۔ مہربانی فرما کر رہنمائی فرمائیں تاکہ صورتِ حال میں مطابقِ شریعت عمل ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ منشی ولد امام دین نے مولوی صاحب (پیش امام) پر بہتان لگایا اور گاؤں کی پنچایت ہوئی۔ سارا گاؤں رات کو جمع ہوا منشی مذکور پہ گاؤں کے لوگ ناراض تھے۔ پنچایت نے مجھے بلایا، میں گیا، اظہار ہوا کہ منشی مذکور نے مولوی پہ بہتان باندھا ہے، میں نے استفسار کیا کہ اسے مولوی مذکور سے کیا دشمنی ہے ایک شخص نے بتایا کہ یہ سوچتا ہے کہ مولوی نے اس کی بیوی کو تعویز دے کر اس سے برگشتہ کیا ہے لہذا اس نے مولوی پہ بہتان باندھا ہے۔ میں نے منشی مذکور سے پوچھا کہ کھڑا ہو کر بیان کرے کہ کیا بات ہے وہ کہنے لگا کہ میں مجرم ہوں، گنہگار ہوں مجھے معاف کر دو یا جو چاہو سزا دو اس پر میں نے حاضرین کو کہا کہ اس کی سزا تجویز کرو۔ ایک شخص نے تجویز کیا کہ اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر چڑھاؤ دوسرے شخص نے کہا کہ یہ سزا تھوڑی ہے، اسے اس چیز سے محروم کرو جس کے لیے اس نے بہتان باندھا ہے۔ میں نے منشی سے کہا کھڑا ہو، وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا کہ گاؤں والے طلاق مانگتے ہیں اس نے کہا جی پھر وہ بیٹھ گیا دیگر باتیں ہوتی رہیں اس کے خسر کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا ہو، اس نے کہا جو سردار فیصلہ کریں مجھے منظور ہے میں نے

منشی کو کہا کھڑا ہو وہ کھڑا ہو گیا میں نے کہا کہو تین طلاق ، اس نے کہا تین طلاق ، میں نے پھر کہا تین طلاق، اس نے کہا تیں طلاق ، میں نے کہا طلاق ، اس نے کہا طلاق ، میں نے کہا طلاق ، اس نے کہا طلاق ۔ اگلی صبح منشی مذکور بخدمت حضرت قبلہ سید ولی محمد شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا مجھ سے بالجبر گاؤں والوں نے طلاق لی ہے میں نہیں دیتا تھا اور اس نے حکومت کے مروجہ قانون کے تحت نوے ۹۰ دن سے قبل اگلے روز ہی واپس لے لی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی بیوی مطلقہ ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے یا وہ شرعاً اس کی بیوی ہے ۔ مہربانی فرما کر جواب سے سرفراز فرمائیں ۔

احقر العباد محمد شبیر احمد خاں رانا نقشبندی جماعتی

ساکن عمر پور ملتان ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

بر تقدیر صحت صورت مسئولہ طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ طلاق میں یہ لازمی شرط ہے کہ طلاق دیتے وقت مرد طلاق کو اپنی عورت کی طرف نسبت کرے اور یہاں نسبت نہیں پائی گئی۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے :

رجل قال لامراته اتریدین ان اطلقك فقالت نعم فقال لها اگر تو زن منی یک طلاق وسہ طلاق وہزار طلاق الخ لانہ لم یضف الطلاق الیھا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے

قل لها ان خرجت یقع الطلاق فخرجت لم یقع الطلاق ۔

درمختار میں ہے :

قید بخطابها لانه لو قال ان خرجت یقع الطلاق اولا تخرجی الا باذنی فانی حلفت بالطلاق فخرجت لم یقع لترکه الاضافة الیها

شامی میں ہے :

قولہ لترکہ الاضافۃ المعنویۃ وکذا الاشارۃ

یعنی طلاق کے وقوع میں اضافت اور نسبت عورت کی طرف شرط ہے اگر صرف یہ کہا کہ تین طلاق یا طلاق ، طلاق ، طلاق جیساکہ سائل نے ذکر کیا ہے تو طلاق نہ ہوگی کیونکہ طلاق (طلاق دینے والے) نے عورت کی طرف طلاق کو نسبت ہی نہیں کیا ۔ لہٰذا طلاق واقع نہ ہوگی اور منشی کی عورت کو طلاق ہی نہیں ہوئی ، منشی کی وہ شرعاً بیوی ہی ہے ۔ منشی اپنی بیوی کو اپنے گھر میں آباد رکھے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام دریں مسئلہ کہ اگر طلاق نامہ جبراً لکھوایا گیا اور پھر جبراً خاوند سے دستخط کرائے گئے اور خاوند کہتا ہے کہ مجھ پہ زبردستی کی گئی ہے کیا ایسی صورت میں اس کی عورت کو طلاق ہوگی یا نہیں ؟

صوفی برکت علی چونڈہ ضلع سیالکوٹ ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی ۔ ردالمحتار ج ۲ صـ ۴۴۲ میں ہے :

فلو کرہ[1] علی ان یکتب طلاق امرأتہ فکتب لا تطلق لان الکتابۃ اقیمۃ مقام العبارۃ باعتبار الحاجۃ ولا حاجۃ ھنا کذا فی الخانیۃ ۔

لہٰذا صورت مذکورہ میں طلاق نہ ہوگی ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

---

[1] ترجمہ : اگر کسی کو طلاق لکھنے پر مجبور کیا گیا ہے ، اس نے طلاق لکھ دی تو طلاق نہ ہوگی کیونکہ لکھنا عبارت کے قائم مقام بوقت ضرورت ہوتا ہے اور یہاں ضرورت نہیں ہے جیساکہ خانیہ میں ہے ۔ ۱۲

الاستفتاء

طلاق نامہ بتاریخ ۲۷-۶-۸۰

متکہ محمد رفیق ولد علی محمد سکنہ کچی آبادی سواں نگر گلی نمبر ۱۹ مکان نمبر ۲۵ تھانہ مصری شاہ کی شادی مسماۃ بشریٰ بی بی دختر حیدر شاہ سول لائن گلی مسجد گلی نمبر ۴ کے ہوئی۔ ہمارے میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑا رہتا تھا اس لیے میں نے مسماۃ بشریٰ بی بی کو طلاق دیدی ہے میرے ہوش و حواس قائم ہیں بشریٰ بی بی میرے نفس پر حرام، حرام، حرام ہے یہ طلاق نامہ لکھ دیا ہے، بشریٰ بی بی کے سپرد کر دیا گیا ہے اور مجھ پر مسمات از روئے شرع شریف حرام ہو گئی ہے ہمارا آپس میں کوئی لین دین باقی نہیں رہا اگر کوئی دونوں فریقوں میں سے کارروائی کرے وہ خود قانون کے ذمہ دار ہیں اب مسماۃ مذکور کو اختیار ہے کہ بعد انقضائے عدت جس شخص سے نکاح کرے یا نہ کرے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

طلاق دہندہ : محمد رفیق شاہ۔ لاہور ۲۷-۶-۸۰

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں دو طلاقیں بائن ہو چکی ہیں جن سے عورت مرد مطلّق (طلاق دینے والے) سے جدا ہو چکی ہے۔ پہلی طلاق صریح ہے اور لفظ حرام سے طلاق بائن جس کی وجہ سے پہلی بھی بائن ہو گئی ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں :

والبائن یلحق الصریح۔

کہ بائن کے ساتھ صریح کو لاحق ہو جاتی ہے۔

لہٰذا بشریٰ بی بی کو دو طلاقیں بائن ہوں گی جن کی وجہ سے نکاح ختم ہو جائے گا۔ بشریٰ بی بی بعد از انقضائے عدت شرعاً جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

طلاق نامہ

منکہ خادم حسین ولد رحیم بخش قوم بھٹی موضع پنجگرائیں تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں چونکہ مسماۃ صغراں بی بی دختر محمد شریف قوم کھوکھر ساکن لوہاراں والی تحصیل ڈسکہ مورخہ ۱۴/۴/۷۴ سے میری زوجہ منکوحہ ہے اس عرصہ میں کوئی اولاد نہیں ہوئی چونکہ تعلقات روز اوّل سے ہی کشیدہ ہونے کی وجہ سے رشتہ داروں نے جانبین فریقین صلح کی بہت کوشش کی ہے لیکن بے سود اس کے برعکس مسماۃ مذکورہ ہر وقت لڑائی جھگڑا کرتی ہے، میری اور میرے عزیز و اقارب کی نافرمان ہے اور گستاخ ہے۔ میں نے صغراں بی بی (زوجہ) کو طلاق ثلاثہ دے کر اپنے نفس پر حرام قرار دیا ہے۔ بعد گزارنے میعاد عدت جہاں چاہے نکاح ثانی کرے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ متعلقہ یونین کونسل کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ لہٰذا طلاق نامہ ہذا بخوشی خود بلا جبر و کراہ و بلا خوردن کسی شے نقد اور بقائمی ہوش و حواس لکھ دیا ہے تاکہ سند رہے۔

خادم حسین مذکور طلاق دہندہ

گواہ شد: احسان الحق ولد عبد العزیز ساکن کلاسوالہ تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ۔

گواہ شد: محمد حسین ولد خوشی محمد جٹ ساکن ویرووال تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں حسب خادم حسین نے اپنی بیوی صغراں بی بی دختر محمد شریف ساکن لوہاراں والی تحصیل ڈسکہ کو تین طلاقیں دے دی ہیں جیسا کہ طلاق نامہ میں مذکور ہے تو یہ تین طلاقیں مذہب حنفیہ کے مطابق ہو گئی ہیں۔

وان كان الطلاق ثلاثا لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره (هدایه جلد ۲)

یعنی اگر خاوند نے تین طلاقیں دیدی ہیں تو یہ عورت اس مرد پر قطعاً حرام ہو گئی ہے۔ اس کے

سوائے حلالہ کے نکاح نہیں کر سکتی لہٰذا صغریٰ بی بی خادم حسین پر قطعاً حرام ہو چکی ہے۔ خادم حسین اس کو گھر نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی تعلقات زوجیت قائم کر سکتا ہے۔ صغراں بی بی بعد از انقضائے عدت اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے شرعاً نکاح کر سکتی ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

طلاق نامہ بتاریخ ۶ مئی ۱۹۸۰ء

منکہ محمد اسماعیل سپاہی نمبر ۲۳۲۲۹۹۲ اے کمپنی ۴ پلاٹون پنجاب رجمنٹ سنٹر مردان کا جو کہ مسماۃ نور بی بی میری زوجہ ہے عرصہ آٹھ سال سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ میں متعدد مرتبہ اپنی بیوی نور بی بی کو بہن ماں کہہ چکا ہوں، اب پھر میں نور بی بی کو طلاق، طلاق، طلاق دیتا ہوں۔ نور بی بی دختر برکت علی تجھ پر طلاق، طلاق، طلاق ہے۔

طلاق دہندہ

محمد اسماعیل اے کمپنی ۴ پلاٹون پنجاب رجمنٹ سنٹر مردان۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

۶-۵/۸۰

صورت مسئولہ میں جب محمد اسماعیل نے اپنی بیوی نور بی بی دختر برکت علی کو چھ طلاقیں دی ہیں تو ان سے تین نور بی بی کو واقع ہونگی، تین اسماعیل اپنے لیے رکھ لے اور ماں بہن کہنے سے طلاق نہ ہو گی یہ لفظ لغو اور بیہودہ ہیں۔ نور بی بی کو تین طلاقیں ہوں گی اور یہ اسماعیل پر قطعاً مغلظاً حرام ہو جائے گی۔

وان کان الطلاق ثلاثا فی الحرۃ لم تحل لہ حتی تنکح زوجاً غیرہ۔ (ھدایہ ج

اگر عورت کو مرد نے تین طلاقیں دی ہیں تو یہ عورت اس مرد پر سوائے تحلیل (حلالہ) کے جائز نہ ہو گی اور یہ محمد اسماعیل پر حرام ہو گئی ہے۔ چونکہ طلاق ۶ مئی ۱۹۸۰ء کو ہوئی ہے جیسا کہ

طلاق نامہ میں تاریخ مذکور ہے۔

لہٰذا نور بی بی کی عدت بھی گذر چکی ہے نور بی بی اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے شرعاً نکاح کر سکتی ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

۱۸ ۱۰/۸۰

الاستفتاء

بخدمت علامہ المعظم ومفتی دار العلوم نقشبندیہ علی پور سیداں شریف

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ حریت موجود۔ عافیت مطلوب۔ احوال آنکہ فی زمانناحد شرعیہ زانی ومزنیہ موضوع بحث ہے۔ حال میں شریعت بنچ پاکستان کے فاضل حجان نے رجم اور سنگساری کو بہر صورت سزا غیر شرعی قرار دیا ہے۔ دعوئے یہ فرمایا ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زانی یا مزنیہ کو رجم فرمانے کا حکم صادر نہیں فرمایا جس مزنیہ صحابیہ کو رجم فرمانے کا حکم فرمایا گیا اس میں تاویل یہ کی ہے کہ وہ عورت فاحشہ پیشہ اور بد چلن تھی اب تک ہمارے علم میں ہی تھا کہ شادی شدہ مرد یا عورت پر اگر زنا ثابت ہو تو وہ رجم ہوگا مگر فیصلہ شریعت بنچ کے بعد صورت تشکیک کی سکنیت کے لیے آپ سے متفسر ہوں کہ بدیں ضمن بالتفصیل کتب معتمدہ کے واضح حوالہ جات سے اور صحابیہ مزنیہ کی حد کی صحیح صورت حال سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے اور خلفائے راشدین کے فیصلہ جات اور آئمہ مجتہدین وکتب فقہ کے حوالہ جات سے صورت مسولہ کا جواب مزین فرما کر طمانیت بخشیں۔ المرقوم ۲۴ مطابق ۱۹۸۱ء ۱۶ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ بروز جمعۃ المبارک۔

المستفسر

محمد شبیر احمد خاں نقشبندی۔ جماعتی۔

موضع عمرا ڈاکخانہ چک چاہنی تحصیل وضلع ملتان۔

الجواب بعونہ تعالٰے

برتقدیر صحت صورت مسئولہ جہاں تک مسئلہ (حد) رجم کا تعلق ہے صحیح احادیث اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے تمام فقہاء اور ائمہ کرام رجم کے قائل ہیں، البتہ فرقہ خارجیہ سے متاثر ہو کر ایک عظیم حد شرعی رجم کا انکار کر دیا ہے ورنہ رجم تو حدیث پاک اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے شمس الائمہ سرخسی المتوفی ۵۰۰ھ لکھتے ہیں۔

کہ رجم حد شرعی محصن کے حق میں ثابت ہے ساتھ سنت کے اس کا انکار خوارج نے کیا ہے (مبسوط صفحہ ۳۶ ج ۹)،

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرد (ماعز بن مالک اسلمی) بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، عرض کی کہ یا رسول اللہ، میں نے زنا کیا ہے اور انھوں نے چار مرتبہ یہ لفظ کہے حضور علیہ السلام نے فرمایا
اس کو لے جاؤ اور اس کو رجم کرو جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو بقیع میں رجم کیا وہ بھاگ پڑے ہم نے ان کو مقام حرہ میں رجم کر کے ختم کر دیا (بخاری شریف صفحہ ۱۰۰۶) مزید امام بخاری نے باب الرجم بالمصلّٰی میں ذکر کیا ہے کہ بعد میں حضور علیہ السلام نے ان کا جنازہ پڑھا اور ان کا ذکر خیر کیا، امام بخاری کتاب الحدود میں ایک طویل حدیث میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ رجم حق ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد لوگ کہہ دیں گے کہ رجم نہیں ہے یہ لوگ اللہ کا ایک اہم فریضہ چھوڑنے پر گمراہ ہو جائیں گے باوجودیکہ رجم (حد شرعی) حق ہے، رجم اس پر ہے جو زنا کرے اور محصن ہو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ گواہوں سے زنا ثابت ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو (صحیح بخاری صفحہ ۱۰۰۹) زانی جب قاضی کے سامنے زنا اور اپنے محصن ہونے کا اقرار کرلے گا یا گواہ زنا پر اور اس کے محصن ہونے پر گواہی دے دیں گے تو زانی کو رجم کیا جائے گا، زنا کا ثبوت چار گواہوں سے یا زانی کے اقرار سے یا حمل سے ہوگا اور محصن ہونے کے ثبوت کے لیے صرف دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ کافی ہیں، محصن

ہونے کی سات شرطیں ۔

(۱) آزاد ہونا ۔ (۲) عاقل ہونا ۔ (۳) بالغ ہونا ۔

(۴) مسلمان ہونا ۔ (۵) نکاح صحیح ہونا ۔ (۶) نکاح صحیح کے ساتھ وطی ہونا ۔ (۷) میاں بیوی دونوں کا وقت وطی میں صفات مذکورہ کے ساتھ متصف ہونا ،

امام سرخسی فرماتے ہیں :

کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ماعز کو رجم کیا جب کہ اس کے محصن ہونے سے سوال کر لیا اور کو بھی رجم کیا ، اس کے سوا اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو کہ رجم کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں ، (مبسوط صفحہ ۳۷ ج ۹) علامہ علی بن ابی بکر فرغانی المتوفی ۵۹۳ھ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں :

کہ جب حد واجب ہو جائے اور زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کو پتھروں کے ساتھ رجم کیا جائے حتیٰ کہ مر جائے اور آخر میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں :

کہ اس پر صحابہ کا اجماع و اتفاق ہے ، (ہدایہ صفحہ ۴۸۹) علامہ بدرالدین عینی حنفی المتوفی ۸۵۵ھ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں ہے کہ کسی مسلمان کا خون گرانا جائز نہیں مگر تین چیزوں کے ساتھ ، ان میں سے ایک زنا بعد الاحصان ہے اس کی تخریج امام ترمذی امام نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے (عینی صفحہ ۴۸۹) یعنے اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہے تو اس کو رجم کیا جائے ، ثابت ہوا کہ اگر زانی شادی شدہ ہے تو اس کو رجم کیا جائے گا اگر غیر شادی شدہ (کنوارا) ہے تو اس کو سو کوڑے مارے جائیں گے ، جج صاحبان کی یہ تاویل کہ وہ عورت فاحشہ تھی پیشہ ور اور بد چلن تھی ، رجم کے انکار کے لیے یہ تاویل غیر معتبر ہے کیونکہ رجم تو کیا گیا تھا حضور علیہ السلام کا حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کو رجم کا حکم فرمانا ہی رجم کے ثبوت کے لیے واضح دلیل اور حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ بھی محصن تھے حضرت غامدیہ بھی محصنہ تھیں ، اسی سے تمام فقہاء اسلام اور ائمہ کرام نے شادی شدہ زانی اور مزنیہ کے لیے رجم کی حد مقرر فرمائی ہے اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے ، اجماع بجائے ایک عظیم شرعی دلیل اور حجت ہے

گویا کہ یہ رجم جو سُنّت نبویہ سے ثابت ہے۔ اسی طرح اجماع صحابہ سے بھی ثابت ہے شرعی بنچ اور وفاقی شرعی عدالت کا انکار بے معنے اور نہایت ہی غلط ہے، رجم کا انکار صرف خارجیوں نے کیا ہے اگر وفاقی شرعی عدالت پاکستان اس کا انکار کرتی ہے تو گویا کہ وہ خوارج کے نظریات سے متاثر ہے جہاں تک رجم کی شرعی حیثیت ہے وہ یہی ہے کہ وہ شادی شدہ زانیہ اور زانی کو پتھر مار کر ختم کر دیا جائے،

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

کتاب الوقف

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درایں مسئلہ کہ ایک قطعہ زمین برائے مکان خریدا گیا، پھر آدھا حصہ زمین کا مسجد کے لیے وقف کیا گیا۔ وہاں مسجد کے لیے چبوترہ بنایا گیا اور وہاں نماز باجماعت شروع کی گئی تقریباً چار سال ہو چکے ہیں کہ یہ مسجد ہی سمجھی گئی ہے۔ اس کیساتھ جانب غربی کچھ زمین بھی مسجد کے لیے وقف کر دی گئی تھی۔ بیچنے والوں نے تمام جگہ کی رجسٹری کر دی تھی اور انہوں نے کہا کہ جب تم مسجد بناؤ گے ہم اس جگہ سے اپنا ملبہ وغیرہ اٹھا لیں گے خریدنے والے نے یہ جگہ بھی وقف کر دی تھی۔ اب وہ ملبہ نہیں اٹھاتے ان کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟

صوفی اللہ رکھا۔ جھگیاں کوٹ پیرو شاہ ضلع گوجرانوالا۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جب ایک جگہ پر مسجد بنادی جائے جیساکہ صورت مسئولہ میں چار سال سے مسجد بنائی گئی ہے وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہدایہ میں ہے:

واذا بنی مسجدا فاذا صلی فیہ واحد زال عند ابی حنیفۃ

عن ملکہ۔

یعنی جب مسجد بنائی گئی اور اس میں نماز پڑھی گئی تو وہ مسجد بن گئی قیامت تک یہ مسجد ہی رہے گی اور اس کے ساتھ جو جانب غربی جگہ رکھی گئی وہ بھی چونکہ وقف ہوگئی ہے لہٰذا اس پہ بھی کسی کا حق ملکیت باقی نہیں رہا۔ قدوری میں ہے:

واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولا تملیکہ۔

جب وقف صحیح ہو جائے تو نہ اس کی بیع ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس پہ کوئی حق ملکیت قائم کر سکتا ہے۔ جب رجسٹری ہو چکی ہے اور خریدنے والے نے وقف کر دی ہے تو اب فروخت کرنے والوں کا وہاں قبضہ جمائے رکھنا کسی صورت میں بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

وَاللّٰہُ وَرَسُولُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ مسجد کا سامان (مثلاً لالٹین، دریاں وغیرہ) پرانا ہو گیا ہے اور اب مسجد کو کوئی ضرورت نہیں ہے کیا وہ فروخت ہو سکتا ہے یا کسی دوسری مسجد میں منتقل کیا جائے۔ جو حکم شرعی ہو اس کو تحریر کیا جائے۔

سائلین از غوطہ ضلع سیالکوٹ۔ ۱۸ / ۱۱ / ۶۶

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر مسجد کا سامان کہنہ اور پرانا ہو گیا ہے اور مسجد کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو قول ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اس کو فروخت کر کے مسجد پر لگایا جا سکتا ہے۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

رجل بسط من مالہ حصیراً فی المسجد و ان بلی ذالک کان لہ ان یبیع ویشتری بثمنہ حصیراً آخر وکذ لو اشتری حشیشا او قندیلا للمسجد عند ابی یوسف یباع ویصرف ثمنہ الی حوائج المسجد فان استغنی

عنه هذا المسجد یحول الی مسجد آخر۔

اگر کسی نے مسجد میں دری بچھائی اور وہ بوسیدہ ہوگئی اس کے لیے جائز ہے کہ اس کو فروخت کردے اور اس قیمت کے ساتھ اور دری وغیرہ خرید کر مسجد میں ڈال دے ۔ اسی طرح اگر گھاس یا لالٹین خریدی اور وہ پرانی ہوگئی ہے تو ابو یوسف کے نزدیک فروخت کر کے مسجد کی ضروریات میں صرف ہوسکتی ہے اگر اس مسجد کو ضرورت نہیں ہے تو دوسری مسجد کی طرف بھی منتقل ہوسکتی ہے اگر مسجد کی جائیداد غیر منقولہ ہے تو وہ فروخت نہیں ہوسکتی چونکہ فی زمانہ مسجد کی چیزیں منقولہ بعض دفعہ مسجد میں پڑے رہنے کی وجہ سے بالکل ضایع ہو جاتی ہیں لہذا قول ابی یوسف کے مطابق ان کو فروخت کر دینا چاہیئے ۔ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس آدمی نے مسجد میں دریاں بچھائی ہیں وہی فروخت کرے یا اس کے وارث اگر نہیں تو قاضی لیکن ہمارے زمانہ میں جو آدمی مسجد کو کوئی چیز دیتا ہے پہلے تو واپس نہیں لیتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مساجد میں انتظامی امور کے لیے کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں وہی مسجد کا انتظام وغیرہ کرتی ہیں لہذا وہ بھی اگر فروخت کریں تو فروخت کر سکتی ہیں ۔

لان عامة اهل الاسلام بمنزلة القاضی ۔

کہ عام اہل اسلام بمنزلہ قاضی کے ہیں ۔ اگر سامان منقولہ نہایت بوسیدہ اور قابل استعمال نہیں رہا تو اس کو فروخت کر کے امام ابو یوسف کے قول کے مطابق مسجد میں صرف کر سکتے ہیں ۔ اگر اس مسجد کو ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز کو کوئی خریدتا ہے تو پھر ضایع کرنے کی بجائے اس سامان کو کسی دوسری مسجد میں منتقل کر دینا بہتر ہے بشرطیکہ وہ دوسری مسجد میں کار آمد ہو سکے ورنہ نہیں ۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی نے مسجد کے نام پر زمین کو وقف کیا اور لوگوں کو کہا کہ میں اس جگہ پر مسجد تعمیر کروں گا۔ لوگوں نے اس کو

سجد کی تعمیر کے لیے کچھ چندہ وغیرہ بھی دیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ لوگ میرے ساتھ تعاون نہیں کرتے ور اس نے جگہ کو فروخت کر دیا ہے جس پر مکان تعمیر ہو رہا ہے وہ کہتا ہے کہ میں اس رقم سے اور جگہ خرید کر دوسرے مقام پر مسجد تعمیر کروں گا۔ لہٰذا اس صورت کو شرعی حیثیت سے واضح فرمائیں۔

حافظ محمد اسلم۔ خطیب دھنیالہ ضلع جہلم۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں زمین کا وقف مسجد کے لیے مطلق وقف نہیں ہے بلکہ مقصد مسجد بنانا تھا۔ مسجد کے لیے ضروری ہے کہ یہ لوگوں کو کہہ دیتا کہ میں نے اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے مسجد بنا دیا ہے اور اس میں نماز پڑھا کرو یا یہ نیت ہو کہ میں نے اس کو مسجد بنا دیا ہے۔ جب بھی سجد ہے مسجد کے لیے عمارت کا ہونا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ اگر خالی زمین کو بھی اگر وہ اجازت ے دے کہ اس میں ہمیشہ نماز پڑھا کرو تو مسجد ہو جائے گی۔ اگر ان صورتوں میں کوئی نہیں تو پھر مسجد نہ ہوگی۔ فقہاء لکھتے ہیں،

واذا بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقة و يأذن للناس بالصلوة فاذا صلى فيه واحد زال عند ابى حنيفة عن ملكه۔

ردالمحتار میں ہے کہ مسجد کے لیے ضروری ہے کہ وہاں مسلمان علی الاعلان نماز پڑھیں۔ نماز کی شرط اس لیے ہے تاکہ عام مسلمین کا مسجد پر قبضہ ثابت ہو جائے۔ اس مالک کا خود صرف نماز پڑھنا کافی نہیں ہے۔ جب وہ مسلمانوں کو اجازت دے گا تو پھر مسجد ہوگی۔ مذکورہ صورت میں مسجد متحقق ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی اس نے وقف کو مسجد کے نام رجسٹرڈ کرایا ہے تاکہ مطلق وقف ثابت ہو جائے۔ مطلق وقف ثابت ہونے کی صورت میں بھی اس کی بیع و شرا ناجائز تھی۔ لہٰذا اندریں صورت وہ زمین فروخت کر سکتا ہے کیونکہ اس نے نہ مسجد بنائی ہے اور نہ ہی اس کی نیت کی ہے اگر نیت کی ہے تو لوگوں کو کہتا کہ اس میں نماز پڑھو۔ مسجد اس وقت بنتی جب وہ یہ کہتا کہ میں نے یہ زمین مسجد کے لیے

دی ہے اور تمام مسلمانوں کو اجازت دیتا کہ وہ اس میں نماز پڑھیں یا وہ نیت کر لیتا اور مسلمانوں کو قبضہ دے دیتا تو پھر مسجد ہو جاتی پھر اس کا فروخت وغیرہ کرنا منع تھا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ مسجد کے وقف کا حکم دوسرے اوقاف سے مختلف ہوتا ہے اگر اس نے کسی مسلمان کو نماز پڑھنے کے لیے اس زمین پر نہیں کہا اور نہ ہی زمین پر قبضہ دیا ہے تو پھر وہ مسجد نہ ہوگی۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہر محلے دار مسلمان مسجد کے انتظام و حساب وکتاب میں حق رکھتا ہے یا نہیں۔ شرعی حکم تحریر کریں۔

سائلین از گوجر خاں ضلع راولپنڈی۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں مسجد کا انتظام اور حساب وکتاب رکھنا اصل واقف مسجد جب تک موجود ہے اس کی ذمہ داری ہے اور کسی کو متولی کرنا بھی واقف کا ہی حق ہے۔

فتاویٰ شامی ص ۴۲۶ میں ہے:

قال فی البحر الرائق ان الولایۃ للواقف ثابتۃ مدۃ حیاتہ وان لم یشترطہا وان لہ عزل المتولی۔

یعنی ولایت واقف کے لیے ثابت ہے۔ اس کی زندگی میں اگرچہ اس کی شرط نہ کرے اور اس واقف کو متولی کو معزول کرنے کا حق ہے۔ اگر اہل محلہ سے ایسے اشخاص ہیں جنہوں نے مسجد بنا کر وقف کی تھی تو ان کو حساب وکتاب رکھنے کا حق حاصل ہے جس کو چاہیں وہ متولی مقرر کریں اگر یہ لوگ واقف نہیں اور اصل واقف فوت ہو گیا ہے تو پھر ان لوگوں کا حق نہیں ہے بلکہ یہ قاضی کا حق ہے۔ درمختار میں ہے:

ولایۃ نصب القیم الی الواقف ثم لوصیہ ثم للقاضی۔

حق وقف پہلے واقف کے لیے ہے پھر جس کو اس نے وصیت کی ہے اور اس کے بعد قاضی کو ہوگا۔ ہر عام کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کہے کہ مسجد کا انتظام اور حساب و کتاب مجھے دیا جائے بلکہ یا تو وقف کرنے والا خود انتظام کرے گا یا جو اس نے متولی مقرر کیا ہے اگر کوئی صورت نہ ہو تو پھر قاضی وقت اس انتظام کو اپنی نگرانی میں لے گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

حضرت مولانا صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ایک مسئلہ دریافت طلب ہے کہ مدینہ منورہ میں جو مسجد اجابہ ہے اس کو مسجد اجابہ کیوں کہتے ہیں؟

سائل جمال دین از نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

مسجد کا نام اجابہ اس لیے ہے کہ یہاں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں قبول ہوئی تھیں۔ ایک امت کا قحط سے نہ مرنا اور دوسری دعا امت کا غرق سے ہلاک نہ ہونا لہٰذا اس مسجد کا نام اجابہ رکھا گیا ہے۔ جب مسلمان کو مدینہ منورہ کی حاضری نصیب ہو تو اس مسجد کی زیارت بھی لازمی کرنی چاہیئے۔ (زاد السبیل ص ۱۳۲)

وَاللہ وَرَسُولہ اَعلم بِالصَّواب۔

کتاب البیوع

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ مردہ جانور بھینس بیل وغیرہ کا چمڑہ آتار کر اور اس کو نمک لگا کر خشک کرنے کے بعد اس کا بیچنا اور خریدنا جائز ہے یا نہیں شرعی حکم کیا ہے؟

علم دین امام مسجد علاقہ بدھوٹی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں چمڑا مدبوغ (رنگا ہوا) ہو گیا ہے لہذا اس کا بیچنا جائز ہے کیونکہ چمڑا دباغت کے بعد خواہ مذبوح کا ہو یا مردار کا یا ماکول اللحم (جس کا گوشت کھایا جائے) کا ہو یا غیر ماکول اللحم (جس کا گوشت نہ کھایا جائے) کا ہو سوائے چمڑے خنزیر اور آدمی کے پاک ہو جاتا ہے۔ نور الایضاح ص۵۵ میں ہے:

یطھر جلد المیتۃ بالدباغۃ الحقیقۃ کالقرظ وبالحکمیۃ کالتتریب والتشمیس الاجلد الخنزیر والآدمی۔

مردار کا چمڑا دباغت حقیقیہ کے ساتھ پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ قرظ (کیکر کا چھیل اور چونہ وغیرہ) کے ساتھ رنگا جائے اور حکمیہ کے ساتھ جیسا کہ مٹی اور دھوپ سے مگر چمڑا خنزیر اور آدمی کا (کیونکہ خنزیر نجس العین ہے اور آدمی بوجہ عزت کے) اور امام محمد نے

فیل (ہاتھی) کو بھی نجس العین میں شمار کیا ہے اور ہدایہ صہ۴۲ میں ہے:

وکل اھاب دبغ فقد طھر وجازت الصلوٰۃ فیہ والوضوء منہ الا جلد الخنزیر والآدمی لقولہ علیہ السلام ایما اھاب دبغ فقد طھر۔

اور ہر چمڑا جب رنگا جائے پس تحقیق پاک ہوجاتا ہے اور اس میں نماز جائز ہے اور اس سے وضو بھی جائز ہے مگر چمڑا خنزیر اور آدمی کا کیونکہ نبی علیہ السلام فرماتے ہیں جو چمڑا رنگا جائے پس وہ پاک ہوجاتا ہے۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

واذا طھرت بالذکاۃ جاز الانتفاع بھا فیکون محلا للبیع۔

جب ذبح کے ساتھ پاک ہوجائے تو اس کے ساتھ نفع حاصل کرنا جائز ہے پس وہ بیع کے لیے بھی قابل ہے یعنی اس کی خرید و فروخت ہوسکتی ہے۔ ہدایہ میں ہے:

ولا بأس ببیعھا والانتفاع بھا بعد الدباغ لانھا طھرت۔

رنگنے کے بعد اس کے ساتھ نفع اٹھانا اور بیع میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ بعد از دباغت طہارت ہوجاتی ہے اور مذکورہ چمڑے کی تجارت جائز اور حلال ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی نے ایک بھینس دوسرے کو دی کہ وہ اس کی پرورش کرے اور جو اس سے بچے ہوں گے وہ مشترکہ ہوں گے۔ یہاں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔ آپ فتویٰ لکھ کر بھیجیں کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔

حاجی رحمت علی

لالہ موسیٰ نزد ریلوے سٹیشن ضلع گجرات۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

یہ صورت جائز نہیں ہے بلکہ یہ شرکت فاسدہ ہے جو بھینس کا مالک ہے وہی بھینس کے بچوں کا مالک ہے۔ جو آدمی ان کی پرورش کرتا ہے اس کو مزدوری اور اجرت دینی چاہیئے اور جو اُس نے چارا ڈالا ہے اس کی قیمت۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے :

اذا دفع البقرۃ الی انسان بالعلف لیکون الحادث بینہما نصفین فما حدث فہو لصاحب البقرۃ و لذالک الرجل مثل العلف الذی علفہا و اجر مثلہ فیما قام علیہا۔

جب ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو بھینس یا گائے دی ہے کہ وہ اس کو چارہ ڈالے اور جو بچے وغیرہ ہوں گے وہ دونوں کے درمیان مشترک ہوں گے اور اب جو بچے پیدا ہوئے ہیں وہ مالک بھینس کے ہی ہوں گے اور جو کام کرتا رہا ہے اس کو چارے کی قیمت اور اس نے جو محنت کی ہے اس کا معاوضہ دیا جائے۔ وہ پرورش کرنے والا بچوں میں شریک نہیں بن سکتا۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے خالد کے پاس زمین گروی اور رہن رکھی اور زید نے پانچ سو روپے لیے ہیں۔ اب خالد دس سال اس زمین کی آمدنی کھاتا رہا اور مالیہ بھی ادا کرتا رہا۔ کیا یہ خالد کے لیے زمین کی آمدنی جائز تھی۔ دس سال کے بعد خالد نے پورے پانچ سو روپے اپنے واپس لے کر زمین چھوڑی ہے اور اس زمین سے جو گندم آتی رہی وہ خالد ہی کھاتا رہا ہے اور اب ایک آدمی نے اس کو کہا کہ یہ ناجائز اور حرام ہے تو وہ کہنے لگا کہ حدیث میں ہے کہ مرہونہ چیز کی آمدنی اور نفع کھانا جائز ہے۔ وہ یہ حدیث پیش کرتا ہے :

الظھیریۃ کب بنفقتہٖ اذا کان مرھونا مرھون۔

گھوڑے پر جب تم اس کا خرچہ دو سفر (نفع) کر سکتے ہو۔ لہٰذا وہ زمین کا خرچہ مالیہ وغیرہ دیتا ہے تو اس کی آمدنی بھی وہ کھا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مرہونہ چیز سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔

رقمہٗ: محمد امین ضلع و مقام ساہیوال۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

ربا (سود) کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور مرہونہ چیز سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے، در مختار میں ہے:

وقیل لا یحل للمرتھن لانہ ربا۔

یعنی مرتہن (جس کے پاس رہن رکھا گیا ہے) کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ مرہونہ چیز سے نفع اٹھائے۔ اشباہ والنظائر میں ہے:

یکرہ للمرتھن الانتفاع بالرھن باذن الراھن۔

مرتہن کے لیے مرہونہ چیز سے اذن راہن سے بھی نفع اٹھانا مکروہ ہے۔ در مختار میں ہے:

لا الانتفاع بہ مطلقا لا باستخدام و لا سکنی و لا لبس مرھونہ

مرہونہ چیز سے نفع اٹھانا مطلقاً منع ہے نہ ہی اس سے خدمت لے سکتا ہے اور نہ ہی اس میں رہائش کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے پہن سکتا ہے اور اشباہ میں ہے:

کل قرض جر نفعا حرام فکرہ للمرتھن سکنی المرھونۃ باذن الراھن کما فی الظھیریۃ۔

ہر وہ قرض جس سے نفع ہو وہ حرام ہے پس مرتہن کے لیے مرہونہ مکان میں رہائش اور سکونت اختیار کرنی مکروہ ہے۔ اذن راہن کے ساتھ جیسا کہ ظہیریہ میں ہے۔ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

المرتهن سکن الدار المرهونة باذن الراهن یکره۔

مرتہن کی سکونت دار مرہونہ میں باجازت راہن مکروہ ہے اور حاشیہ اشباہ میں ہے:

عن عبد اللہ بن محمد بن اسلم انہ لا ینتفع بشیٔ منہ وان اذن

لہ الراھن لانہ اذن فی الربا لانہ یستوفی دینہ فتکون المنفعۃ ربا۔

عبد اللہ بن محمد بن اسلم سے روایت ہے کہ مرہونہ چیز سے نفع نہ لیا جائے اگرچہ راہن اسکی اجازت ہی دے رہا ہے کیونکہ اصل قرض تو مرتہن وصول کر رہا ہے۔ لہذا منفعت ربا (سود) ہوگا جو کہ حرام ہے۔

ان تمام فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوا کہ مرہونہ چیز سے نفع اٹھانا چونکہ ربا میں داخل ہے، لہذا حرام ہے۔ مرہونہ چیز کی آمدنی راہن ہی لے گا اور خرچہ بھی راہن کے ذمہ ہی ہے۔ ہدایہ میں ہے:

والاصل انہ مایحتاج الیہ لمصلحۃ الرھن وتبعیتہ فھو علی

الراھن سواء کان فی الرھن فضل اولم یکن لان العین باقٍ

علی ملکہ وکذالک منافعہ مملوکۃ لہ فیکون اصلاحہ وتبعیتہ

علیہ لما انہ مؤنۃ ملکہ کما فی الودیعۃ والخراج علی الراھن۔

اور ضابطہ یہ ہے کہ مرہونہ کی بقا اور اصلاح راہن پر ہے خواہ مرہونہ چیز میں زیادتی ہو یا نہ ہو کیونکہ مرہونہ چیز راہن کی ملک پر بعینہٖ موجود ہے اور اسی لیے مرہونہ چیز کے منافع کا مالک بھی راہن ہوتا ہے پس اس کی اصلاح اور بقا کا ذمہ دار بھی وہی ہے کیونکہ یہ ضمانت اس کی ملک کی وجہ سے ہی اس پر عائد ہے جیساکہ ودیعت (امانت) میں ہوتا ہے اور مالیہ خصوصاً راہن پر ہی ہوگا اور جو حدیث پیش کی گئی ہے وہ آیت ربوا (سود) کے ساتھ منسوخ ہے۔

محدثین کہتے ہیں:

الحدیث منسوخ بآیۃ الربوا

کہ حدیث آیت ربوا کے ساتھ منسوخ ہے۔ شاہ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

گفتہ اند کہ ایں حدیث منسوخ است بحدیث آئندہ ۔

کہ یہ حدیث منسوخ ہے حدیث آئندہ کے ساتھ۔ بہرنوع حدیث مذکور منسوخ ہے اس کی ناسخ یا قرآن کی آیت یا حدیث پاک ہے اور مرہونہ چیز سے کسی قسم کا نفع اٹھانا مرتہن کے لیے جائز نہیں ہے۔

خالد جو زمین سے نفع اٹھاتا رہا ہے وہ حرام ہے اس کو چاہیئے کہ وہ راہن (مالک زمین) کو واپس کرے اور جو اس نے زمین پر خرچ کیا ہے وہ آمدنی سے کٹوتی کر لے، باقی ماندہ آمدنی راہن کو واپس کر دے۔

واللہ ورسولہ، اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک عزیزہ نے تاج کمپنی لمیٹڈ میں اپنی رقم (تیس ہزار روپے) لگائی ہے جس پر تاج کمپنی والوں نے ۵۰۰/ روپے ماہوار منافع مقرر کر کے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ سے استفسار ہے کہ آیا یہ منافع سود کے زمرے میں تو نہیں آتا۔ آپ تحریر فرمائیں کہ سود ہے یا نہیں؟

از دفتر حاجی ذاکر علی صدیقی رونکی کراچی لالوکھیت۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مستفسرہ صریح سود ہے جو کہ شرعاً حرام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

واحل اللہ البیع وحرم الربوا

اور اللہ نے بیع (تجارت) کو حلال کیا ہے اور ربا (سود) کو حرام کیا ہے اور سود کی شرعی تعریف یہ ہے کہ:

فضل مال لا یقابلہ عوض فی معاوضۃ مال بمال۔

کہ وہ عقد معاوضہ ہے۔ جب دونوں طرف مال ہو اور ایک طرف زیادتی ہو کہ اس کے

مقابلہ میں دوسری طرف کچھ نہ ہو۔ صورت مذکورہ میں کہ تیس ہزار روپیہ پر تاج کمپنی والے پانچ صد روپیہ (۵۰۰) ماہوار دیا کریں گے یہی سود ہے جو کہ حرام ہے۔ یہ بیع اور تجارت ہرگز نہیں بیع میں بھی نفع ہوتا ہے لیکن وہ نفع متخالف اجناس میں ہوتا ہے۔ فقہاء فرماتے ہیں

احللنا الربح فی بیع جنسین متخالفین۔ (کفل الفقیہ صلاا)

یہی سود اور بیع میں فرق ہے کہ بیع متخالف اجناس میں ہوتی ہے جس پر نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور سود متماثل اجناس میں ہوتا ہے جس میں صرف نفع ہی ہوتا ہے نقصان کا احتمال تک نہیں ہوتا اور صورت مستفسرہ میں متماثل اجناس ہیں اور صرف نفع کا ہی تعین کیا گیا ہے لہذا یہ صریح سود ہے۔

حدیث پاک میں ہے حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ سود کھانے سے کوئی نہیں بچے گا۔ اگر سود نہ کھائے گا تو اس کے غبار سے نہیں بچے گا۔ مثلاً یا سود دے گا یا گواہی دے گا یا دستاویز لکھے گا یا سودی روپیہ کسی کو دلانے کی کوشش کرے گا یا سود خوار کے ہاں دعوت کھالے گا۔ ایسی کمپنی میں بنیادی طور پر رقم جمع کرانی ہی حرام ہے جو کہ سودی کاروبار کرتے ہیں۔ بہر کیف صورت مسئولہ میں روپیہ جمع کرانا اور اس پر مقرر کردہ نفع لینا حرام ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت حضرت مولانا مفتی صاحب

السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ ایک مسئلہ کا جواب دے کر مشکور فرمائیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر مسجد یا مدرسہ کے فنڈ کا پیسہ بنک میں جمع کرایا جائے تو اس پر جو منافع ملتا ہے وہ لینا جائز ہے یا نہیں۔ اگر مسجد یا مدرسہ پر خرچ کرنا ناجائز ہے تو اس کا بہتر مصرف کونسا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ بنک سے منافع کا پیسہ نہ لیا جائے اور کرنٹ اکاؤنٹ کھلوایا جائے

اور بعض کا خیال ہے کہ بنک سے منافع لیا جائے اور اسے کسی دوسری مد میں خرچ کیا جائے کیونکہ بنک میں منافع چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے اور وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ بنک میں پیسے جمع کرانے سے وہ پیسہ سودی کاروبار میں تو استعمال ہوتا ہے اور جرم کرنے والا اور اعانت جرم کرنے والا برابر ہیں اور چونکہ بنک پہلے ہی اس سے منافع اٹھاتا ہے اس لیے مزید منافع چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح عام آدمی کے متعلق کیا حکم ہے جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: رانا محمد اسلم (بیلاں) حال کلرک
پراویڈنٹ فنڈ آفس کوہ نور کاٹن ملز لیاقت آباد (میانوالی)

الجواب بعونہ تعالیٰ

سود قطعاً حرام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔

اللہ نے بیع (تجارت) کو حلال کیا ہے اور ربوا (سود) کو حرام۔

تجارت میں نفع ہوتا ہے لیکن بیع و تجارت متخالف اجناس میں ہوتی ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں:

احللنا الربح فی بیع جنسین متخالفین (کفل الفقیہ ص ۱۱)

اور سود متماثل اجناس میں ہوتا ہے جس میں صرف نفع ہی نفع ہوتا ہے احتمال نقصان کا نہیں ہوتا اور سود کی شرعی تعریف یہ ہی ہے۔

فضل مال لا یقابلہ عوض فی معاوضۃ مال بمال۔

کہ وہ عقد معاوضہ ہے کہ جب دونوں طرف مال ہو اور ایک طرف زیادتی ہو کہ اس کے مقابلہ میں دوسری طرف کچھ نہ ہو۔ جب سود قطعاً حرام ہے تو پہلے سودی بنک میں رقم ہی نہیں جمع کرانی چاہیئے خواہ مسجد کی ہو یا مدرسہ کی یا عوام کی۔ کیونکہ یہ اعانت علی المعصیت ہے جو کہ جرم شرعی ہے پھر سود اور منافع لے کر مسجد پر خرچ کرنا حرام اور ناجائز ہے کیونکہ

سود مال خبیث ہے ۔ فتاویٰ شامی میں ہے :

قال تاج الشریعة اما لو انفق فی ذالک مالا خبیثا او سببه الخبیث فیکره لان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بما لا یقبله ۔

اگر مال خبیث مسجد پر صرف کیا یا جو سبب خبیث سے مال حاصل ہوا ہے تو مکروہ (تحریمی) ہے کیونکہ طیب، مال کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے گھر کو خبیث مال سے ملوث نہیں کرنا چاہیئے لہذا سودی روپیہ مسجد پر ہرگز نہیں خرچ کرنا چاہیئے ۔ اب رہی یہ بات کہ اگر ایک آدمی کے پاس ایسا روپیہ (یعنی حرام) جمع ہو جائے تو اس کو کیا کرے تو صاحب ہدایہ فرماتے ہیں :

وما هذا حاله فسبیله التصدق ۔

یعنی جو مال سبب خبیث کی وجہ سے اس کے پاس جمع ہو گیا ہے وہ فقراء اور غریبوں پر تقسیم کر دے ۔ مدرسہ میں چونکہ طالب علم غریب ہوتے ہیں ان پر خرچ کیا جائے لیکن مسجد پر ہرگز خرچ نہ کیا جائے ۔ مسجد کی رقم مسجد پر خرچ کر دینی چاہیئے یا کسی امین متمول آدمی کو دی جائے تاکہ اس کے پاس محفوظ رہے اور بنک میں جمع کرانے کی کیا ضرورت ہے ۔ یہ جزئیہ صاحب ہدایہ نے کتاب الغصب میں ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اتفاقاً اگر مال حرام جمع ہو جائے اور وہ خدا سے ڈرے تو اس کا طریقہ ہے کہ اس کو غریبوں پر تقسیم کر دے ۔ یہ عمداً طریقہ ہرگز نہ اختیار کیا جائے کہ پہلے مال حرام جمع کرتا رہے پھر اس کو صدقہ کرنا شروع کر دے ۔ بہرصورت سود اور بنک میں جمع شدہ رقم کا نفع (سود) مسجد پر صرف نہ کیا جائے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سرکار کی طرف سے جو روپیہ در باب انکم ٹیکس بلاعوض ہم سے لیا جاتا ہے اگر اسی قدر روپیہ بواسطہ سود سیونگ بنک کے ہم سرکار (حکومت) وصول کرلیں تو جائز ہوگا یا نہیں۔ بینوا و توجروا۔

المستفتی: خالد حسن قادری مقیم لندن (برطانیہ)

الجواب بعونہ تعالیٰ

جائز و درست ہوگا کیونکہ ہم اپنا مال موقعہ پاکر وصول کرتے ہیں وہ سود نہیں ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسا کہ مدیون کا مال دائن کے ہاتھ میں گرے اور وہ اس کے جنس حق میں سے موزوہ لے سکتا ہے اور دین ساقط ہو جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

رجل له على آخر دين فاخذ من ماله مثل حقه قال الصدر الشهيد والمختار انه لا يصير غاصبا لانه اخذ باذن الشرع لكن به يصير مضمونا عليه لان هذا الطريق قضاء الدين كذا في المحيط ولو كان على رجل دين فاخذ غير صاحب الدين من المديون ودفع الى صاحب الدين اختلف المشايخ فيه قال نصير بن يحى يصير قصاصا عن الدين لان الاخذ بمنزلة المعين له على اخذ حقه والفتوى على هذا القول۔

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

رجل مات وعليه دين وله دين على رجل آخر فاخذ صاحب دين الميت يكون غاصبا ويصير ما اخذ قصاصا بدينه لانه اخذ مال الميت بغير اذنه وقال بعضهم لا يكون غاصبا وهو الصحيح

لانہ اخذ باذن الشرع الدان الماخوذ یصیر مضمونا علیہ فیکون قصاصا بدینہ کمالوظفربمال المدیون فی حیوانہ من جنس دینہ قال فی الہدایۃ فانہ یملکہ المالک و صاحب الدین اذاظفربجنس حقہ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک آدمی اپنی تمام جائیداد اپنے ایک لڑکے کو دے جاتا ہے دوسروں کو کچھ نہیں دیتا حالانکہ اس کے دوسرے بھی بچے ہیں۔ کیا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

حافظ غلام محی الدین منگلا کالونی۔

الجواب بعونہ تعالی

صورت مسئولہ میں اگر والد نے اپنے ایک بچے کے نام اپنی جائیداد ہبہ کر دی ہے تو جائز ہے اگر یہ بچہ اپنے والد کی خصوصی خدمت کرتا ہے اور والد اس پر دوسروں کی نسبت زیادہ راضی ہے۔ فتاوی قاضی خاں میں ہے:

ولو وھب رجل شیئا لاولادہ فی الصحۃ واراد تفضیل البعض فی ذالک علی البعض لاروایۃ لھذا فی الاصل عن اصحابنا و روی عن ابی حنیفۃ انہ لاباس بہ وایضافیہ رجل اعطی لاحد اولادہ شیئا فی صحتہ قال الفقیہ ابوبکر البلخی ان فعل ذالک لزیادۃ خدمتہ ھذا الولد وبرہ لاباس بہ وان استوداً فی ذالک لاینبغی لہ ان یفعل ذالک۔

اگر ایک مرد نے اپنی اولاد کے لیے کوئی چیز ہبہ کی جس میں اس نے بعض دوسروں

کو فضیلت دی۔ اس مسئلہ کے لیے ہمارے اصحاب سے اصل (مبسوط) میں کوئی روایت ذکر نہیں کی گئی اور ابو حنیفہ سے اس میں ایک روایت یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور قاضی خاں میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی نے اپنی اولاد سے ایک کو کوئی چیز اپنی تندرستی میں عطا کی، ابو بکر بلخی فقیہہ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے یہ اس لیے کیا کہ وہ لڑکا اس کا زیادہ فرماں بردار اور خدمت گار ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر تمام اولاد فرماں برداری میں مساوی ہے تو پھر خصوصی طور پر ایک کو ہبہ کرنا مکروہ ہے۔ در مختار میں ہے:

ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز واثم

اگر کسی نے اپنی تندرستی میں ایک لڑکے کے لیے تمام مال اور جائیداد ہبہ کر دی یہ جائز ہے لیکن والد گنہگار ہوگا۔ بہر نوع اگر والد نے اپنی جائیداد اپنے ایک لڑکے کے نام اپنی صحت و تندرستی میں ہبہ کر دی ہے تو یہ ہبہ اس کا جائز ہے بشرطیکہ یہ لڑکا اپنے والد کا زیادہ فرمانبردار اور خادم ہے۔ اگر تمام لڑکے اس کی خدمت میں برابری کرتے ہیں اور تمام ہی تابعدار ہیں تو ایک کو ترجیح دے کر اس کو ہبہ کر دینا یہ گناہ اور زیادتی ہے۔ اب اس کو اپنی اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنا چاہیئے تھا لیکن پھر بھی اگر ہبہ خصوصی کر دیا ہے تو یہ ہبہ شرعاً جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رہن زمین لینا جائز ہے یا نہیں۔ اگر جائز ہے تو کس صورت میں۔ کیا حکومت کا یہ قانون رہن زمین کے بارے میں کہ بیس سال کے بعد بلا معاوضہ زمین آزاد کر دی جائے شرعی ہے؟

المستفتی: قمر الاسلام ٹیچر اسلامیہ سکول لپسرور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

ہمارے زمانہ میں مروجہ مرہونہ زمین ناجائز ہے کیونکہ مالک زمین روپیہ لے لیتا ہے اور

زمین کی پیداوار مرتہن (جس کے پاس زمین زرمن رکھی گئی ہے) کھاتا رہتا ہے اور پھر مرتہن اپنی تمام رقم بھی واپس لیتا ہے پھر زمین چھوڑتا ہے ایسی رہن ناجائز اور حرام ہے درمختار میں ہے،

لا الانتفاع به مطلقاً لا باستخدام ولا سکنی ولا لبس ولا یحل للمرتہن لانہ ربا۔

مرہونہ چیز کے ساتھ نفع حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس میں رہایش اگر مکان ہو اور نہ ہی خدمت لے سکتا ہے اگر غلام وغیرہ ہو اور اگر کپڑے مرہونہ ہیں تو ان کو پہن نہیں سکتا کیونکہ یہ ربا اور سود ہے جو کہ حرام ہے۔ رہن کی شرعی صورت صرف جائز یہ ہے کہ آپ کسی کو رقم دیتے ہیں وہ آپ کے پاس زیور یا زمین یا کوئی منقولہ یا غیر منقولہ چیز رکھتا ہے تاکہ رقم ضایع نہ ہو۔ اس مرہونہ یعنی زیور یا زمین وغیرہ سے نفع ہرگز نہیں اٹھا سکتے اگر نفع اٹھائیں تو پھر یہ سود ہوگا جو کہ حرام ہے۔ اگر آپ رقم دیں اور زیور رکھیں تو زیور کو استعمال نہیں کر سکتے۔ جب مالک زیور رقم دیگا اس کو زیور واپس کر دیا جائے گا۔ یہی رہن کی شرعی حیثیت ہے جس کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے چونکہ آجکل مرہونہ زمین سے مرتہن نفع اٹھاتا ہے اور پھر اصل رقم بھی واپس لے لیتا ہے لہذا مروجہ رہن زمین ناجائز ہے۔ حکومت کا جو قانون ہے وہ شرعی صورت نہیں ہے۔ اگر پہلے رہن دیتے وقت یہ شرط کر لی جائے کہ بیس سال کے بعد زمین سمجھی جائیگی اور رقم واپس بھی نہ ہوگی تو یہ رہن نہیں رہے گا بلکہ یہ اجارے میں داخل ہوگا جو کہ شرعاً جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

قبلہ مفتی صاحب

سلام مسنون! ایک مسئلہ دریافت طلب ہے کہ ہمارے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ ہم تین بھائی ہیں اور ایک ہمشیرہ ہے۔ تمام جائیداد اور زمین وغیرہ والد صاحب کے نام تھی۔ والد صاحب ہی دیکھ بھال کرتے تھے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد

بڑے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ والد صاحب نے میرے نام زمین ہبہ کر دی تھی اور ہبہ نامہ بھی وہ دکھاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہبہ شرعی طور پر صحیح ہے باوجودیکہ والد صاحب نے بھائی صاحب کو قبضہ بھی نہیں دیا تھا خود والد صاحب ہی قابض رہے اور پھر فوت ہو گئے اب تمام بھائیوں نے یہ اتفاقی فیصلہ کیا ہے کہ علی پور شریف سے جو فتویٰ آئے اس پر عمل کیا جائے گا۔ لہذا واپسی ڈاک جواب تحریر فرمائیں۔

محمد اشرف جماعتی از ملتان۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

بر تقدیر صحت صورت مسئولہ میں جو آپ کے والد نے زمین اور جائیداد چھوڑی ہے وہ موہوبہ نہیں ہے بلکہ وہ متروکہ ہے۔ کیونکہ ہبہ کے لیے قبضہ مکمل شرط ہے اور جب آپ کے والد خود قابض رہے اور مرنے تک قبضہ نہیں دیا تو یہ ہبہ بوجہ قبضہ نہ ہونے کے ہبہ صحیح نہیں ہے۔ آپ کے بڑے بھائی کا دعویٰ غلط ہے بلکہ یہ تمام جائیداد متروکہ اور موروثہ ہے۔ تمام وارث اپنے حقوں کے مطابق حصہ لیں گے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں:

اذا مات الواهب قبل قبض الموهوب له الهبة بطلت وتكون ميراثا عن الواهب كما فى متروكاته۔ (فتاوی مهدویه صـ۵۷۳)

کہ جب ہبہ کرنے والا ہبہ کا قبضہ دینے سے پہلے ہی مر گیا تو ہبہ باطل ہو جائے گا اور ہبہ کرنے والے کی طرف سے وہ ہبہ وراثت بن جائے گا۔ جیسا کہ دیگر اشیاء وراثت بن جاتی ہیں، لہذا صورت مذکورہ میں ہبہ صحیح نہیں اور آپ کے بڑے بھائی کا دعویٰ غلط ہے آپ کے باپ کی تمام جائیداد تمام وارثوں کے درمیان ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔

اللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الایمان

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ محمد اسلم نے اپنی بیوی کو کہا ہے کہ تیرے ہاتھ اگر میں روٹی کھاؤں تو خنزیر کھاؤں۔ اب وہ کیا کرے، کفارہ دے یا روٹی نہ کھائے وہ بہت مجبور ہے۔ آپ شرعی فیصلہ تحریر فرما کر روانہ کریں۔

ایک سائل از رعیہ خاص ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں یہ شرعی طور پر قسم ہی نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ ج۲ میں ہے:

ولو قال ھو یأکل المیتۃ ان فعل کذا لا یکون یمینا۔

اگر کہا، اگر اس نے یہ کام کیا (مثلاً روٹی کھائی) تو وہ مردار کھائے گا قسم ہی نہ ہوگی کیونکہ شریعت اسلامیہ میں جو ایسے محرمات ہیں کہ کبھی ان کی حرمت ساقط ہی نہیں ہوتی جیساکہ کفر کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اگر کسی کام کے کرنے پر ان اشیاء کے حلال سمجھے جانے کی قسم کھائی تو وہ شرعاً قسم اعتبار کی جائے گی اور جو محرمات شریعہ ایسے ہیں کہ بعض اوقات ان کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے جیساکہ شراب و خنزیر کہ مخمصہ (مجبوری) کی حالت میں جان بچانے کے لیے اس کی اجازت ہے۔ اگر کسی کام کے کرنے پر ان اشیاء کے حلال سمجھنے کی قسم کھا

تو یہ شرعاً قسم ہی نہیں۔

والحاصل ان کل شئ ھو حرام حرمته موبدة بحيث لا تسقط حرمة بحال من الاحوال كالكفر واشباه ذالك فاستحلاله معلقا بالشرط يكون يمينا وكل ھو حرام بحيث تسقط حرمته بحال كالميتة والخمر واشباه ذالك فاستحلاله معلقا بالشرط لا يكون يمينا كذا فى المحيط۔

اور بحر الرائق میں ہے:

ھو يستحل الدم او لحم الخنزير ان فعل كذا لا يكون يمينا لان استحلال ذالك لا يكون كفرا لا محالة فانه حالة الضرورة تصير حلالا۔

اگر اس نے یہ کام کیا تو اس کے لیے خون (دم مسفوح) اور خنزیر کا گوشت حلال ہے تو یمین اور قسم نہ ہوگی کیونکہ اس کا حلال سمجھنا کفر نہیں ہے کیونکہ یہ مجبوری کے وقت حلال ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ صورت مستفسرہ میں قسم منعقد ہی نہیں ہوئی لہذا محمد اسلم اپنی بیوی کے ہاتھ کی روٹی کھا سکتا ہے اور کفارہ بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے متعدد کام نہ کرنے کی قسم کھائی اور پھر ان کاموں کو کیا۔ کیا کفارہ ایک ادا کرنا پڑے گا یا متعدد کفارے دینے پڑیں گے۔

سائل محمد شریف

چک نمبر ۴۰ ضلع سرگودھا۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں ایک ہی کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ ردالمحتار ج۳ ص۷۵ کتاب الایمان میں ہے:

وفی البغیۃ کفارات الایمان اذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارۃ الواحدۃ عن عہدۃ الجمیع وقال شہاب الایمۃ ھذا قول محمد قال صاحب الاصل ھو المختار عندی۔

یعنی قسم کے کفارے جب زیادہ جمع ہو جائیں تو ایک کفارہ ہی تمام کی طرف سے کافی ہوتا ہے یہی قول محمد ہے۔ ابو یوسف کا بھی یہی مختار قول ہے۔ لہٰذا صورت مذکورہ میں ایک ہی کفارہ دینا پڑے گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے جھوٹی قسم اٹھائی اور قرآن پاک کو لے کر مسجد میں داخل ہوا اور قسم کھائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے کذب بیانی سے کام لیا ہے اور قسم جھوٹی اٹھائی ہے۔ کیا ایسا آدمی بے ایمان نہیں ہو جاتا اور اس کے متعلق شرعی حکم تحریر کیا جائے۔

قمر الاسلام ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول پسرور (سیالکوٹ)

الجواب بعونہ تعالیٰ

عمداً (جان بوجھ کر) قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ اگر قسم کھانے والا توبہ کرے تو اس سے نجات ہو سکتی ہے۔ درمختار کتاب الایمان ج۳ ص۴۸ میں ہے:

غموس تغمسہ فی الاثم ثم النار وھی کبیرۃ مطلقا لکن اثم الکبائر متفاوت۔

ردالمحتار میں ہے:

فتلزمه التوبة اذ لا كفارة في الغموس يرتفع بها الاثم

فتعينت التوبة للتخلص منه ۔

صورت مسئولہ میں جو قسم مذکور ہوئی اس کو یمین غموس کہتے ہیں یہ گناہ کبیرہ ہے ۔ دوزخ میں دخول کا سبب ہے اس میں کفارہ نہیں ہے اس کے لیے توبہ لازم اور ضروری ہے اور توبہ کے ساتھ ہی گناہ کا ارتفاع ہے بس نجات کے لیے توبہ ہی ہے ۔ ایسی قسم اٹھانے سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا ۔ اہل السنّت والجماعت کے معتقدات سے ہے کہ مسلمان گناہِ کبیرہ سے ایمان سے خارج نہیں ہوتا ۔ شرح عقائدِ نسفی میں ص۱۸۲ میں ہے:

والكبيرة لا تخرج العبد المؤمن من الايمان ولا تدخله في الكفر ۔

بہر صورت ، مذکورہ صورت میں قسم اٹھانے والے پر توبہ بالاخلاص لازم اور ضروری ہے اور کفارہ وغیرہ نہیں ہے اور نہ ہی مسلمان اسلام سے خارج ہوتا ہے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

کتاب الذبائح

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی گیارہویں شریف کے لیے ایک بکرا رکھا ہوا تھا، گیارہویں شریف پر اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا گیا۔ ایک وہابی ملاں کہتا ہے کہ یہ بکرا حرام ہے کیونکہ گیارہویں والے کے نام کا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے کہ جو چیز غیر اللہ کے نام پر مشہور یا نامزد ہو جائے وہ حرام ہے۔ آپ تحریر فرمائیں کہ کیا مذکورہ جانور حلال ہے یا نہیں؟

سائلین دیہہ گھنگور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں وہ بکرا جو سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے نام پر منسوب ہے حلال اور طیب ہے۔ یہ وہابی ملاں خود نجس اور خبیث ہے۔ کوئی جانور جو حلال ہے کسی طرف نسبت کرنے سے ہرگز حرام نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے:

ما جعل اللہ من بحیرۃ و لا سائبۃ و لا وصیلۃ و لا حام و لکن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب و اکثرھم لا یعقلون۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے نہیں مقرر کیا ہے کان چرا ہوا اور نہ بچار اور نہ وصیلہ اور نہ حامی ، ہاں کافر لوگ اللہ پر جھوٹا افتراء باندھتے ہیں اور ان میں اکثر نرے بے عقل ہیں۔

یہ جانور بحیرہ (اونٹنی پانچ مرتبہ بچے جنتی آخر نر بچہ ہوتا اس کا کان چیر دیتے اس کو ذبح نہ کرتے نہ کام لیتے) اور سائبہ (جب سفر سے واپس بخریت آتے تو اونٹنی بطور نذر چھوڑ دیتے کام نہ لیتے) اور وصیلہ (بکری جب سات مرتبہ بچے جنتی اگر ساتواں بچہ نر ہوتا تو اس کو صرف مرد کھاتے اگر بچہ مادہ ہوتا تو اس کو بکریوں میں چھوڑ دیتے۔ اگر نر و مادہ دونوں ہوتے تو کہتے یہ اپنے بھائی سے مل گئی ہے) اور حامی (جب نر اونٹ سے دس مرتبہ گیابھ حاصل ہو جاتے تو اس کو آزاد چھوڑ دیتے کام وغیرہ نہ لیتے) جو کہ ہیں ان کو مشرکین مکہ اپنے غلط نظریہ اور عقیدہ کے مطابق بتوں کی طرف نسبت کرتے اور جب ذبح کرتے تو بتوں کا نام لے کر ذبح کرتے۔ جیساکہ قرآن پاک میں ہے:

وماذبح علی النصب

اور جو ذبح کیا گیا ہے کہ بتوں کے نام پر۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرام نہیں کیا اور نہ ہی کوئی بحیرہ ، سائبہ ، وصیلہ اور حامی بنایا ہے بلکہ کفار نے اللہ کی ذات پر افترا اور بہتان باندھا ہے اور یہ کفار نے اپنے عقائد فاسدہ کے مطابق ان جانوروں کے نام رکھ لیے ہیں اور حرام کر لیے ہیں کسی کو بھی اللہ اور رسول کے علاوہ یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو حرام کرے یا حلال۔ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا ہی حق ہے جس چیز کو چاہیں حلال کریں یا حرام۔ اللہ تعالیٰ نے جانور (بکرے) کو حلال فرمایا ہے۔ اگر وہابی یہ کہے کہ چونکہ اس بکرے کی نسبت غوث اعظم کی طرف ہوئی ہے لہذا حرام ہے یہ بھی کفار مکہ کی طرح اللہ پر بہتان اور افتراء باندھ رہا ہے اور اپنی بے عقلی اور جہالت کا ثبوت پیش کرتا ہے کیونکہ کوئی حلال جانور صرف کسی کی طرف نسبت کرنے کی وجہ سے حرام نہیں ہوتا۔ جب تک ذبح کرتے وقت غیر اللہ

کا نام نہ لیا جائے۔ اگر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا یعنی بتوں وغیرہ کا نام لیا گیا تو وہ جانور حرام ہو جائے گا خواہ کسی کی طرف نسبت ہو یا نہ۔ نسبت کا حلت اور حرمت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ حلت اور حرمت کا مدار وقت ذبح پر ہے۔ اگر وقت ذبح اللہ کا نام لیا گیا تو جانور حلال ہے اگر وقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا تو حرام ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ آیت کریمہ وما اهل به لغير الله کا معنی ای ذبح علی اسم غیرہ تعالیٰ ہے۔ یعنی وہ جانور حرام ہے جو کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہے۔

والاهلال رفع الصوت وكانوا يرفعونه عند الذبح لآلهتهم کہ اهلال کا معنی بلندی آواز ہے۔ جب کفار ذبح کرتے تھے تو ذبح کے وقت اپنے معبودوں کا نام بلند آواز سے لیتے تھے۔

تفسیر صاوی میں ہے کہ جانور اس وقت حرام ہو گا جبکہ وقت ذبح بتوں کا نام لیا جائے اگر ذبح سے پہلے نام لیا جائے تو اس سے حرام نہیں ہوتا۔

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود المتوفی ۷۱۰ھ تفسیر مدارک میں فرماتے ہیں:

ای رفع الصوت به لغير الله وهو قولهم باسم اللات والعزى عند ذبحه۔

یعنی بلند آواز کرنا ساتھ اس کے واسطے غیر اللہ کے اور وہ ذبح کرنے کے وقت ان کا کہنا لات اور عزیٰ کے نام کے ساتھ اور علامہ علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی المتوفی ۷۴۱ھ تفسیر خازن میں لکھتے ہیں:

يعني ما ذكر على ذبحه غير اسم الله وذالك ان العرب في الجاهلية كانوا يذكرون اسماء اصنامهم عند الذبح۔

یعنی اس سے مراد وہ جانور ہے جس پر ذبح کرنے کے وقت اللہ کے غیر کے نام کا ذکر

کیا جائے اور یہ اس لیے کہ عرب زمانہ جاہلیت میں ذبح کرنے کے وقت اپنے بتوں کا نام لیتے تھے۔ امام رازی فرماتے ہیں:

وکانوا یقولون عند الذبح باسم اللّات والعزّی فحرم اللّٰہ تعالیٰ ذالک اھل عرب۔

اہل عرب ذبح کے وقت کہتے تھے باسم اللّات والعزّٰی اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام فرمایا۔

لغت اور اصل میں اہلال کا معنی رفع الصّوت ہے کیونکہ کفار جب اپنے بتوں کے نام پر جانوروں کو ذبح کرتے تھے تو باواز بلند ان کا نام لیتے تھے۔ تمام مفسرین نے عندالذبح کی قید کو ذکر کیا ہے کہ وہ جانور حرام ہوگا کہ جس پر وقت ذبح غیراللہ کا نام ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ذبح کے وقت اللہ ہی کا نام لیا گیا ہے تو وہ جانور حلال ہوگا خواہ اس کو بتوں کی طرف ہی نسبت کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اب بحیرہ اور وصیلہ وغیرہ کو اگر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے تو یہ جانور حلال ہوں گے، ان کا کھانا جائز ہوگا۔ تفسیر فتح البیان میں ہے:

المراد انکار ما حرموا علی انفسھم من السائبۃ والبحیرۃ والوصیلۃ والحام وانھالم تصر حراما بتحریمہ۔

یعنی اس آیت سے ان جانوروں کی حرمت کا انکار کرنا مقصود ہے جن کو کفار حرام سمجھتے تھے۔ سائبہ، وصیلہ، بحیرہ، حامی وغیرہ کہ یہ جانور کفار کے حرام کرلینے کی وجہ سے حرام نہیں ہوگئے بلکہ اگر اللہ کے نام پر ان جانوروں کو (جو کہ کفار مکہ کے نزدیک حرام ہیں) ذبح کیا جائے تو یہ بھی حلال ہوں گے۔ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کرنے سے بکرا حرام نہیں ہوگا۔ ملاجیون صدیقی المتوفی ۱۱۳۰ھ فرماتے ہیں:

ومن ھنا علم ان البقرۃ المنذورۃ للاولیاء کما ھو الرسم فی زماننا طیب حلال لانہ لم یذکر اسم غیراللّٰہ وقت الذبح

اس سے معلوم ہوا کہ جس گائے کی اولیاء اللہ کے لیے نذر مانی گئی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں رواج ہے یہ حلال طیّب ہے کیونکہ اس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام نہیں لیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہے۔

حضرت ملّا احمد جیون صدیقی نے تو صاف طور پہ لکھ دیا ہے کہ اولیاء کے لیے جو گائے بطور نذرانہ پیش کی جاتی ہے وہ حلال اور طیب ہے اور حضرت غوث اعظم اولیاء کے سردار ہیں انکی گیارہویں شریف کے لیے اگر بکرا وغیرہ کسی نے رکھا ہے اور گیارہویں شریف پہ ذبح کر کے سیدنا غوث اعظم کی بارگاہ میں ایصال ثواب کیا ہے تو یہ جائز بلکہ طیب و طاہر ہے اور جس وہابی نے اس کو حرام کہا ہے اس نے کفار مکہّ کی طرح اپنی جہالت اور اندھی تقلید کا ثبوت پیش کیا ہے اور ما اھل بہ لغیر اللہ کا ترجمہ غیر اللہ کے نام پہ نامزد اور مشہور جو کیا گیا وہ صریح غلط اور عربی زبان سے ناواقفی اور تمام مفسرین کے خلاف ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ عند الذبح اگر غیر اللہ کا نام لیا گیا تو وہ حرام ہے کہ اہلال کا معنی رفع الصوت عند الذبح ہے اور نسبت کرنے سے کہ یہ غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا بکرا ہے حرام نہیں ہوتا۔ کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہابی ملّاں کا مرغا ہے اور یہ اس دیوبندی کی بھینس ہے، یہ قربانی کا دنبہ ہے، یہ فلاں کی مسجد ہے، یہ دیابنہ کا مدرسہ ہے اور یہ وہابیہ کا سکول اور یہ نجدیہ کا شہر ہے۔ اگر نسبت سے حرمت ہو تو پھر یہاں بھی حرمت لازمی آئے گی۔ اگر وہابیہ کے نزدیک یہ انتساب جائز ہے تو سیدنا غوث اعظم کی طرف بکرے کی نسبت میں بھی جواز ہوگا اور اہل السنّت والجماعت جب غوث اعظم کا بکرا ذبح کرتے ہیں تو اللہ کے نام پہ اسے ذبح کرتے ہیں۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حلال جانور (بکرا وغیرہ) جب ذبح کیا جائے، اس سے کیا کیا اجزاء ہیں جن کا کھانا حرام ہے، بعض لوگ بکرے کے

خصیتین کھاتے ہیں۔ کیا یہ شرعی طریقہ سے جائز ہیں یا ناجائز۔

محمد جلیل از قلعہ سوبھا سنگھ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

حلال جانور جب ذبح کیا جائے تو اس میں سے سات چیزیں ایسی ہیں جن کا کھانا حرام ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

واما ما یحرم اکلہ من اجزاء الحیوان سبعۃ الدم المسفوح و الذکر والانثیان والقبل والغدۃ والمثانۃ والمرارۃ۔

اور وہ اجزاء حیوان جو جانور سے کھانے حرام ہیں سات ہیں۔ ۱۔ خون بہنے والا (جو ذبح کے وقت جانور سے نکلتا ہے)، ۲۔ ذکر (آلہ تناسل)، ۳۔ خصیتین، ۴۔ فرج، ۵۔ حرام مغز، ۶۔ مثانہ (پیشاب کی تھیلی)، ۷۔ پتہ (صفرا کی تھیلی)، بکرے کے خصیتین چونکہ حرام ہیں لہذا ان کو نہیں کھانا چاہیئے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ غیر مسلم یا عیسائی نے مچھلی کا شکار کیا ہے۔ کیا وہ مچھلی غیر مسلم سے یا عیسائی سے لے کر مسلمان کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب شرعی تحریر کریں۔

محمد حنیف از کوٹلی صدیق ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

غیر مسلم اور عیسائی سے مچھلی خرید کر کے مسلمانوں کو اس کا کھانا جائز ہے۔ فتاویٰ عزیزیہ میں ہے:

مچھلی کا شکار اگر کافر یا مجوسی نے کیا ہے تو اس کا کھانا حلال ہے کیونکہ مچھلی تمام

احکامات میں حکم ذبح نہیں رکھتی تاکہ اس کے ذبح میں کافر کا گمان نہ کیا جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مچھلی کا کھانا حلال اور جائز ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ یہاں ڈنمارک میں پہلے جانور کو بجلی کا جھٹکا لگاتے ہیں، جب وہ بیہوش ہو جاتا ہے پھر اس کو ذبح کرتے ہیں کیا یہ ذبح اسلامی طریقہ پر صحیح ہے یا نہیں۔

محمد اشرف خاں از ڈنمارک ص ب نمبر ۴۰۰۰۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

جانور کو پہلے بے ہوش کرنا پھر ذبح کرنا، اس کی شرعی حیثیت کوئی نہیں ہے بلکہ شریعت اسلامیہ میں ابتدائی اور بنیادی طور پر ذبح کا ہی تعین کیا گیا ہے۔ ذبح میں چار رگیں کاٹی جاتی ہیں۔ ۱۔ حلقوم، ۲۔ مری، ۳، ۴۔ ودجین۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں:

والعروق اللتی تقطع فی الذکاۃ اربعۃ الحلقوم والمری والودجان فان قطعہا حل الاکل۔

وہ رگیں جو ذبح میں کاٹی جاتی ہیں وہ چار ہیں:

۱۔ حلقوم (جس سے سانس آتی جاتی ہے)

۲۔ مری (جس سے کھانا، پانی اترتا ہے)

۳، ۴۔ ودجان (جن میں خون کی روانگی ہوتی ہے)۔

اگر ذبح کرنے والے نے ان کو کاٹ دیا تو ذبح شرعاً صحیح اور جانور کا کھانا جائز اور حلال ہے اور ذبح اللہ کے نام پہ ہو۔ ذبح کے بعد خون کا نکلنا یا جانور میں حرکت پیدا ہونا ضروری ہے کہ اس سے اس کا زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

صورت مسئولہ میں کہ پہلے جانور کو بجلی کا جھٹکا لگا کر بے ہوش کر لیا جاتا ہے ،
اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ اگر وہ جھٹکے کے بعد بھی زندہ ہے تو پھر ذبح کیا جائے
حلال ہے ورنہ نہیں۔ اگر جھٹکا لگنے سے کہ وہ جانور کمزور ہے مر گیا ہے تو پھر ذبح کرنے
سے بھی حلال نہیں ہوگا۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ خون ایسا نکلے جیسے زندہ جانور میں ہوتا ہے کیونکہ دم مسفوح
کے اندر رہ جانے سے جانور حلال نہیں ہوگا۔ اب جھٹکے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اگر
جانور نے منہ کھول دیا ہے یا آنکھیں کھول دی ہیں یا پاؤں پھیلا دیئے ہیں یا بال کھڑے نہ
ہوئے تو جانور مر گیا ہے ذبح کے بعد بھی حرام ہوگا۔ اگر جانور نے منہ بند کر لیا ہے یا آنکھیں
بند کر لیں یا پاؤں سمیٹ لیے یا بال کھڑے ہو گئے تو جانور زندہ ہے۔ ذبح کے بعد اگر خون
نکلا ہے جیسا کہ زندہ جانور سے نکلتا ہے تو پھر جانور کی صحیح شرعی ذبح ہو گئی ہے اور جانور
حلال ہوگا ورنہ نہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری)۔

وَاللہُ وَرَسُولُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اگر عورت جانور کو ذبح کرے تو جائز
ہے یا نہیں؟

کریم بخش از چک نمبر ۶۰/۸ تحصیل ننکانہ ضلع شیخوپورہ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

عورت کو ذبح جائز ہے بشرطیکہ ذبح کا شرعی طریقہ جانتی ہو وہ یہ کہ بسم اللہ اکبر کہنے
سے ذبیحہ حلال ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ ذبح سے مقصود دم مسفوح یعنی حرام خون خارج
کرنا ہے اور گلے کی رگیں بھی اچھی طرح کاٹنا آتا ہو۔ ایسی صورت میں اس کا ذبح کرنا درست
اور جائز ہے۔ ہدایہ کتاب الذبائح صـ۴۱۸ میں ہے:

ویحل اذا کان یعقل التسمیۃ والذبیحۃ ویضبط وان کان صبیا او مجنونا او امرأۃ۔

اگر بچے یا مجنون یا عورت نے ذبح کیا اور وہ تسمیہ (بسم اللہ) اور ذبح کو جانتے ہوں اور جانور کو ضبط بھی رکھ سکیں تو ان کا ذبیحہ جائز ہے۔

واما اذا کان لا یضبط ولا یعقل التسمیۃ والذبیحۃ لا تحل لان التسمیۃ علی الذبیحۃ شرط بالنص وذالک بالقصد وصحۃ القصد بما ذکرنا۔

اور لیکن جب ضبط نہ کر سکے اور نہ ہی تسمیہ کو جانے اور نہ ذبیحہ کو تو جانور حلال نہیں ہوگا کیونکہ ذبح پر تسمیہ پڑھنا نص کے ساتھ شرط ہے اور یہ بالقصد ہوتا ہے اور قصد کی صحت ما ذکرنا میں ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ عورت اگر ذبیحہ کے شرائط سے واقف ہے تو اس کی ذبح جائز ہے۔ فتاوی نظامیہ صد ۱۶۴ میں ہے کہ عورت کی ذبح جائز ہے اگرچہ وہ حالتِ حیض یا نفاس یا جنابت میں ہو۔

امراۃ حائضۃ او نفساء او جنبا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عیسائی جو ہمارے علاقہ میں موجود ہیں یہ اپنے کو اہل کتاب کہتے ہیں۔ کیا ان کے ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں۔ باحوالہ جواب تحریر کیا جائے۔

ایک سائل

تلونڈی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

عیسائی پہلے تو ذبح ہی صحیح نہیں کرتے کیونکہ بعض دفعہ وہ ایک طرف سے چھری مار دیتے ہیں یا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اگر باقاعدہ صحیح ذبح بھی کریں تو پھر بھی ان کا ذبح کیا ہوا جانور مفتی بہ قول کے مطابق حرام ہے۔ درمختار میں ہے:

النصرانی لا ذبیحة له فانما یا کل ذبیحة المسلم او یخنق۔

کہ نصرانی (عیسائی) کے لیے ذبح نہیں ہے وہ یا تو مسلمان کا ذبیحہ کھاتا ہے یا جانور کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور فتح القدیر میں ہے:

الاولیٰ ان لا یأکل ذبیحتھم۔

بہتر یہ ہے کہ ان کا (نصاریٰ) کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔

وفی مبسوط شیخ الاسلام یجب ان لا یأکلوا ذبائح اھل الکتاب ان اعتقدوا ان المسیح الٰہ ولا یتزوجوا نساءھم قیل وعلیه الفتویٰ

اور شیخ الاسلام کی مبسوط میں ہے کہ نصرانی جبکہ مسیح کو خدا جانے تو واجب ہے کہ اس کا ذبح کیا ہوا نہ کھایا جائے اور نہ ایسی عورت سے نکاح کیا جائے کہا گیا کہ اسی پر فتویٰ ہے۔ (فتاوی افریقہ ص۱۰۵)

عیسائی چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو خدا سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا ذبیحہ کھانا حرام اور ناجائز ہے اور یہی قابل عمل اور مفتی بہ قول ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک بچھڑا قربانی کے لیے خریدا گیا جس کا ایک کان سے تھوڑا سا حصہ جو کہ چوتھے حصہ سے بھی کم ہے کٹا ہوا ہے۔ کیا اس کی

قربانی جائز ہے یا نہیں اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بکری یا گائے جس میں مذکر اور مؤنث دونوں کی علامتیں ہوں یعنی خسرا جانور کیا قربانی میں شرعاً جائز ہے یا نہیں۔

المستفتی: مولوی عبدالمجید
ساکن ڈھالہ کالوان تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

۱۔ صورت مسئولہ میں قربانی جائز ہے۔ فقہار کرام فرماتے ہیں: اگر کان تہائی یا اس سے کم کٹا ہوا ہو تو قربانی جائز ہے۔

وعن ابی حنیفۃ ان الثلث اذا ذھب وبقی الثلثان یجوز۔

جب جانور کا کان وغیرہ تہائی کٹ جائے اور دو تہائی باقی ہو تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے۔ لہذا صورت مذکورہ میں چونکہ بچھڑے کا کان چوتھائی سے بھی کم کٹا ہوا ہے اور دیگر کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ اس کی قربانی جائز اور درست ہے۔

۲۔ اور خنثیٰ جانور جس میں نر اور مادہ دونوں کی علامتیں ہوں، قربانی ناجائز ہے۔ یہ بکری اور گائے جو کہ خنثیٰ ہیں ان کی شرعاً قربانی صحیح نہیں ہے۔ (بحوالہ درمختار،
بہار شریعت ص۱۴۱)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلہ کے کہ اگر قربانی کے جانور میں چھ حصے اہل السنت والجماعت کا عقیدہ رکھنے والوں کے اور ایک حصہ غیر مقلد وہابی کا ہو تو سب کی قربانی اس غیر مقلد کی وجہ ضائع ہو گی یا نہیں؟

ایک سائل

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں وہابیہ کے ساتھ قربانی میں شرکت جائز نہیں ہے کیونکہ غیر مقلدین اور وہابیہ کے عقائد باطل اور فاسد ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے ان کی تکفیر کی ہے فرمایا:

من شك فی کفرہ وعذابہ فقد کفر (الملفوظ ص۱۳۴ و فتاویٰ افریقہ ص۱۳۰)

قربانی ایک عظیم عبادت ہے اور موجب قرب الٰہی و رضائے رسول علیہ السلام کے حصول کا ذریعہ اور سنت ابراہیمی کی ادائیگی ہے ایسی اہم عبادت میں باطل عقیدہ والے شخص کا حصہ رکھنا شرعاً ممنوع ہے اور شعائر اسلام کی تعظیم کے بھی منافی ہے لہذا وہابیہ کو قربانی کے حصص میں شامل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جو لوگ اہل السنت والجماعت خالصاً ہو ان کو قربانی کے جانور کے حصہ میں شریک کیا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین در ایں مسئلہ کہ جانور جب ذبح کیا جائے اس کا منہ کس طرف ہونا چاہیئے اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ اگر خسرا آدمی جانور کو ذبح کرے تو کیا یہ ذبح عند الشرع مکروہ ہے یا جائز ؟

عبدالرحیم ہاشمی، قلعہ کالروالا ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

۱۔ جب جانور ذبح کیا جائے تو اس کا منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

اذا ذبحها لغیر توجه القبلة حلت ولکن یکرہ۔

یعنی جب کسی نے جانور کو ذبح کیا اور اس کا منہ قبلہ کی طرف نہ تھا تو جانور ہے لیکن مکروہ ہے اور یہ کراہت بھی تنزیہی ہے۔ بہر صورت جب بھی جانور ذبح کیا جائے تو اس کا منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے۔

۲۔ اگر جانور کو خسرے نے ذبح کیا ہے تو یہ ذبح بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ ذبح کی شرائط وغیرہ جانتا ہو۔ (تمیز الکلام ص ۲۱)

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ طوطا حلال ہے یا حرام۔ بہترین صورت یہ ہے کہ آپ تمام جانوروں کے متعلق جو حلال ہیں یا حرام بیان فرمادیں۔ عین نوازش ہوگی۔

عبدالحمید از سرائے عالمگیر

الجواب بعونہ تعالیٰ

مذہب حنفیہ اور قول مفتی بہ کے مطابق طوطا حلال ہے۔ سراج المنیر میں ہے:

طوطا مرغے است معروف حلال است۔ کہ طوطا جو کہ مشہور پرندہ ہے حلال ہے

مندرجہ ذیل جانور حلال ہیں

اونٹ، بکری بکرا، بھیڑ، بھینس، بارہ سنگھا، خرگوش، دنبہ، سراگائے، گائے، بیل، گورخر، مچھلی، نیل گائے، ہرن، ابابیل، طوطا، بطخ، بگلا، بلبل، بٹیر، تیتر، ٹڈی، چکور، چکاوک، چڑیا، چکوی، شتر مرغ، فاختہ، قمری، کھنڈریچہ، کبوتر، کلنگ، مرغ، مرغی، ممولا، مور، مینا، ہدہد

مذہب حنفیہ میں درج ذیل جانور حرام ہیں:

بھیڑیا، بجو، بلی، بندر، بچھو، تیندوا، چیتا، چوہا جنگلی، چوہا خانگی، ریچھ، سور، سنجاب، ساہی سانپ، شیر، کچھوا، کتا، کیکڑا، گیدڑ، گدھا، گوہ، لومڑی، ناکا، نیولا، ہاتھی، باز، باشہ، بہری، ترمتی، جرہ شکرہ، چیل، الو، چمگادڑ، گدھ اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک گھوڑا مکروہ تحریمی ہے۔ (تمیز الکلام فی بین الحلال و الحرام ص ۱۷)

اور کوا مفتی بہ قول کے مطابق حرام ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ جو شوافع نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کوے کے حلال ہونے کی نسبت کی ہے وہ باطل ہے۔ (فتاویٰ رضویہ صہ ۱۳۵)

یعنی امام اعظم رضی اللہ عنہ کوے کو حلال نہیں سمجھتے بلکہ آپ حرام فرماتے ہیں۔ لہٰذا کوا حرام ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک بچھڑا جس کی عمر دو سال تین ماہ سے زائد ہے اور مالک اس کی تصدیق کرتا ہے اور گواہوں نے شہادت بھی دی ہے۔ کیا اس کی قربانی صحیح ہے یا نہیں؟

ظہور خاں اوچی رسول پور سیداں ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

گائے اور بچھڑے کی عمر قربانی کے لیے دو سال یا زائد ہونا لازمی ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ بچھڑے کی عمر دو سال سے زائد ہے لہٰذا اس کی قربانی جائز ہے۔ فقہا لکھتے ہیں:

والاضحیۃ من الابل والبقر والغنم ویجزی من ذالک کلہ الثنی فصاعدًا۔

اور قربانی اونٹ اور گائے اور بکری سے ہوتی ہے اور ان تمام سے کافی ہوگا یا اس سے زائد اور گائے سے دو سال کا ہوتا ہے۔ رمز الحقائق میں ہے:

ومن البقر سنتین۔

یعنی گائے کی عمر دو سال ضروری ہے اس سے کم نہیں لہٰذا مذکورہ بچھڑا چونکہ دو سال سے بھی زائد ہے لہٰذا اس کی قربانی جائز اور صحیح ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک جانور (چھترا) کو ضرب کاری لگی جس سے وہ زمین پر گر پڑا پھر اس کو ذبح کیا گیا۔ ذبح کرتے وقت خون اس کا کافی حد تک نکلا اور خون بہا لیکن جانور نے حرکت نہ کی۔ کیا ذبح صحیح ہو گیا ہے یا نہیں اور ذبح چھری سے ہو سکتی ہے یا کسی اور تیز آلہ کے ساتھ بھی۔

سائل، عبدالرشید از گھنگور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں اگر واقعی خون نکلا اور خون ایسا تھا جیسا کہ زندہ جانور کا ہوتا ہے تو وہ جانور حلال ہے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے اگر جانور کو ذبح کیا اور خون نکلا مگر اس میں حرکت پیدا نہ ہوئی اگر وہ خون ایسا ہے جیسا کہ زندہ جانور کا ہوتا ہے تو وہ جانور حلال ہے اور ذبح ہر اس چیز سے کر سکتے ہیں جو رگیں کاٹ دے اور خون بہا دے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ چھری سے ہی ہو۔ بہر صورت اگر خون بہہ کر نکلا ہے تو چھترا حلال ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الحظر والاباحۃ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔ آجکل لوگ اپنے پیروں اور بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ وہابی کہتے ہیں کہ یہ شرک اور کفر ہے۔

اللہ دتہ۔ ضلع جھنگ

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

سجدہ دو قسم پر ہے۔ ایک سجدہ عبادۃً جو اللہ تعالیٰ کو معبود حقیقی سمجھتے ہوئے کیا جاتا ہے یہ غیر اللہ کے سامنے شرک ہے۔ دوسرا سجدہ تعظیمی کہ مسجود کی تعظیم کے لیے کیا جائے یہ ہماری شریعت میں منسوخ ہے یہ شرک نہیں یہ غیر اللہ کو ناجائز ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے سجدہ تعظیمی کے عدم جواز پر ایک مستقل رسالہ "الذبدۃ الزکیہ" تحریر فرمایا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سجدہ تعظیمی بھی ناجائز ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا تھا وہ تعظیمی ہی تھا۔ (خزائن العرفان ص۶)

امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی المتوفی ۱۰۳۴ھ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سجدہ میں جو تواضع اور ذلت ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ بعض فقہاء نے اگرچہ بادشاہوں کے لیے تعظیم کا سجدہ جائز قرار دیا ہے لیکن سلاطین عظام کو یہ

سجدہ نہیں کروانا چاہیئے۔ (مکتوبات ص ۱۱۹)

پیران عظام اور بزرگان دین کو مسلمان سجدہ نہیں کرتے۔ یہ وہابیہ اور دیابنہ کا مسلمانوں پر بہتان عظیم ہے اور عوام اور سادہ لوح مسلمانوں کو کافر اور مشرک قرار دیتے ہیں۔ وہابیہ اور دیابنہ شرک کو امور عامہ سے سمجھتے ہیں جس سے کسی مسلمان کو محفوظ نہیں رہنے دیتے۔ سجدہ کیلئے کچھ شرائط آداب ہیں مثلاً کعبہ کی طرف منہ کرنا جس کو سجدہ کیا جا رہا ہے اس کو معبود تصور کرنا اور عبادت کی نیت سے سجدہ کرنا، جسم کا پاک ہونا وغیرہ وغیرہ۔

بزرگان دین اور مرشد برحق کی تعظیم کرنا اور اس کے ہاتھ پاؤں چومنا، بوسہ دینا یہ سجدہ ہرگز نہیں ہے یہ تعظیم ہے جو کہ شرعاً جائز ہے بلکہ سنت نبویہ سے ثابت ہے۔ صفوان[۱] بن عسال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو یہودی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نو آیات (معجزات) جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے گئے تھے دریافت کیے۔ جب وہ جانے لگے تو راوی فرماتے ہیں؛

فقبلا یدیہ ورجلیہ

انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا اور چوما۔

معلوم ہوا کہ ہاتھ چومنے اور پاؤں کو بوسہ دینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ حدیث پاک سے ثابت ہے۔ وہابیہ کا پاؤں کے چومنے کو شرک کہنا غلط اور حدیث کے بھی مخالف ہے۔ بہرکیف بزرگان دین اور اپنے مرشد برحق اور والدین کے ہاتھ پاؤں چومنے جائز ہیں۔ اس میں کسی قسم کا شرک وغیرہ نہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] صفوان بن عسال المرادی صحابی معروف (تقریب التہذیب ص ۱۷۱) امام سیوطی فرماتے ہیں کہ حضرت صفوان بن عسال مرادی خلافت علی رضی اللہ عنہ میں فوت ہوئے ہیں۔ ۱۲

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ودیں مسئلہ کہ ایک پیر کی بیعت چھوڑ کر دوسرے کسی شیخ اور پیر کی بیعت کرسکتا ہے یا نہیں اور جس پیر کی بیعت کی جائے وہ کیسا ہونا چاہیئے۔ تفصیلی طور پر تحریر فرمائیں۔

حافظ محمد اصغر گجراتی۔ حال جرمن

الجواب بعونہ تعالیٰ

جب پہلا پیر اور شیخ طریقت شریعت مطہرہ کے مطابق ہے تو بیعت نہیں توڑنی چاہیئے۔ ہاں اگر پہلے میں کچھ نقصان ہو تو توڑ سکتا ہے۔ عدی بن مسافر رضی اللہ عنہ کے متعلق اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں:

جو کسی سلسلے کا آدمی آئے اس سے بیعت لے لیتا ہوں سوا غلامان قادری کے کہ بحر کو چھوڑ کر نہر کی طرف کوئی نہیں آتا۔ بیعت اس شخص سے کرنا چاہیئے جس میں یہ چار باتیں ہوں ورنہ بیعت جائز نہ ہوگی۔

۱۔ سُنی العقیدہ ہو۔

۲۔ کم از کم اتنا علم رکھتا ہو کہ بلا کسی امداد کے اپنی ضرورت کے مسائل خود کتاب سے نکال سکے۔

۳۔ اس کا سلسلہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو کہیں منقطع نہ ہو۔

۴۔ فاسق معلن نہ ہو۔

اگر شیخ میں یہ شرائط نہیں ہیں تو اس کی بیعت توڑ دینی چاہیئے۔ (ملفوظات اعلیحضرت صفحہ ۲۴)
اگر کسی شخص نے باوجودیکہ اس کا شیخ شریعت مطہرہ کے مطابق اور صحیح العقیدہ اہل السنت والجماعت ہے بیعت توڑ دی ہے اور کسی شخص کا متلاشی ہوا تو کسی جگہ سے بھی وہ مستفیض نہیں ہوگا۔

ومثل ذالك من زل به القدم فی عہد شیخه فنقضه فانه مطرود

عن طریقة ومتٰی طرد عن طریقة فقد سلب ما وهبه الله له

من النور الالٰهی فلا یرجٰی له الفتح فی طریقة اخریٰ لان غایة

الطرق واحدة۔ (تفسیر صاوی ج۲ ص۲۵۳)

یعنی جس شخص کے قدم اپنے شیخ کے عہد میں ڈگمگا گئے اور اس نے شیخ کے ساتھ الفاءِ عہد نہ کیا وہ اس کے طریقہ سے مردود ہے اور جب وہ شیخ کے طریقے سے مردود ہوا تو نورِ الٰہی اس سے ختم ہوا اور اب اُس کے لیے کسی دوسرے طریقہ میں بھی امید انکشاف نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے لیے کوئی راستہ قربِ الٰہی کی طرف کھلنے کی امید ہے کیونکہ تمام طریقوں کی غایت اور غرض تو واحد ہے۔

معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے مرشد برحق کو چھوڑ کر اور دروازوں پہ جاتا ہے اس کو کسی دروازہ سے بھی بھیک نہیں ملتی بلکہ بعض مواقع پر وہ اپنے شیخ طریقت کی بے ادبی کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ایمان کا بھی خطرہ ہے بلکہ جب شیخ متبع شریعت اور صحیح العقیدہ ہے تو اس کے دامن کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اس کے تمام اقوال پہ عمل کرنا لازم اور ضروری ہے جب اعتقاد مستحکم ہوگا تو یقیناً ثمرات اور فوائد حاصل ہوں گے۔

واللہ المعطی واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کیا والدین کی اجازت کے بغیر بیعت جائز ہے یا نہیں؟

محمد صادق از ڈنمارک

الجواب بعونہ تعالیٰ

مرشد برحق اور پیر طریقت کی بیعت کرنا مسنون ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

بیعت صحابہ نے کی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

ان الذین یبایعون اللّٰہ ید اللّٰہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ ومن اوفی بما عٰھد علیہ اللّٰہ فسیؤتیہ اجرًا عظیمًا ٥

اے نبی جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ بیعت کرنے کے بعد جس نے عہد شکنی کی تو اس عہد شکنی کا وبال اس کے نفس پر ہوگا اور جس نے اپنے عہد کو جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا تھا پورا کیا تو اللہ اس کو عنقریب بہت بڑا بدلہ دے گا۔

حدیث پاک میں ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم صحابہ کرام سے کبھی ارکان اسلام پابندی سے ادا کرنے کے لیے بیعت لیتے تھے اور کبھی سنّت پر مضبوطی سے عمل کرنے کی غرض سے بیعت لی جاتی تھی۔

بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریرؓ بن عبداللہ المتوفی ۵۱ھ[1] سے بیعت لی اور بیعت لیتے ہوئے فرمایا تم پر ہر مسلمان کی خیر خواہی لازم ہے اور حضور نے جب انصار سے بیعت لی تو فرمایا وہ خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں اور جہاں بھی حق ہو حق بات کہیں۔ (القول الجمیل صہ۴۵)

بیعت ہجرت اور جہاد کے لیے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم لیتے تھے۔ بہرصورت تقویٰ اور پرہیزگاری پر بھی مضبوطی سے قائم رہنے کے لیے بھی بیعت ہوتی تھی۔ مشایخ کرام کی بیعت بھی اپنے مریدوں سے تقویٰ اور شریعت اسلامیہ کے مطابق عمل اور صحیح العقیدہ ہونے پر ہوتی ہے جو کہ سنّت اور حدیث کے مطابق ہے۔ چونکہ یہ بیعت مسنون اور مستحب ہے لہٰذا اس میں والدین کی اجازت کوئی ضروری نہیں ہے۔ سنّت کی بجاآوری کے لیے

---

[1] تقریب التہذیب صہ۶۶ ۱۲

شرعاً والدین سے اجازت منقول نہیں ہے بلکہ فی زمانہ مرشد برحق کی بیعت ضروری ہے اگر عوام الناس بیعت نہ کریں تو ان کے گمراہ ہونے کا سخت اندیشہ ہے کیونکہ مذاہب باطلہ وہابیہ۔ دیابنہ، قادیانیہ لوگوں کے عقائد خراب کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی شیخ کے ساتھ رابطہ اور تعلق ہو جائے تو عقیدہ اہل السنّت کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ دُور دُور پہنچ کر بلکہ غیر ممالک میں بھی جہاں کوئی ان کو مسلمان ملتا ہے اس کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر صورت میں مرشد برحق کی بیعت کرنی چاہیئے کہ بیعت امر مستحسن اور مسنون اور ضروری ہے اور امر بالمعروف نہی عن المنکر جہاں بھی ہو اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے اور شیخ طریقت بھی معروف کا امر کرتا ہے اور منکرات سے روکتا ہے جس پہ عمل کرنا ضروری ہے۔ صحابہ کرام بیعت کرتے تھے لیکن اجازت والدین ان سے ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا اجازت والدین بیعت کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اگر بلا اجازت کسی نے پیر کی بیعت کر لی ہے تو وہ بیعت صحیح ہوگی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ بوسیدہ اوراق قرآن مجید کہاں دفن کریں۔ اگر قبرستان میں قبر کی طرح گڑھا کھود کر دفن کیا جائے اور اوپر قبر کی شکل بنادی جائے یا مردہ دفن کرکے دہانہ قبر بند کرکے جب مٹی زمین کے برابر ہو جائے پھر بوسیدہ اوراق رکھ کر اوپر کوہان کی شکل بنائی جائے تو کیا یہ امر جائز ہے۔

حافظ غلام محی الدین فاروقی $\frac{1}{25}$ منگلا کالونی

الجواب بعونہ تعالیٰ

قرآن پاک کے جو اوراق مبارک بوسیدہ ہو جائیں اور قابل تلاوت نہ رہیں اور یہ اندیشہ بھی ہو کہ اوراق منتشر ہو کر ضائع ہوں گے تو پھر کسی صاف کپڑے میں لپیٹ کر کسی محفوظ مقام میں

دفن کر دیئے جائیں۔ فتاوٰی ہندیہ میں ہے:

المصحف اذا صار خلقا لا یقرأ منه و یخاف ان یضیع یجعل فی خرقة طاهرة ویدفن و دفنه اولی من وضعه موضعا یخاف ان یقع علیه النجاسة او نحو ذالك ویلحد له لانه لوشق ودفن یحتاج الی اهالته التراب علیه وفی ذالك نوع تحقیر الا اذا جعل فوقه سقف بحیث لا یصل التراب فهو حسن ایضا کذا فی الغرائب۔

یعنی قرآن مجید بوسیدہ ہو گیا اور اس قابل نہ رہا کہ تلاوت کی جائے اور اب یہ اندیشہ کہ اس کے اوراق منتشر ہو کر ضایع ہوں گے تو کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر احتیاط کی جگہ دفن کیے جائیں اور دفن کرنے میں ان کے لیے لحد بنائی جائے تاکہ ان اوراق پر مٹی نہ پڑے یا ان پر تختہ لگا کر چھت بنا کر مٹی ڈالیں تاکہ ان پر مٹی نہ پڑے۔ ہر صورت میں ان کو ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں بے ادبی نہ ہونے پائے اور یہ مد نظر رکھا جائے کہ مٹی براہِ راست اوراق پہ واقع نہ ہو۔ لہذا لحد دکوہان، والی شکل بنائی جائے۔ اگر گڑھا کھودا گیا ہے جیسا کہ سائل نے ذکر کیا ہے تو اوپر تختہ لگا کر ان کو محفوظ کر دیا جائے۔ قرآن کے بوسیدہ اوراق کو جلایا ہرگز نہ جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سینما دیکھنا جس میں تصویریں مردوں اور عورتوں کا اختلاط اور فحش مذاق دکھایا جاتا ہے کیا جائز ہے یا نہیں؟۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبرت آموز واقعات ہوتے ہیں لہٰذا دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ لہذا آپ تحریر فرمائیں کہ سینما کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

محمد شفیع

سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

سینما دیکھنا شرعاً ناجائز و حرام ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

کل لھو حرام۔

یعنی ہر لہو و لعب حرام ہے۔

سینما میں چونکہ ہر طرح کی بے ہودگی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ننگی تصویریں اور مردوں اور عورتوں کا اختلاط شرعاً حرام ہے لہذا سینما کا دیکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ مسلمانوں اور نوجوانوں کے تخریب اعمال کا سینما سبب ہے سینما میں کوئی چیز بھی قابل اصلاح نہیں بلکہ تمام امور شرعاً ممنوع اور خلاف شریعت ہیں لہذا اس کا دیکھنا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔

سوال میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس میں عبرت آموز واقعات ہیں وہ بھی غلط فہمی کج روی ہے۔ عبرت آموز واقعات اور نصیحت آموزی کہاں، عبرت اور نصیحت کے لیے اسلامی تاریخ کی کتب بھری پڑی ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ تو ایک عذر گناہ ہے جو کہ گناہ سے بھی بدتر ہے کہ ایک غلط چیز کو صحیح صورت میں پیش کرنے کی سعی بے سود ہے۔ بہر صورت سینما میں چونکہ ہر طرح کی بیہودگی اور خلاف شریعت کام ہوتے ہیں لہذا کسی صورت میں سینما کا دیکھنا جائز نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ اسقاط حمل جائز ہے یا نہیں۔

بینوا وتوجروا۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جب تک بچے کے اعضاء وغیرہ نہیں بنتے اس وقت تک اور اس سے پہلے حمل کا گرانا جائز ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں:

وفی خزانة الروایات عن السراجیة امرأة عالجت فی اسقاط ولدها

لا تأثم مالم یتبین من خلقه و ذالک لایکون الا بمائة و

عشرین یوماً

خزانة الروایات میں سراجیہ سے منقول ہے کہ اگر کوئی عورت اسقاط حمل کے لیے علاج کرائے تو کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی گناہ ہے بشرطیکہ ابھی تک اس کے اعضاء وغیرہ نہ بنے ہوں اور اعضاء کی تخلیق اور تصویر ایک سو بیس دن کے ساتھ ہوتی ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

افتوا فی زماننا بجوازہ وان کان مستبین الخلقة۔

علمائے زمانہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اسقاط حمل جائز ہے۔ اگرچہ اس کی خلقت ظاہر بھی ہو جائے عبدالحئی نفع المفتی والسائل صہ۱۱ میں لکھتے ہیں:

وقد افتوا فی زماننا بجوازہ

کہ مفتی بہ قول یہی ہے کہ خلقت کے اظہار کے بعد بھی اس کا گرانا جائز ہے اور حواشی ہدایہ میں علامہ الہ داد نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ اگر عورت دوائی استعمال کرے یا نوش کرے تاکہ حمل استقرار ہی نہ پکڑے یہ بھی جائز ہے۔ (بحر الرائق)

بہر صورت حمل کے گرانے میں قبل از اظہار خلقت علمائے محققین سے کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے اور بعد از اظہار خلقت وصورت مفتی بہ قول یہی ہے کہ اسقاط حمل جائز ہے اور بعض علماء اطلاقی طور پر ممانعت کے قائل ہیں چونکہ فساد زمانہ ہے۔ لہٰذا اسقاط حمل جائز ہے بشرطیکہ خلقت کا اظہار نہ ہوا ہو۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مندرجہ ذیل مسائل میں :

۱۔ شادی کے موقع پر دولہا پر روپے نچھاور (چھوٹ) کرنا اور اس کے گلے میں روپوں یا تلہ (زریں) کے ہار ڈالنا جائز ہے یا کہ نہیں ؟

۲۔ لڑکی کی شادی پر برات والوں سے لاگ لینا رسم ورواج ہے یا اسلام سے بھی یہ چیزیں کچھ تعلّق رکھتی ہیں ؟

۳۔ دولہا کو سہرا باندھنا جائز ہے یا کہ نہیں ؟

۴۔ کیا پھول استعمال ہو سکتے ہیں ؟

براہِ کرم یہ مسائل تفصیل سے تحریر فرمائیں۔

قمرالاسلام ٹیچر پسرور اسلامیہ سکول ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

۱۔ دولہا کے سر پر روپے رکھنا اور ان کا اس کے سر پر چھوٹ کرنا اور برات والوں سے لاگ وغیرہ لینا دینا یہ ایک رسم ہے۔ شرعی طور پر کوئی ممانعت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ضروری چیز ہے۔

فتاویٰ رضویہ میں ہے کہ یہ ایک اختراعی رسم ہے اور آپس کے معاملات ہیں جن پر شرع سے منع وارد نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کرتا ہے تو اس پر سختی سے ممانعت نہیں ہے اگر کوئی نہیں کرتا تو اس کی مرضی ہے کیونکہ جن امور کو شریعت نے منع نہیں کیا ان کا درجہ اباحت ہے اگر کوئی کرے تو اس کو منع نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ ہار یا سہرا صرف پھولوں کا ہونا چاہیئے تلہ اور زریں نہیں چاہیئے۔ روپے زریں ہار کے ساتھ مرصع ہوتے ہیں لہٰذا وہ بھی نہ چاہئیں۔ ایسے معاملات میں احتیاط اچھی چیز ہے لیکن تشدد بھی نہ چاہیئے جیسا کہ وہابیہ کرتے ہیں۔ فتاویٰ رضویہ سے

کہ سہرا خالی پھولوں کا ہونا چاہیئے۔

۳۔ جائز ہے لیکن پھولوں کا ہو۔

۴۔ پھول ہی استعمال کرنے چاہئیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔ ۱۲۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ ایک آدمی باوجودیکہ سید نہیں ہے، اپنے آپ کو سید کہلواتا ہے اور اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا ہے کیا اس کا اپنے آپ کو سید کہلوانا جائز ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق تحریر فرمائیں۔

محمد حسین چونڈہ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جو سید حقیقتاً نہ ہو اور اپنے آپ کو سید کہلوائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں مذکور ہے اس کے متعلق شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سخت وعید فرمائی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

من ادعی الی غیر ابیہ۔ (بخاری ومسلم)

جو اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف نسبت کرے اس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

لا یقبل منہ صرف ولا عدل

ایسے شخص کے صرف وعدل بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں۔

صرف سے مراد فرض وشفاعت اور توبہ ہے اور عدل سے مراد نوافل ہیں یعنی جو شخص اپنے کو غیر قوم کی طرف نسبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے فرائض اور نوافل قبول نہیں فرماتے اور اب جو سید نہیں ہے اور اپنے کو سید ظاہر کرتا ہے نہ اس کے فرائض اور نوافل اور عبادت قبول ہے اور شفاعت سے بھی محرومی ہوگی۔ (اللہ الحفیظ)

اتنی سخت وعید کے بعد جرأت اور جسارت نہیں ہونی چاہیئے کہ جو سید نہیں ہے اپنے کو سید کہے اور جو حقیقت میں سید ہے اس کو یہ کہنا کہ تم سید نہیں ہو یہ بھی ناجائز ہے کیونکہ سادات کرام کا احترام اور عزت لازم اور ضروری ہے ۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اپنے آپ کو غیر قوم کی طرف نسبت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ قوم میر عالم (میراثی) کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ قریش اور سادات سے تعلق رکھتے ہیں ، کیا یہ بات صحیح ہے اور حضرت عقیل کی اولاد سے کوئی کربلا معلّی میں بھی شہید ہوئے تھے اور جو اہلِ بیت سے کربلا میں شہید ہوئے تھے ان کی تعداد کتنی تھی ؟

محمد رمضان حیدری ضلع قصور ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

قوم میر عالم اپنے کو حضرت عدنان کی اولاد سے منسوب کرتی ہے جو کہ اکیسویں پشت میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دادا ہیں اور بعض اس سے قریب حضرت عکاشہ بن محصن المتوفی سنہ ۱۲ھ کی طرف نسبت کرتے ہیں لیکن ان کا یہ نسب جو ان کی زبانی سنا گیا ہے نہایت غلط اور مخلوط ہے ۔ سادات کرام اور قریش کے ساتھ نسبی طور پر ان کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے کیونکہ سادات حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی اولاد سے ہیں جو حسنین کی اولاد سے نہیں ہے وہ سید نہیں ہے ۔

حضرت عقیل بن ابی طالب کی وفات حضرت امیر معاویہ کی سلطنت میں ہوئی تھی اور حضرت عقیل بن ابی طالب کے تین صاحبزادے تھے :

۱۔ حضرت مسلم بن عقیل الشہید سنہ ۵۶ھ ۔

۲۔ عبدالرحمٰن الشہید سنہ ۶۰ھ (کربلا میں)

۴۔ حضرت محمد بن عقیل الشہید سنہ ۶۱ھ۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عقیل الشہید سنہ ۶۱ھ اور جعفر بن عقیل الشہید سنہ ۶۱ھ بھی کربلا میں شہید ہوئے۔ حضرت مسلم بن عقیل کے صاحبزادے محمد اور ابراہیم ۵۹ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے۔

ایک دوسری روایت میں حضرت مسلم کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن مسلم سنہ ۶۱ھ کربلا میں شہید ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن کے صاحبزادے عبدالرحمٰن ثانی اور حضرت قاسم سنہ ۶۱ھ کربلا میں شہید ہوئے۔ عبدالرحمٰن اوّل کے صاحبزادے ابو محمد عبداللہ المتوفی سنہ ۱۲۰ھ کی اولاد حضرت قاسم البحری[۱]، علی[۲]، طاہر[۳]، ابراہیم[۴]، عقیل[۵]، محمد بن ابو عبداللہ[۶] مشہور محدث ہیں۔ عقیل کے صاحبزادے حضرت قاسم[۱]، احمد[۲]، عبداللہ[۳]، مسلم[۴] ہیں۔ حضرت قاسم کی اولاد محمد الانصاریہ کہلاتی ہے جو کہ بہت بڑی نسل ہے اور حضرت قاسم البحری کے صاحبزادے عبدالرحمٰن ثالث ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن ثالث کے صاحبزادے محمد المرفوع ہیں ان کی نسل طبرستان میں کثرت سے موجود ہے۔

میر عالم (میراثی)، کا تعلق نسبی حضرت عقیل کی اولاد سے بھی کسی قسم کا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عقیل کی اولاد سید نہیں ہے۔ امام حسین علیہ السّلام کے ساتھ کربلا میں شہید ہونے والے خاندان نبوت کے انیس افراد تھے اور دوسرے جان نثار بہتر افراد تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی طرف میر عالم کا انتساب ہو سکے بلکہ خود میر عالم ہی غلط العوام مشہور ہے جس سے فرقہ میر عالمیہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ نسبی طور پر سادات یا کم از کم قریش کے قریب ہو جائیں۔ سادات کا نسب بالکلیہ محفوظ ہے جن سے میر عالم کا نسبی تعلق کسی قسم کا نہیں ہے۔ ان لوگوں کا اپنے کو سید یا قریش ظاہر کرنا نہایت گناہ اور جرم عظیم ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسے شخص کو قابل نفرت شخصیت اور ملعون فرمایا ہے

جو کہ اپنے نسب کو دوسری طرف منسوب کرتا ہے اور سفلی اقوام کو اپنے کو سید ظاہر کرنا مزید جرم ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ اصحاب کہف کا کتا جنت میں جائیگا یا نہیں ہمارے گاؤں میں ایک مولوی وہابی کہتا ہے کہ اصحاب کہف کا کتا جنت میں نہیں جائیگا۔

المستفتی، چودھری ناظر

الجواب بعونہ تعالیٰ

اصحاب کہف کا کتا جنت میں ضرور جائے گا لیکن گستاخ رسول وہابی جنت میں نہیں جائے گا، تفسیر روح البیان میں ہے؛

روی انہ یدخل الجنۃ مع المومنین علی ماقال مقاتل عشرۃ من الحیوانات تدخل الجنۃ ناقۃ صالح عجل ابراھیم کبش اسماعیل بقر موسیٰ حوت یونس حمار عزیر نملہ سلیمان، ھد ھد بلقیس کلب اصحاب کھف وناقۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فکلھم یصیرون علی صورت الکبش ویدخلون الجنۃ ذکرہ فی مشکوٰۃ الانوار۔

روایت کی گئی ہے کہ اصحاب کہف کا کتا بھی مومنوں کے ساتھ جنت میں داخل ہوگا جیسا کہ مقاتل مفسر نے کہا ہے کہ دس جانور جنت میں جائیں گے؛

۱۔ حضرت صالح کی ناقہ۔ ۲۔ حضرت ابراہیم کا بچھڑا۔
۳۔ حضرت اسماعیل کا دنبہ۔ ۴۔ حضرت موسیٰ کی گائے۔
۵۔ حضرت یونس کی مچھلی۔ ۶۔ عزیر کا گدھا۔
۷۔ حضرت سلیمان کی چیونٹی۔ ۸۔ ہُد ہُد۔

۹۔ اصحاب کہف کا کتا۔ ۱۰۔ حضور علیہ السلام کی ناقہ۔

یہ جانور جب جنت میں داخل ہوں گے تو تمام دنبہ کی شکل میں ہوں گے۔ علامہ عبدالحئی نفع المفتی والسائل ص۱۳۱ میں لکھتے ہیں:

قال مقاتل عشرۃ من الحیوانات تدخل الجنۃ

کہ مقاتل (بن سلیمان البلخی الخراسانی المتوفی ۱۵۰ھ) نے کہا ہے کہ دس حیوان جنت میں جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ اصحاب کہف کا کتا جنت میں جائے گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

بخدمت جناب استاذ العلماء مولانا مفتی غلام رسول صاحب

ہمارے گاؤں میں اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں۔ آپ اس مسئلہ کے متعلق ہمیں لکھیں کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں؟

آپ کا شاگرد۔ مہرالدین۔ ضلع کیمبلپور۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

حضرت حضرت خضر علیہ السلام اس وقت دنیا میں زندہ تشریف فرما ہیں۔ علامہ ابن حجر مکی فتاویٰ حدیثیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس زمین پر زندہ موجود ہیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت ادریس آسمانوں پر زندہ موجود ہیں۔ مولوی عبدالحئی لکھتے ہیں کہ امام عبداللہ بن اسعد یافعی المتوفی ۷۶۸ھ روض الریاحین فی حکایات الصالحین میں فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور اولیاء اللہ کے نزدیک تو یہ قطعی فیصلہ ہے کہ حضرت خضر زندہ ہیں اور فقہاء اور علماء اصول اور محدثین نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے اور حافظ تقی الدین ابوعمرو عثمان بن الصلاح المتوفی ۶۴۳ھ فرماتے ہیں کہ حضرت خضر زندہ ہیں۔ امام نووی شافعی بھی اسی کے قائل ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام بحیات ہیں اور فقہاء کی ایک جماعت

نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام المتوفی ۶۶۰ھ سے حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم کو ابن دقیق العید یہ بتائیں کہ انہوں نے خضر علیہ السلام کو دیکھا ہے۔ کیا تم ان کی بات کی تصدیق کرو گے۔ فقہاء نے کہا کہ ہم ان کی بات کی تصدیق کریں گے تو اس پر شیخ عزالدین نے فرمایا:

خدا کی قسم ستر صدیقوں نے اپنی آنکھوں سے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا ہے جن میں سے ہر ایک ابن دقیق العید سے افضل ہے۔

پھر عبدالحئی لکھتے ہیں کہ ملا علی قاری نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام کشف الخدر عن امر الخضر ہے۔ اس میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

نووی شافعی نے شرح صحیح مسلم میں فرمایا ہے کہ جمہور علماء کا مذہب ہے کہ حضرت خضر عالم کے اندر زندہ موجود ہیں اور اہل معرفت کا تو اس پر اتفاق ہے اور ملا علی قاری نے ابن تیمیہ کا رد کیا ہے جو کہ حیات خضر کا منکر ہے اس کے دلائل کی تردید میں لکھتے ہیں:

ابن تیمیہ حرانی دمشقی المتوفی ۷۲۸ھ کا یہ کہنا کہ حضرت خضر زندہ ہوتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور حضور کے ساتھ مل کر جہاد کرتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سید التابعین اویس قرنی[1] باوجود زندہ ہونے کے حضور علیہ السلام کے پاس حاضر نہیں ہوئے تو حضور علیہ السلام کے پاس نہ آنے سے ان کا نہ ہونا لازم نہیں آتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام حضور کے پاس پوشیدہ طور پر آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

پھر علی قاری لکھتے ہیں کہ آیت قرآنیہ وما جعلنا البشر من قبلک الخلد یعنی

---

[1] سید التابعین حضرت اویس قرنی المتوفی ۳۷ھ ۱۲

ہم نے کسی بشر کے لیے آپ سے پہلے ہمیشہ زندہ رہنا نہیں رکھا۔ ہمارے مدعا کے مخالف نہیں ہے کیونکہ ہم خضر علیہ السّلام کے لیے طویل حیات کے قائل ہیں۔ خلد بمعنی عدم موت کے قائل نہیں ہیں تاکہ مخالفت لازم آئے اور رہی یہ حدیث:

لا یبقیٰ علیٰ رأس مائتہ سنتہ فمن ھو الیوم علیٰ ظھر الارض احد۔

آج جو زمین پر موجود ہے سو سال کے بعد زندہ نہیں رہے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اس حدیث سے خضر علیہ السّلام مستثنیٰ ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السّلام کے فرمان کے وقت حضرت خضر زمین پر نہ ہوں بلکہ زمین و آسمان کی فضا کے درمیان ہوں کیونکہ حضور علیہ السّلام کے فرمان کا تعلق ان سے ہے جو اس وقت زمین پر موجود تھے۔ جیسا کہ الیوم کا لفظ دلالت کرتا ہے رئیس الحنفیہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خضر وفات پا گئے ہیں اُن سے یہ بھی پوچھو کہ کب اور کس زمانہ میں وفات پائی ہے کسی معتبر سند کے ساتھ بتاؤ۔

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی لکھتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السّلام زندہ ہیں اور احیاء العلوم میں حضرت خضر کی ملاقات اور روایت کے لیے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السّلام نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے تعلیم حاصل کی ہے اور حضور علیہ السّلام سے روایت بھی کرتے ہیں اور جب حضور علیہ السّلام دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت خضر صحابہ کرام کے پاس تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ جب خضر واپس گئے تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

ھذا الخضر علیہ السلام (یہ خضر علیہ السّلام تھے)

لہ یہ جواب اس وقت ہے جبکہ حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے ورنہ علامہ عبد العلی بحر العلوم میں فرماتے ہیں یہ حدیث موضوع ہے۔ (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت جلد ۲ ص ۱۵۴ و کتاب الجرح علی البخاری ص ۸ ۱۲

اور آخر میں لکھتے ہیں کہ اب تک زندہ ہونے پر تمام اہل باطن وصلحاء کا اتفاق ہے۔

(فتاویٰ اشرفیہ ج صـ)

آپ کی زندگی کا انکار صرف ابن تیمیہ اور اس کے متبعین نے کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کے متعلق علامہ شیخ احمد صاوی مالکی المتوفی ۱۲۴۱ھ لکھتے ہیں؛

قال العلماء انه الضال المضل۔

کہ ابن تیمیہ خود بھی گمراہ ہے اور لوگوں کو گمراہ کرنے والا ہے۔ (تفسیر صاوی ج صـ۸۸)

اور جو گمراہ ہو اور لوگوں کو بھی گمراہ کرنے والا ہو اس کے قول کا کیا اعتبار ہے۔ لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اس وقت دنیا میں بقید حیات تشریف فرما ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں۔ اگر زندہ ہیں تو پھر حضرت خضر علیہ السلام کے لیے چاہیئے تھا کہ وہ حضور علیہ السلام پر ایمان لاتے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے عالم میثاق میں وعدہ لیا تھا کہ ثم جاءکم رسول مصدق لما [redacted] لتومنن بہ ولتنصرنہ۔ کہ جب تمہارے پاس رسول (محمد) صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اپکی نصرت اور مدد کرو۔ حالانکہ یہ ثابت نہیں ہوا کہ حضرت خضر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہوں اور آپ پر ایمان لائے ہوں اور بخاری شریف میں یہ صحیح حدیث ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری زندگی میں کہ سو برس میں روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اگر خضر نے قیامت تک زندہ ہی رہنا ہوتا تو حضور علیہ السلام کیوں فرماتے کہ سو برس میں کوئی باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا معہ حوالہ جات کتب اس مسئلہ کی صحیح تحقیق فرما کر جواب تحریر کریں۔

ایک سائل کیمل پور۔

الجواب

حضرت خضر علیہ السّلام زندہ ہیں اور یہی جمہور اور تمام صوفیاء کرام کا بالاتفاق مسلک ہے علاّمہ اسماعیل حنفی فرماتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السّلام کا وجود ثابت بالیقین ہے اور عدم کے لیے دلیل ضروری ہے اور آپ کے عدم اور موت پر کوئی دلیل نہیں۔

ولا دلیل علی موته ولا نص فیه من کتاب ولا سنة ولا اجماع ولا نقل انه ، مات بارض کذا فی وقت کذا فی زمن ملک من الملوک

کہ آپ کی موت پر نہ کوئی دلیل ہے اور نہ ہی کوئی کتاب سنت اجماع سے اس میں نص اور صراحت وارد ہے اور نہ یہ منقول ہوا ہے کہ حضرت خضر فلاں زمین اور فلاں بادشاہ کے زمانہ میں فوت ہوئے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ زندہ ہیں۔

علاّمہ بغوی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام سے چار نبی زندہ ہیں۔ دو زمین میں وہ حضرت خضر اور حضرت الیاس ہیں اور دو آسمان میں ہیں یعنی ادریس اور حضرت عیسٰی علیہم السّلام۔ اور سائل کا یہ کہنا کہ حضرت خضر اگر زندہ ہوتے حضور علیہ السّلام سے ملاقات کرتے۔ حضرت خضر نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ملاقات کی ہے۔ علاّمہ جلال الدّین سیوطی الشافعی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ نے خصائص کبریٰ میں حضرت خضر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ملاقات پر نص کی ہے۔ فرماتے ہیں:

باب اجتماعه صلی اللہ علیه وسلّم بالخضر وعیسٰی علیهما السلام۔

کہ یہ باب اس بیان میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت خضر اور حضرت عیسٰی علیہما السّلام نے آپس میں ملاقات کی ہے۔

علاّمہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ ابن عدی اور بیہقی نے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف عن ابیہ عن جدہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم مسجد میں تھے، حضور علیہ السّلام نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ دُعا مانگ رہا ہے۔ حضور علیہ السّلام نے حضرت

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کے پاس بھیجا حضرت انس گئے، واپس آئے اور عرض کی وہ آدمی یا رسول اللہ آپ کی عظمت اور آپ کی امت کی فضیلت بیان کر رہا ہے۔

فذهب ينظر اليه فاذا هو الخضر

حضور علیہ السلام ان کے دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ خضر علیہ السلام ہیں (خصائص کبریٰ ج۲ ص۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہیں اور آپ کی تعریف اور توصیف اور تصدیق بھی کی ہے۔

قال الهروی ان الخضر قد جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم مراراً

(تفسیر روح البیان ص۴۹۸)

علامہ ہروی نے کہا کہ حضرت خضر متعدد مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور حضرت خضر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا بھی شرف حاصل ہے اور خضر حضور علیہ السلام سے احادیث بھی روایت کرتے ہیں۔

حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب اخیر زمانہ میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا تو حضرت خضر اصحاب کہف کے ساتھ مل کر حضرت مہدی علیہ السلام کے لشکر میں شامل ہوں گے اور افضل شہداء سے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت خضر اور الیاس علیہ السلام دونوں حج کے موسم میں ملاقات کرتے ہیں اور امام احمد سے روایت ہے کہ یہ دونوں حضرات بیت المقدس میں ماہ رمضان میں روزے رکھتے ہیں۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت خضر کا مقام بیت المقدس باب الرحمت ہے۔

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ جو بعض علماء نے کہا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اگر زندہ ہوں تو حدیث لا نبی بعدی کے ساتھ تعارض ہوگا۔ علامہ اسماعیل فرماتے ہیں

یہ بات غیر معتبر ہے کیونکہ خضر علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبی ہیں ۔ آپ نے حضور کے بعد نبوت کا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور سائل کا حدیث بخاری کا ذکر کرنا اور پھر کہنا یہ حدیث صحیح ہے ۔

ہم نے اس حدیث کا جواب ایک پہلے فتویٰ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اگر صحیح ہو تو مؤول ہے لیکن محققین علماء نے تو اس کو موضوع کہا ہے ۔ امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے :

قال صلی لنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء فی آخر حیاتہ فلما سلم

قام فقال ارأیتکم لیلتکم ھذہ فان رأس مائۃ سنۃ منھا

لا یبقی ممن ھو علی ظھر الارض احد ۔ (باب السمر فی العلم بخاری ص ۳۲)

یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آخری ظاہری حیات میں کہ سو برس میں روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہے گا ۔ یہ حدیث بالدرایۃ موضوع ہے کہ واقع اور نفس الامر کے مخالف ہے کیونکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ۔ سو برس میں روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہے گا حالانکہ مکمل چودہ سو سال گذر چکے ہیں اور زمین پر آگے سے بھی زیادہ آبادی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں ہو سکتی ۔ آپ سید الصادقین ہیں لہٰذا یہی کہا جائے گا یہ حدیث جو امام بخاری نے پیش کی ہے موضوع ہے ۔ دیکھئے مولانا عبدالعلی بحر العلوم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے ۔

(فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ص ۱۴۲ ، کتاب الجرح ص)

علامہ اسماعیل حقی اسی حدیث کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث مذکور سو سال کے بعد بھی حضرت معمری کرب اور ابوطفیل صحابی زندہ رہے ۔ یعنی سو سال گذرنے کے بعد یہ زندہ رہے ہیں ۔ اس سے یہی ثابت ہوا کہ امام بخاری کی یہ پیش کردہ حدیث موضوع ہے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ صلعم یا صرف ص یا صحابہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہم کی بجائے رض لکھنا، کیا جائز ہے یا ناجائز جواب میں کتابوں کے حوالہ جات بھی درج کیے جائیں۔

محمد ذاکر حیدری ، جھنگوی

الجواب بعونہ تعالیٰ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کے ساتھ پورا صلی اللہ علیہ وسلم یا علیہ الصلوٰۃ و السلام لکھنا چاہیئے۔ اسی طرح صحابہ کرام کے ساتھ بھی پورا رضی اللہ عنہ یا عنہم لکھنا چاہیئے کیونکہ درود پاک میں تخفیف کرنی سخت ناجائز ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلا وہ شخص جس نے درود شریف میں اختصار کیا اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔

علامہ طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من کتب علیہ السلام بالھمزۃ والمیم یکفر لانہ تخفیف و تخفیف الانبیاء کفر۔

یعنی کسی نبی کے نام پاک کے ساتھ درود یا سلام کا ایسا اختصار لکھنے والا کافر ہو جاتا ہے کہ یہ ہلکا کرنا ہوا اور معاملہ شان انبیاء سے متعلق ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان کا ہلکا کرنا ضرور کفر ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ القلم احدی اللسانین۔ قلم بھی ایک زبان ہے۔ صلی اللہ تعالیٰ کی جگہ مہمل بے معنی صلعم لکھنا ایسا ہے کہ نام اقدس کے ساتھ درود شریف کے بدلے یوں ہی کچھ الم غلم بکنا، اللہ عزوجل فرماتا ہے:

فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم فانزلنا علیھم رجزاً

من السماء بما کانوا یفسقون۔

جس بات کا حکم ہوا تھا ظالموں نے اسے بدل کر اور کچھ کر لیا تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا۔ بدلہ ان کے فسق کا وہاں بنی اسرائیل کو فرمایا گیا تھا قولوا حطۃ یوں کہو کہ ہمارے گناہ اترے۔ انہوں نے کہا حنطۃ ہمیں گیہوں ملے۔ یہ لفظ بامعنی تو تھا اور اب بھی ایک نعمت الٰہی کا ذکر تھا۔ یہاں حکم یہ ہوا ہے:

یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

اے ایمان والو اپنے نبی پر درود و سلام بھیجو۔

اللّٰھم صلّ وسلم وبارک علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ ابداً۔

اور یہ حکم وجوباً خواہ استحباباً ہر بار نام اقدس سننے یا زبان سے لینے یا قلم سے لکھنے پر ہے۔ تحریر میں اس کی بجا آوری نام اقدس کے ساتھ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لکھنے میں تھی اسے بدل کر صلعم، ص، م، ع م کر لیا جو کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ کیا اس پر نزول عذاب کا خوف نہیں کرتے۔ والعیاذ باللہ رب العالمین۔

یہ تو محل درود ہے جس کی عظمت اس حد پر ہے کہ اس کی تخفیف میں پہلوے کفر موجود ہے۔ اس سے اتر کر صحابہ و اولیاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسماء طیبہ کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ رضؓ لکھنے کو علماء کرام نے مکروہ و باعث محرومی بتایا۔ سید علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

یکرہ الرمز بالترضی بالکتابۃ بل یکتب ذالک کلہ بکمالہ۔

یعنی لکھنے میں رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اختصار لکھنا مکروہ ہے۔ بلکہ تمام و کمال لکھے۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

ومن اغفل ھذا حرم خیرا عظیما۔

جو اس سے غافل ہوا خیر عظیم سے محروم رہا اور بڑا فضل اس سے فوت ہوا۔

والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

یوں ہی قدس سرہٗ یا رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ ق یا رح لکھنا حماقت وحرمان برکت ہے۔ ایسی باتوں سے احتراز چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ توفیق خیر عطا فرماوے۔ آمین۔

(فتاویٰ افریقہ ص)

معلوم ہوا کہ الفاظ صلوٰۃ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور الفاظ ترضی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یا ترحم (رحمۃ اللہ علیہ) میں اختصار کرنا ناجائز ہے اس لیے ان کو پورا اور مکمل طور پر لکھا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل کے بارے میں:

۱۔ فوٹو کے بارے میں حدیث پاک میں کیا آیا ہے اور شرع شریف میں کیا گنجائش ہے؟

۲۔ داڑھی کی حد شرع کیا ہے، داڑھی منڈانے یا کترانے والے یعنی حد شرعی سے کم رکھنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

۳۔ سیاہ خضاب استعمال کرنے کا احادیث میں کیا حکم ہے اور فقہ کیا گنجائش نکالتی ہے؟

۴۔ شلوار، تہبند، پتلون وغیرہ ٹخنوں سے اوپر رہنے کا حکم ہے یا دوران نماز۔؟

المستفتی محمد بشیر لندن۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

۱۔ تصویر اور فوٹو (ذی روح) کا شرعاً بلاضرورت کھنچوانا اور بنانا حرام ہے حدیث پاک میں ہے:

اشد الناس عذابا یوم القیامۃ المصورون۔

کہ تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن شدید عذاب ہوگا۔

وذکر النووی الاجماع علیٰ تحریم تصویر صورۃ الحیوان۔

امام نووی شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جاندار کی تصویر کی حرمت پر تمام کا اتفاق ہے

فوٹو اور تصویر بلا ضرورت کھینچوانا اور بنانا شرعاً حرام ہے۔ البتہ سخت ضرورت کے لیے مثلاً حج، پاسپورٹ یا شناختی کارڈ کے لیے جائز ہے کیونکہ فقہی ضابطہ ہے کہ الضرورات تبیح المحضورات کہ ضرورت ممنوع کو مباح کر دیتی ہے۔ لہذا فوٹو بوقت ضرورت مذکورہ جائز ورنہ ناجائز اور حرام ہے۔

۲۔ داڑھی کی شرعی حد ایک قبضہ (ایک مشت) ہے۔

تطویل اللحیۃ اذا کانت بقدر المسنون وھو القبضۃ۔

یعنی داڑھی مقدار سنت ایک قبضہ ہے۔ (در مختار ص ۱۳۴)

جو داڑھی منڈوائے یا کتروائے وہ فاسق اور گنہگار ہے۔ ایسے کو امام بنانا گناہ اور نماز ایسے امام کے پیچھے مکروہِ تحریمی ہے۔

۳۔ سیاہ خضاب حرام ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

غیروا ھذا الشیب ولا تغیروا بالسواد۔

یعنی بالوں کو سیاہ نہ کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اولاً سیاہ خضاب فرعون نے لگایا ہے:

اول من اختضب بالسواد فرعون۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں کہ سیاہ خضاب لگانا حرام ہے البتہ مجاہدین کے لیے جائز ہے۔ فوجی قانون، عام قانون سے جدا ہوتا ہے۔ جو مجاہدین اور فوجی ہیں ان کے لیے سیاہ خضاب جائز ہے دوسروں کے لیے ناجائز ہے۔ (الملفوظ ص ۹۷)

۴۔ مذکورہ ملبوسات ٹخنوں سے نیچے نہیں چاہئیں بلکہ ٹخنوں سے اوپر ہونے لازمی اور ضروری ہیں۔ حدیث پاک میں جو اسبال سے منع کیا ہے اس سے یہی مراد ہے کہ تہبند وغیرہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہوں، نماز کی خصوصیت نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسلہ کہ مونچھیں اتنی لمبی رکھنی کہ منہ میں آجائیں، جائز ہیں یا نہیں ؟

ایک سائل ۔ سیالکوٹ شہر ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

اس طرح مونچھیں رکھنی ناجائز ہیں کیونکہ یہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کا شیوہ ہے ۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں کہ مونچھیں اتنی بڑھانا کہ منہ میں آئیں حرام و گناہ و سنت مشرکین و مجوس و یہود و نصاریٰ ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کی حدیث صحیح میں فرماتے ہیں:

احفوا الشوارب واعفوا اللحی ولا تشبہوا بالیہود ۔ (رواہ الامام الطحاوی عن انس بن مالک)

ولفظ مسلم عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جزوا الشوارب وارخوا اللحی وخالفوا المجوس ۔

یعنی مونچھیں کتر کر خوب پست کرو اور داڑھیاں بڑھاؤ ۔ یہودیوں اور مجوسیوں کی صورت نہ بنو ۔ (فتاویٰ افریقہ صـ۲۶)

معلوم ہوا کہ طویل مونچھیں رکھنی جو منہ میں واقع ہوں حرام اور ناجائز ہیں ۔ ایسی مونچھیں ہرگز نہ رکھی جائیں ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

بخدمت جناب مفتی صاحب علی پور شریف

سلام مسنون!

معروض آنکہ پیران عظام جو تعویذ وغیرہ بناکر لوگوں کو دیتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہیں یا نہیں؟ جواب با حوالہ جات تحریر فرماکر شکریہ کا موقع دیں۔

حافظ عبدالمجید، شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

جائز تعویذ جس میں قرآن پاک یا حدیث پاک کے الفاظ یا اسماء الٰہیہ یا بزرگان دین کے اسماء گرامی ہوں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسے تعویذ مستحب ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ مسلم شریف کی شرح میں فرماتے ہیں:

اما الرقی بآیات القرآن وبالاذکار المعروفۃ فلا نھی فیہ بل سنۃ ونقلوا الاجماع علی جواز الرقی بالقرآن واذکار اللہ تعالیٰ۔

یعنی آیات قرآنیہ اور مشہور اذکار کے ساتھ تعویذ بنانا اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ سنت ہے اور علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ آیات وذکر الٰہی سے رقیہ (دم، تعویذ) جائز ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فتاویٰ افریقہ میں لکھتے ہیں کہ مواہب شریف میں ہے کہ امام ابو بکر احمد بن علی بن سعید ثقہ حافظ الحدیث فرماتے ہیں کہ مجھے بخار آیا، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی آپ نے یہ تعویذ مجھے لکھ کر بھیجا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بسم اللہ وباللہ ومحمد رسول اللہ یانار کونی بردًا وسلامًا علی ابراھیم۔

یعنی اللہ کے نام سے اور اللہ کی برکت سے اور محمد رسول اللہ کی برکت سے

اے آگ ٹھنڈی ہو جا۔

حافظ ابن عبدالبر نے افضل التابعین سیدنا سعید بن المسیب رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ فرمایا مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ جو شام کے وقت کہے سلام علیٰ نوحٍ فی العالمین اسے بچھو نہ کاٹے گا۔ رد المختار میں ہے:

لا بأس بالمعاذات اذا کتب فیہا القرآن او اسماء اللہ۔

تعویزوں میں حرج نہیں جبکہ ان میں قرآن مجید یا اسماء الٰہیہ لکھے جائیں۔

وعلی الجواز عمل الناس الیوم وبہ وردت الآثار۔

اب تمام علماء کا عمل تعویزوں کے جواز پر ہے اور اس میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا:

سنا میں نے حضرت والد سے، فرماتے تھے کہ اصحاب کہف کے نام امان ہیں ڈوبنے اور جلنے اور غارت گری اور چوری سے۔ (فتاویٰ افریقہ صہ ۸۲)

معلوم ہوا کہ تعویذ بنانا اور لکھنا اور لوگوں کو دینا جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔

(واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ جو آدمی ماہ رمضان میں روزے نہیں رکھے گا اس کو جرمانہ کیا جائے گا۔ اب ایک آدمی نے روزہ نہ رکھا اور اس سے جرمانہ کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ میں جرمانہ نہیں دوں گا کیونکہ شریعت جرمانے نہیں کرتی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شرع میں جرمانہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔

سائلین

حلقہ کھیوڑہ ضلع جہلم

الجواب بعونہ تعالیٰ

ماہ رمضان کے روزے اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہیں اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ ماہ رمضان کے روزے رکھے اور ماہِ رمضان کا احترام بھی کرے لیکن مالی جرمانہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

فتاوی رضویہ صـ ۱۹۴ میں ہے:

لانہ شئ کان ونسخ کما بینہ الامام ابوجعفر الطحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

کہ امام ابوجعفر طحاوی فرماتے ہیں کہ جرمانہ منسوخ ہو چکا ہے اور منسوخ قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ لہذا کسی کو جرمانہ مالی کرنا جائز نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ تصور شیخ جائز ہے یا نہیں، بعض لوگ منع کرتے ہیں۔

ایک سائل از جہلم

الجواب

تصور شیخ کامل جائز ہے جو لوگ منع کرتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ممانعت پر دلیل پیش کریں۔ تصور کا معنی ہوتا ہے کہ کوئی چیز ذہن میں حاصل ہو جس کی پہچان سے دوسری چیز کا علم حاصل ہو جائے اور صوفیاء کرام تصور شیخ اس لیے کرتے ہیں کہ طالب باری تعالیٰ اس تصور شیخ کے ذریعہ افعال قبیحہ اور شیطان کے مکر و فریب اور وسوسوں سے ہر وقت بچتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں تفکر (تصور) اور غور کرو۔

مولوی عبدالحئی لکھتے ہیں کہ جب مرشد اس کے پاس نہ ہو تو اس کی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان خیال کرتا رہے۔ بطریق محبت اور تعظیم کے تو اس کی خیالی صورت وہ فائدہ دے گی جو اس کی صحبت فائدہ دیتی ہے۔ (فتاوٰی عبدالحئی ج ۳ ص ۱۳۲)

ثابت ہوا کہ تصورِ شیخ جائز ہے اور اس میں کسی قسم کی ممانعت نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مروجہ قوالی جس میں سرنگی، باجے، طبلے وغیرہ بجائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ، اور پیغمبر اسلام حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ کی مدح اور ثنا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قوالی بالکل جائز ہے اور اس کے ثبوت میں کئی حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ بعض مولوی صاحبان بھی ان سے متفق ہیں ان کی اتباع کیسی ہے۔

حاجی محمد یوسف نقشبندی جماعتی
جھنڈو ساہی ڈاک خانہ خاص
تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ $\frac{۴}{۷۸}$ ۲

الجواب بعونہ تعالیٰ

ایسی قوالی جس میں سرنگیاں، باجے، طبلے اور مزامیر ہوں ناجائز اور حرام ہے۔

بخاری شریف میں ہے:

لتکونن من امتی قوم یستحلون الحریر والخمر والمعازف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امت میں ضرور ایسے لوگ ہوں گے جو کہ ریشم اور شراب اور آلات لہو (باجہ، طنبور، طبلہ، سارنگی وغیرہ) کو حلال سمجھیں گے۔

ترمذی شریف میں ہے:

تکون فی امتی خسف و مسخ اذا ظہرت القینات والمعازف۔

میری امت میں بعض لوگ زمین میں غرق ہوں گے اور ان کی شکلیں بھی مسخ ہوں گی۔ یہ عذاب تب ہوں گے جب گانے والی عورتیں اور آلات لہو (باجے وغیرہ) ظاہر ہوں گے۔

اور مبسوط میں ہے:

استماع الملاھی والتغنی کلھا حرام۔

آلات لہو (باجے وغیرہ) اور گانا سننا سب حرام ہے۔ اور محیط میں ہے:

التغنی والتصفیق بھا واستماعھا کلھا حرام۔

گانا سننا اور تالی بجانا اور ان چیزوں کا سننا سب حرام ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں "ایسی قوالی حرام ہے، حاضرین سب گنہگار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر بغیر اس کے کہ عرس کرنے والے کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر سے گناہ میں کچھ تخفیف اور کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ میں کچھ تخفیف نہیں ہوتی بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور سب حاضرین کے برابر جدا اور عرس کرنے والے پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ۔

وجہ یہ کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا۔ ان کے لیے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انہیں سنایا، اگر وہ سامان نہ کرتا، یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے۔ اس لیے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا۔ پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا وہ نہ کرتا، نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے۔ لہٰذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔" (احکام شریعت ص۶)

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ ہی فرماتے ہیں: "باجوں کی حرمت میں

احادیث کثیرہ وارد ہیں۔ ازاں جملہ اجل و اعلیٰ حدیث صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لیکونن فی امتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمر والمعازف۔

ضرور میری امت میں وہ لوگ ہونے والے ہیں جو حلال ٹھہرائیں گے عورتوں کی شرمگاہ یعنی زنا اور ریشمی کپڑوں، شراب اور باجوں کو۔

بعض جہال بدمست یا نیم ملاں شہوت پرست یا جھوٹے صوفی باد بدست کہ احادیث صحاح مرفوعہ محکمہ کے مقابل بعض ضعیف قصے یا محتمل واقعے یا متشابہ پیش کرتے ہیں ما انہیں اتنی عقل نہیں یا قصداً بے عقل بنتے ہیں کہ صحیح کے سامنے ضعیف، متعین کے آگے محتمل، محکم کے حضور متشابہ واجب الترک ہے۔ پھر کہاں قول کہاں حکایت فعل۔ پھر کجا محرم، کجا مبیح، ہر طرح یہی واجب العمل اسی کو ترجیح مگر ہوس پرستی کا علاج کس کے پاس ہے۔ کاش گناہ کرتے اور گناہ جانتے، اقرار لاتے، یہ ڈھٹائی اور بھی سخت ہے کہ ہوس بھی پالیں اور الزام بھی ٹالیں، اپنے لیے حرام کو حلال بنا لیں پھر اسی پر بس نہیں بلکہ معاذ اللہ اس کی تہمت محبوبان خدا اکابر سلسلہ عالیہ چشت قدست اسرارہم کے سر دھرتے ہیں۔ نہ خدا سے خوف نہ بندوں سے شرم کرتے ہیں۔ حالانکہ خود حضور محبوب الٰہی سیدی و مولائی نظام الحق والدین سلطان الاولیاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعنہم وعنا بہم فوائد الفواد شریف میں فرماتے ہیں:

مزامیر حرام است۔

مولانا فخر الدین زرادی خلیفہ حضور سیدنا محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور کے زمانہ مبارکہ میں خود حضور کے حکم احکم سے مسئلہ سماع میں رسالہ "کشف القناع عن اصول السماع" تحریر فرمایا۔ اس میں صاف ارشاد فرمایا کہ:

اما سماع مشایخنا رضی اللہ تعالیٰ عنہم فبری عن ھذہ التھمۃ وھو مجرد صوت القول مع الاشعار المشعرۃ من کمال صنعۃ۔

اللہ تعالیٰ ہمارے مشایخ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا سماع اس مزامیر کے بہتان سے بری ہے وہ صرف قوالی کی آواز ہے۔ ان اشعار کے ساتھ جو کمال صنعتِ الٰہی سے خبر دیتے ہیں۔ للہ انصاف۔

اس امام جلیل خاندان عالی چشت کا یہ ارشاد مقبول ہوگا یا آجکل کے مدعیان خام کار کی تہمت بے بنیاد ظاھرۃ الفساد ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ انتھیٰ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ کی اس نفیس تحقیق سے ثابت ہوا کہ مروجہ قوالی جس میں سرنگیاں، باجے، طبلے، مزامیر وغیرہ ہوں ناجائز اور حرام ہے اور اس کو جائز کہنا جہالت ہے۔ مزامیر کی حرمت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ کسی حدیث میں بھی مزامیر کو حلال اور جائز نہیں کہا گیا۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فتاویٰ افریقہ میں لکھتے ہیں:

سیدی ابو علی رودباری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بغدادی ہیں، مصر میں اقامت فرمائی اور اسی میں سنہ ۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ سید الطائفہ جنید اور حضرت ابو الحسن نوری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اصحاب سے ہیں۔ مشایخ میں ان سے زیادہ علم طریقت کسی کو نہ تھا۔ ان سے سوال ہوا کہ ایک شخص مزامیر سنتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ میرے لیے حلال ہیں۔ اس لیے کہ میں ایسے درجے تک پہنچ گیا ہوں کہ احوال کا اختلاف مجھ پر کچھ اثر نہیں ڈالتا۔ فرمایا:

نعم قد وصل ولکن الیٰ سقر۔

ہاں پہنچا تو ضرور مگر کہاں تک، جہنم (دوزخ) تک۔ (فتاویٰ افریقہ صد ۱۵۳)

تمام مشایخ کرام اور فقہا اور محدثین اور مفسرین نے مزامیر کو حرام لکھا ہے۔ لہٰذا مروجہ قوالی جس میں مزامیر ہوں وہ ناجائز اور حرام ہے اور پھر اعلیحضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ احکام شریعت میں ہی لکھتے ہیں کہ،

حضرت سلطان المشایخ قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز فرماتے تھے کہ چند شرائط

ہوں تو سماع مباح ہوگا، کچھ شرطیں سنانے والے میں، کچھ سننے والے میں، کچھ اس کلام میں جو سنائی جائے، کچھ آلہ سماع میں۔ یعنی سنانے والا کامل مرد ہو، چھوٹا لڑکا نہ ہو عورت نہ ہو، سننے والا یادِ خدا سے غافل نہ ہو اور جو کلام پڑھی جائے فحش اور تمسخرانہ انداز کی نہ ہو اور آلات سماع یعنی جیسے سارنگی اور رباب وغیرہ چاہیئے کہ ان چیزوں میں سے کوئی موجود نہ ہو۔ اس طرح کا سماع حلال ہے انتہٰی۔

سماع میں مزامیر ہرگز نہیں ہونے چاہئیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف ہی کریں بلکہ حبیب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریف کی جائے تو ان شرائط کو ملحوظ رکھا جائے جو حضرت سلطان المشائخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مزامیر وغیرہ نہ ہوں۔ باقی رہا یہ سوال کہ بعض مولوی صاحبان بھی ان سے متفق ہیں۔ ان کی اتباع کیسی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حرام اور گناہ میں کسی کی بھی اتباع جائز نہیں ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

لا طاعة لاحد فی معصیة اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہے۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے روایت کیا ہے۔
(فتاوٰی رضویہ صفحہ ۱۰۴)

بہر صورت مروجہ قوالی (جس میں مزامیر ہوں) ناجائز اور حرام ہے اور مزامیر (باجے، سارنگیاں وغیرہ) کی حرمت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس معاملہ میں مولوی صاحبان کی اتباع بھی ناجائز اور حرام ہے اور جب سماع اور قوالی ہو تو ان شرائط کے مطابق ہونی چاہیئے جو کہ حضرت سلطان المشائخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائے ہیں ورنہ ناجائز ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل سوال میں کہ حضرت شاہ منصور کو حلاّج کیوں کہتے ہیں اور اس کی کیا وجہ ہے؟ بینوا وتوجروا۔

مولوی غلام حسین۔ ٹھٹھر والی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

حضرت شاہ منصور کا نام حسین بن منصور ہے۔ آپ کی کنیت ابوالمغیث ہے۔ آپ سوز و سکر و شوق اور مستی میں اپنی مثال آپ ہیں، آپ کی بیشمار تصانیف ہیں جو کہ فصاحت اور بلاغت کے علاوہ اسرار اور رموز پر مشتمل ہیں۔ آپ بہت بڑے عابد تھے۔ رات اور دن میں چار سو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے اور مشکوک کھانا نہیں کھاتے تھے اور ہر نماز کیلئے غسل فرمایا کرتے۔

آپ کو حلاّج اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک جگہ سے گزرے جہاں روئی اور کپاس پڑی ہوئی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کیا۔ روئی اور بنولے علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ عرب کہتے ہیں حلج القطن اُس نے روئی کو دھن کر بنولے نکالے۔ (منجد ص ۲۷۵)

بدیں مناسبت آپ کو حلاّج کہا گیا ہے۔ آپ کے واقعات میں ہے کہ جب آپ پر حالت سکر اور جذب کا غلبہ ہوا اور مقام فنا فی اللہ تک رسائی ہوئی تو آپ کی زبان سے کلمہ انا الحق صادر ہوا حاکم بغداد کے پاس شکایت کی گئی اس وقت کے علماء اور فقہاء نے قتل کا فتویٰ دیا۔ علی بن عیسیٰ وزیر نے آپ کو جیل میں بھیج دیا۔ آپ جب جیل میں پہنچے تو ایک رات آپ نے انا الحق کا نعرہ مارا۔ جیل خانہ کی دیواریں پھٹ گئیں پھر انا الحق کا نعرہ مارا تو قیدیوں کے پاؤں میں جو زنجیریں اور کڑیاں تھیں وہ ٹوٹ گئیں اور آپ نے قیدیوں کو حکم دیا کہ قید خانہ سے نکل جاؤ۔ قیدیوں نے عرض کی آپ بھی تشریف لے چلیں۔ فرمایا مجھے نہیں جانا، تم چلے جاؤ۔ آپ کی وفات ۳۰۹ھ بمطابق ۲۴ ذی قعدہ کو ہوئی۔ (تاریخ الاولیا ص ۲۷)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مسائلِ متفرقہ

بخدمت جناب مفتی صاحب

السلام علیکم۔ مندرجہ ذیل ذیل مسئلے دریافت طلب ہیں ان کے متعلق تحریر فرمائیں۔

تاج محمد معرفت مصطفیٰ انڈسٹری

کورنگی ہل ایریا کراچی۔

سوال نمبر 1

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟

الجواب

حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی پیدائش کعبہ کے اندر ہوئی ہے۔ موٴرخین لکھتے ہیں کہ آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں کعبہ کا طواف کر رہی تھی کہ اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھے دیکھا اور فرمایا: فاطمہ اللہ تعالیٰ تجھے مولود مسعود عطا فرمانے والا ہے لہٰذا تم کعبہ کے اندر چلی جاؤ، میں کعبہ کے اندر چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت علی عطا فرمائے۔ (شمس التواریخ ج ۲)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کعبہ میں پیدا ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت علی بعد واقعہ عام فیل تیرہویں رجب یوم جمعہ کو کعبہ میں پیدا ہوئے

ھ ولدتہٗ فی حرم المعظم امہ

طابت و طاب ولیدھا والمولد

علی کو آپ کی والدہ نے حرم معظم میں جنا، آپ کی والدہ اور ان کا لڑکا علی اور ان کی جائے ولادت پاک ہیں۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی معتمد علیہ قول ہے

اہل السنت والجماعت کا یہی معتمد علیہ قول ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کعبہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

سوال نمبر ۲

ایک پیش امام مسجد پر یا محمد نہیں لکھنے دیتا اور کہتا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔

الجواب

جو پیش امام یا محمد لکھنے کا انکار کرتا ہے وہ درحقیقت وہابی اور دیوبندی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو حاضر و ناظر نہیں سمجھتا۔ قرآن پاک میں ہے:

ویکون الرسول علیکم شھیدا۔

اور یہ رسول تم پر گواہ ہیں۔ اور فرمایا:

انا ارسلناک شاھدًا۔

بے شک ہم نے تم کو بھیجا حاضر و ناظر۔

ان آیات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو شاہد اور گواہ بنا کر قیامت کے واقعہ کیطرف اشارہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن دیگر انبیاء کی امتیں کہیں گی کہ ہمارے پاس انبیاء تشریف نہیں لائے۔ انبیاء علیہم السلام فرمائیں گے اے اللہ ہم نے تیرے احکام ان تک پہنچا دیئے انبیاء اپنی بات پر امت مصطفیٰ کو بطور گواہ پیش کریں گے۔ امت مصطفیٰ کو کہا جائے گا کہ تم نے انبیاء کا زمانہ نہیں پایا۔ گواہی کیسے دے رہے ہو۔ حضور کی امت کہے گی کہ ہم کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا تھا۔ تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے گواہی لی جائے گی۔ آپ

فرمائیں گے واقعی انبیاء نے تبلیغ فرمائی تھی اور میری امت کی گواہی بھی صحیح ہے۔

معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم گذشتہ انبیاء کی تبلیغ اور آیندہ اپنی امت کے حالات ملاحظہ فرما کر ہی گواہی دے سکتے ہیں اس لیے آپ کی گواہی پر جرح نہیں ہوئی، اور حضور علیہ السّلام کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو ملاحظہ فرما رہے ہیں اور آپ حاضر و ناظر ہیں اور جب آپ حاضر و ناظر ہیں تو آپ کے لیے "یا" حرف خطاب کا استعمال جائز ہے۔ اسی لیے نماز میں حضور علیہ السّلام کو حاضر و ناظر سمجھ کر ایہا النبی عرض کیا جاتا ہے۔

یا محمد لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ مسجدوں میں تبرکاً لکھنا چاہیئے۔ البتہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ندا کی جائے یا پکارا جائے تو ان الفاظ سے جن میں زیادہ ادب ہے مثلاً یا رسول اللہ، یا نبی اللہ، یا حبیب اللہ سے پکارنا چاہیئے کیونکہ بوقت ندا اسماء صفات سے عرض کرنا یا پکارنا زیادہ موزوں ہے۔ قرآن پاک نے پکارنے سے ہرگز نہیں روکا بلکہ فرمایا:

جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو اس کا نام لے کر پکارتے ہو ایسے میرے حبیب پاک کو نہ پکارو۔ کیونکہ یہ آپ کی عزّت و عظمت کے منافی ہے ورنہ احادیث مقدسہ میں کئی مقامات پر لفظ "یا محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھا ہوا ہے۔ لکھنے میں ممانعت ہرگز نہیں ہے یا محمد میں بوقت پکار چونکہ تعظیم مفقود ہے لہذا فرمایا:

لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا۔

رسول کو ایسے مت پکارو جیسا کہ تم باہمی ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ یعنی نام لے کر نہ پکارو بلکہ حضور علیہ السّلام کی بارگاہ میں عرض کرتے وقت کہو: یا رسول اللہ، یا نبی اللہ، یا حبیب اللہ۔ (تفسیر ابن کثیر حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ)

سوال نمبر ۳

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا سایہ تھا یا نہیں۔ ہمارا پیش امام انکار کرتا ہے

وہ کہتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا سایہ تھا۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا۔ تفسیر مدارک ج ۲ ص۲۴۵ میں ہے:

وقال عثمان رضی اللہ عنه العیان اللہ ما اوقع ظلک علی الارض لئلا یضع انسان قدمه علی ذالک الظل۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ زمین پر نہیں ڈالا تاکہ آپ کے سایہ پر کوئی انسان قدم نہ رکھے۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ پیدا ہی نہیں کیا تاکہ سایہ کی بے ادبی نہ ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسی اور معنوی نور ہیں بلکہ تمام انوار کے اصل اور مبدء ہیں۔ بوجہ نور ہونے کے آپ کا سایہ ہی نہیں تھا۔

سوال نمبر ۴

ہمارا مولوی کہتا ہے کہ حضور علیہ السلام نور نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین۔

نور سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے یعنی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور کتاب مبین (قرآن مجید) تحقیق آچکا۔

علامہ سیوطی اور علامہ آلوسی بغدادی و دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ نور سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ نبی مقام انسانیت میں تشریف لاتے ہیں لیکن نبی کو اپنی طرح انسان سمجھنا یا یہ کہنا کہ ہم بھی بشر ہیں اور نبی بھی بشر ہیں اس سے انسان کافر ہو جاتا ہے کیونکہ نبی اگر عبد اور بشر ہے تو اس کی عبدیت اور بشریت کے ساتھ وصف نبوت رسالت

بشیر ہونا، نذیر ہونا اور سراج منیر اور داعی الی اللہ وغیرہ بھی ساتھ ملا ہے۔ نبی صرف انسان نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان ہونے کے ساتھ نبی اور رسول بھی ہے بلکہ ہزار ہا صفات غیر منفکہ نبی کیساتھ متصلہ اور ملے ہوئے ہیں۔ دوسرا عام انسان تو ان صفات سے خالی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہوں (جیسا کہ وہابیہ کہتے ہیں) تو وہ گویا کہ حضور علیہ السلام کی صفات میں شریک ہوتا ہے۔

مطلب یہ بنا، جو یہ کہتا ہے کہ میں نبی کی طرح ہوں گویا کہ وہ حضور کے ساتھ نبوت میں شریک ہونے کا مدعی ہے جو کہ صریح کفر ہے بلکہ اس کے کفر اور مرزا غلام احمد قادیانی علیہ اللعنۃ کے کفر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مرزا غلام احمد نے بھی حضور علیہ السلام کے ساتھ نبوت میں اشتراک کا دعویٰ کیا تھا اور حضور کو اپنی طرح سمجھنے والا یعنی نبوت اور رسالت بلکہ تمام صفات میں شرکت کا مدعی ہے کیونکہ حضور کی عبدیت، نبوت اور رسالت سے جدا نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام اگر نبی ہیں تو عبد بھی ہیں اگر عبد ہیں تو نبی اور رسول بھی ساتھ ہی ہیں لہٰذا جو حضور علیہ السلام کو عبدیت میں اپنی طرح سمجھتا ہے وہ یقیناً کافر ہے۔ حضور کی مثل تمام کائنات میں کوئی نہیں ہے۔

مولانا عبد العلی بحر العلوم المتوفی ۱۲۲۶ھ میر زاہد رسالہ قطبیہ کے حواشی کے خطبہ میں لکھتے ہیں:

لم یلد احد مثلہ من الازل ولم یولد الی الابد فلیس لہ من فی السموات والارض کفواً احد

یعنی نبی علیہ السلام کی طرح ازل سے لے کر ابد تک کوئی پیدا نہیں ہوا اور آسمانوں اور زمین میں کوئی آپ کا ہمسر اور مثل نہیں ہے۔

حضور علیہ السلام نے خود فرمایا:

ایکم مثلی

تم سے میری مثل کون ہے۔

حضرت مولا علی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی مثل کائنات میں کوئی بھی نہیں ہے۔
(حجۃ اللہ علی العالمین)

جب حضور علیہ السلام کی مثل کائنات میں کوئی بھی نہیں ہے تو حضور علیہ السلام کو اپنی طرح بشر کہنا یا مطلقاً بشر کہنا جس سے عمومیت اور توہین مستفاد ہو کفر ہے۔

سوال نمبر ۵

نبی پاک اللہ کے بتائے بغیر کچھ نہیں جانتے تھے، یہ بھی ہمارا پیش امام کہتا ہے۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

وہابیہ اور دیابنہ کا شیوہ ہے کہ وہ علم نبی کی نفی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ نبی کا علم جزئی ہے کلی نہیں ہے کبھی کچھ کبھی کچھ۔ قرآن پاک میں ہے:

ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشآء

اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ اے عام لوگو تم کو غیب کا علم دیا جائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو علم غیب عطا فرماتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتی دخل اھل الجنّۃ منازلھم واھل النار منازلھم حفظ ذالک من حفظہ ونسیہ من نسیہ۔

حضور علیہ السلام نے ہم میں ایک جگہ قیام فرمایا۔ پس ہم کو ابتداء پیدائش کی خبر دی یہاں تک کہ جنتی لوگ اپنی منزلوں میں پہنچ گئے اور جہنمی اپنی منزلوں میں۔ جس نے یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جو بھول گیا وہ بھول گیا۔ گویا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روز اول سے لے کر تا قیام قیامت ایک ایک ذرہ بیان کر دیا۔ (بخاری شریف)

مواہب لدنیہ القسم الثانی صد ۱۹۲ ج۲ میں ہے:

لا شک ان اللہ تعالیٰ قد اطلعه علیٰ ازید من ذالک والقی علیه علم الاولین والاٰخرین۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو اس سے بھی زیادہ پر اطلاع دی اور آپ پر اگلوں اور پچھلوں کا علم پیش کر دیا۔

مولانا بحر العلوم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں،

علمه علوما ما احتوی علیه العلم الاعلیٰ وما استطاع علیٰ احاطتها اللوح الادنی۔

حضور علیہ السلام کو رب نے وہ علم سکھائے جن پر علم اعلیٰ بھی مشتمل نہیں ہے اور جس کے گھیرنے پر لوح محفوظ قادر نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا علم حضور علیہ السلام کو نہ ہو۔

حضور علیہ السلام عالم الغیب والشہادہ ہیں۔

سوال نمبر ۶

نماز قضا پڑھنے کا طریقہ بھی تحریر فرمائیں؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

نماز اگر قضا ہو جائے اور نمازی صاحب ترتیب ہو یعنی جس کی پانچ نمازوں سے زائد قضا نہ ہوں تو پھر اس کو نماز قضا ترتیب سے ادا کرنی لازم ہیں۔ جو پہلے قضا ہوا اس کو پہلے پڑھے پھر دوسری پھر تیسری بلکہ ادا پڑھنے سے بھی پہلے قضا پڑھے۔ اگر صاحب ترتیب نہ ہو یعنی پانچ نمازوں سے زائد قضا جمع ہو گئی ہیں تو پھر بلا ترتیب بھی پڑھ سکتا ہے۔

رد المختار میں ہے:

لا یلزم الترتیب بین الفائتة والوقتیة ولا بین الفوائت اذا کانت الفوائت ستا۔

فتاویٰ رضویہ میں ہے ؛ اگر صاحب ترتیب نہ ہو تو جو نماز چاہے پہلے ادا کرے اور جو چاہے پیچھے ادا کرے۔ کیونکہ قضا جب پانچ فرضوں سے زائد ہو جاتی ہیں تو ترتیب ساقط ہو جاتی ہے بہر صورت اگر صاحب ترتیب ہے تو ترتیب کے ساتھ نماز قضا کرے۔ اگر صاحب ترتیب نہ ہو تو جیسے کہ مرضی ہو قضا کرے۔

سوال نمبر ۷

نماز تہجد پڑھنے کا طریقہ کیا ہے ؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

نماز تہجد سنّت مستحبہ ہے تمام مستحب نمازوں سے افضل ہے۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں کافی حد تک نماز تہجد کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

فتاویٰ رضویہ میں ہے ؛ عشاء کے فرض پڑھ کر اگر آدمی سوجائے پھر اس وقت سے صبح صادق کے قریب تک جس وقت آنکھ کھلے دو رکعت نفل صبح طلوع ہونے سے پہلے پڑھے تہجد ہو گئے۔ یہی اقل درجہ تہجد کا ہے اور حدیث میں آٹھ رکعت مروی ہیں اور مشایخ کرام سے بارہ رکعت اور حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی المتوفی ۲۹۷ھ رضی اللہ عنہ دو رکعت ہی پڑھتے تھے اور ان میں قرآن عظیم ختم کرتے اور تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ دو دو رکعت کی نیت کرے، ہر رکعت میں تین تین بار سورہ اخلاص پڑھے کہ اس کا ثواب ختم قرآن کے برابر ہے یا اس طرح پڑھے کہ پہلی رکعت میں ایک بار قل ہو اللہ احد ، دوسری رکعت میں دو بار ، تیسری رکعت میں تین بار بارہویں رکعت میں بارہ مرتبہ یا پہلی رکعت میں بارہ مرتبہ دوسری میں گیارہ مرتبہ اور بارہویں رکعت میں ایک بار۔ اگر قرآن پاک حفظ ہے تو وہ پڑھے۔ اگر دائمی طور پر تہجد کے لیے اٹھتا ہے تو تہجد کے بعد وتر پڑھے اور وتر کے بعد نفل نہ پڑھے بلکہ نوافل اگر پڑھنے ہوں تو وتر سے پہلے پڑھے کہ وہ سب قیام اللیل میں داخل ہوں گے اگر سونے کے بعد پڑھے تو تہجد میں داخل ہوں گے۔

سوال نمبر ۸

دعا مانگنے کے زیادہ قبولیت کے وقت کون کونسے ہیں ؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

دیگر عبادات کی طرح دعا کے لیے بھی کچھ وقت ہیں جن میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے

۱۔ جمعہ کے دو خطبوں کے درمیان ۔

۲۔ آفتاب غروب ہوتے وقت ۔

۳۔ رمضان شریف میں سحری اور افطاری کے وقت ۔

۴۔ شب قدر میں تمام رات ۔

۵۔ تہجد کی نماز کے وقت ۔

۶۔ ختم قرآن کے وقت ۔

۷۔ آبِ زم زم پی کر چند مقامات پر دعا زیادہ قبول ہوتی ہے ۔

(۱) ماں باپ کی قبر کے پاس ۔

(۲) رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان ۔

(۳) تنعیم کے پاس ۔

(۴) حضور علیہ السّلام کے روضہ مطہرہ کے پاس ۔

(۵) بزرگان دین کے مزارات کے پاس ، چند شخصوں کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے

I۔ ماں باپ کی اولاد کے لیے

II۔ انبیاء علیہم السّلام کی ۔

سوال نمبر ۹

نماز نفل کس وقت پڑھ سکتا ہے اور کس وقت منع ہے ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

نماز نفل تمام وقت پڑھ سکتا ہے لیکن بعض اوقات میں نفل مکروہ ہیں ۔ فقہاء فرماتے ہیں :

ویکرہ ان ینفل بعد صلوٰۃ الفجر حتی تطلع الشمس وبعد صلوٰۃ العصر حتی تغرب الشمس ویکرہ ان ینفل بعد طلوع الفجر باکثر من رکعتی الفجر ولا ینفل قبل المغرب ۔

یعنی نماز فجر کے بعد جب تک سورج طلوع نہ ہو نفل پڑھنے مکروہ ہیں اور نماز عصر کے بعد بھی نفل مکروہ ہیں ۔ جب تک سورج غروب نہ ہو اور صبح صادق ہونے کے بعد صرف دو رکعتیں سنّت پڑھ سکتا ہے نفل نہیں اور نماز مغرب سے قبل بعد از غروب بھی نفل نہیں پڑھ سکتا اس کے علاوہ جس وقت چاہے نفل پڑھے ۔

سوال نمبر ۱۰

قرآن پاک کس وقت پڑھا جائے ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

قرآن پاک کا ایک ایک حرف نہایت برکات کا سرچشمہ ہے ۔ قرآن پاک کا حفظ کرنا اور تعلیم فرض کفایہ ہے اور یہ افضل ترین عبادات سے ہے ۔ قرآن کی تلاوت بکثرت کرنا مستحب ہے بزرگان دین سے روایت ہے بعض دن رات میں آٹھ قرآن پاک ختم کرتے تھے ۔ بعض تین بعض پانچ ، بعض سات دنوں میں ایک ختم قرآن کرتے تھے یہ اکثر صحابہ کا معمول تھا ۔ حالات اور ذوق کے مطابق تلاوت کرتے رہنا چاہیئے ۔ قرآن پاک کی تلاوت مخارج کی ادائیگی اور معانی پر بھی لحاظ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا ضروری ہے اور تلاوت پاک جگہ میں ہو اور مسجد بہتر زیادہ ہے مستحب ہے کہ تلاوت کرنے والا رو بقبلہ ہو نہایت حضور قلب کے ساتھ باطمینان پڑھے ۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درج ذیل مسائل میں ؟

محمد صادق فریدی - لاہور

سوال نمبر ۱

نماز میں ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنے سے پہلے اور سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورۃ پڑھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم ضروری ہے ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صرف پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ سے قبل تسمیہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم) آہستہ پڑھی جائے ۔ ویقراء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ویسر اور سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت پڑھنے کے درمیان تسمیہ نہ پڑھی جائے ولا یأتی بہا بین السورۃ والفاتحۃ ۔

سوال نمبر ۲

مردے کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اگربتیاں جلادیتے ہیں ۔ آگ اور دھواں ہونے کی وجہ سے یہ اچھا نہیں لگتا بلکہ بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں مردے کو تکلیف ہوتی ہے ۔ کیا قبروں پر اگربتیاں جلانا جائز ہے ؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

اولیاء اللہ کے مزارات پر چراغ جلانا ، اگربتیاں ، موم بتیاں وغیرہ جلانا جائز ہے

وکذا ایقاد القنادیل والشمع عند قبور الاولیاء والصلحاء والاجلال للاولیاء فالمقصد فیہا مقصد حسن و نذر الزیت والشمع للاولیاء یوقد عند قبورھم تعظیماً لھم و محبۃ فیھم جائز لا ینبغی النھی ۔

اسی طرح اولیاء صالحین کی قبروں کے پاس قندیل اور موم بتیاں جلانا ان کی عظمت اور بزرگی کے لیے جائز ہے۔ مُردوں کو تکلیف نہیں ہوتی البتہ وہابیہ اور دیابنہ کو تکلیف ضرور ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۳

اسی طرح بعض لوگ قبروں یا مزارات پر جاتے ہیں اور چراغ یا موم بتیاں جلا آتے ہیں اس سے کیا فائدہ ؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

قبروں پر جانا قرآن اور حدیث سے ثابت ہے۔ جانے سے فائدہ بھی ہے کہ آخرت یاد آئے گی اور میت کے لیے بھی فائدہ ہے کہ اس کے لیے یہ جانے والا دعا کرے گا جو میت کے لیے مفید ہے اور چراغ جلانے کا فائدہ عظمت اولیاء کے علاوہ لوگوں کو علم ہو جائے گا کہ ولی اللہ کی مزار ہے۔

ویدعو اللہ تعالیٰ عندہٗ فیستجاب لھم فھو امر جائز۔

ولی اللہ کی مزار پر جا کر دعا کریں تاکہ ان کی دعا قبول ہو۔ لہذا چراغاں کرنا اولیاء کرام کی مزارات پر جیساکہ جائز ہے اس میں بے شمار فوائد بھی ہیں۔

سوال نمبر ۴

مزاروں پر چادر چڑھانے کا کیا فائدہ ہے ؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

اولیاء کی مزارات پر چادریں چڑھانا جائز ہیں۔ تفسیر روح البیان میں ہے :

وضع الستور والعمائم والثیاب علی قبورھم امر جائز اذا کان القصد بذا التعظیم فی اعین العامۃ حتی لا یحتقروا صاحب ھٰذا القبر ۔

مزارات پر چادریں اور عمامہ اور کپڑے چڑھانا جائز ہیں جبکہ ان سے مقصود ہو کہ عوام کی نگاہ میں صاحب مزار کی عزت ہو اور لوگ ان کو حقیر نہ جانیں گویا کہ چادریں چڑھانے میں صاحب مزار کی عزت وعظمت ہے جو کہ عندالشرع ثابت ہے۔

سوال نمبر ۵

کیا بزرگان دین کی تصاویر عقیدتاً احتراماً یا برکت کے لیے اپنے پاس رکھنا یا گھروں یا دکانوں میں لگانا اور ان کے فریم پہ ہار ڈالنا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

تصاویر کا عقیدتاً و احتراماً رکھنا حرام اور ناجائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

جب مکہ فتح ہوا تو سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام و حضرت بتول مریم رضی اللہ عنہا کی تصویریں دیوار کعبہ پر کفار نے نقش کی ہوئی تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھیج کر وہ سب محو کرادیں۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس مسئلہ پر مستقل کتاب "عطایا القدیر فی حکم التصویر" تحریر فرمائی ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ بزرگان دین کی تصویریں برکت کے لیے اپنے پاس رکھنی حرام اور ناجائز ہیں اور پھر اس پر ہار وغیرہ ڈالنے بھی ناجائز ہیں۔

سوال نمبر ۶

قبروں کو پختہ کرنا یا قبرستان میں اپنے خاندان کے لیے جگہ ریزرو کرا لینا کہاں تک جائز ہے اور اس سے کیا فائدہ ہے قبرستان ایک احاطے میں ہوتے ہیں یا علاقے میں محدود رہتے ہیں؟ قبروں کو پختہ کرا لینے سے یا جبکہ ریزرو کرا لینے سے دوسروں کی حق تلفی نہیں ہوتی ہے؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

اولیاء صالحین کی قبروں کو پختہ بنانا جائز ہے تاکہ نشان رہے، لوگ تعظیم کریں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون کی قبر پختہ بنوائی تھی۔ مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

قد اباح السلف البناء علی قبور المشایخ والعلماء المشهورین لیزورهم الناس ویستریحوا بالجلوس۔

علماء سلف نے قبروں پر عمارات اور روضے بنانے جائز رکھے ہیں تاکہ لوگ ان کی زیارت کریں اور وہاں بیٹھ کر آرام و سکون حاصل کریں۔ اکثر قبرستان جو ہیں وہ وقف ہیں ان سے جگہ کا تعین کرنا یا ریزرو کرانا ٹھیک نہیں ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے اگر کسی نے موقوفہ قبرستان سے جگہ متعین کر بھی لی ہے تو دوسرے مسلمان بھی وہاں ہی میت دفن کر سکتے ہیں اس کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

سوال نمبر ۷

مقلد کسے کہتے ہیں اور غیر مقلد کسے؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

جو مسائل قرآن و حدیث یا اجماع امت سے اجتہاد کر کے نکالے جاتے ہیں ان مسائل میں ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم) سے کسی ایک کی پیروی کرنے والے کو مقلد کہتے ہیں اور جو ان کا متبع نہیں ہے وہ غیر مقلد ہے۔ جیسا کہ وہابیہ غیر مقلد ہیں۔ تقلید صرف ان ائمہ اربعہ کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔

ولا یجوز تقلید غیر الائمة الاربعة مالک وابی حنیفة والشافعی واحمد لان هؤلاء عرفت قواعد مذاهبهم واستقرت احکامها وخدمها [illegible] حرروها فرعاً فرعاً وحکماً وحکماً۔

سوال نمبر ۸

کیا شیعہ، دیوبندی، اہل حدیث وہابی، اسماعیلی، پرویزی، مودودی وغیرہ

مسلمان ہیں ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

شیعہ ، دیابنہ ، وہابیہ کے متعلق اعلیٰحضرت فاضل بریلوی لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس بات کے معتقد ہیں جو آدمی ان کا ہم عقیدہ نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے اور جو ان کا ہم عقیدہ ہے وہی مسلمان ہے جو ان کے عقائد کے مخالف ہے اس کو ہی یہ لوگ مشرک اور کافر سمجھتے ہیں ۔

اعتقد وا انھم ھم المسلمون وان من خالف اعتقادھم مشرکون ۔

جب یہ لوگ اہل السنّت والجماعت کو مسلمان نہیں سمجھتے تو پھر یہ خود مسلمان نہیں ہیں

اجمع العلماء ان من شك فی کفرہ و عذابہ فقد کفر ۔

مودودیہ وہابیہ کے ہم عقیدہ ہیں ، پرویزیہ وہابیہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں ، اسماعیلیہ شیعہ ہی ہیں چونکہ یہ تمام مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے لہذا یہ خود مسلمان نہیں ہیں ۔

سوال نمبر ۹

کیا مومن اور مسلمان میں کوئی فرق ہے ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

ہمارے نزدیک مؤمن اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے جو مسلمان ہے وہ مومن ہے اور جو مومن ہے وہ مسلمان ہے ۔ شیعہ فرق کرتے ہیں وہ اہل السنّت والجماعت کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اپنے کو مومن حالانکہ شیعہ نہ مسلمان ہیں اور نہ ہی مومن ہیں ۔

سوال نمبر ۱۰

کیا نکاح کی رسم مسجد میں ادا کرنا مستحب ہے ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

نکاح مسجد میں کرنا مستحب ہے ۔ در مختار میں ہے : وکونہ فی المسجد ۔

سوال نمبر ۱۱

اگر کسی دوست کے یہاں میت ہو جائے اور وہ سوئم اور چالیسویں پر کھانا کھلانے اور اس کا کھانا ہمارے لیے کہاں تک جائز ہے جبکہ اس پر فقیروں، غریبوں، یتیموں وغیرہ کا حق ہے؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

سوئم اور چالیسویں پر جو کھانا کھلایا جاتا ہے چونکہ صدقہ واجبہ نہیں ہے بلکہ صدقہ نفلی ہے لہٰذا ہر امیر اور غریب کھا سکتا ہے اور اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

سوال نمبر ۱۲

عرسوں پر ناچ، گانے اور فواحشات ہوتے ہیں ان کو منتظمین، مجاورین یا سجادہ نشین کیوں نہیں روکتے؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

منکرات سے روکنا اور امر بالمعروف کرنا لازم اور ضروری ہے۔ جو لوگ نہیں روکتے آپ ضرور جا کر ان کو امر بالمعروف کی بجا آوری کرتے ہوئے منع کریں۔

سوال نمبر ۱۳

مرنے کے بعد ان لوگوں کا محاسبہ کس طور پر ہوگا، جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں۔ مثلاً جاہل یا جانگلی یا وہ کافر جس کو اپنے مذہب کے سوا کسی اور مذہب کا پتہ ہی نہیں؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہاں پر جہالت عذر ہی نہیں ہے کیونکہ عقل ادراک ایمان کے لیے آلہ ہے جب اس کو عقل کے بعد تجربہ ہو جائے گا اور اتنی مہلت بھی مل جائے کہ مصنوعات میں غور و فکر کر سکے تو معذور نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ یہ مدت تامل (غور و فکر)

ہی اس کے لیے بمنزلہ دعوت رسل ہے (مسلم الثبوت ص۱۶)

اگر وہ خدا کی توحید پر ایمان نہیں لائے گا تو دوسرے منکرین کفار کی طرح اس کا بھی حساب ہوگا۔ دیگر ایمہ کہتے ہیں کہ اس کو اہل فطرت میں شمار کیا جائے گا۔ اس کو عذاب نہیں ہوگا۔ (تفسیر صاوی پ۱۵)

بہر حال اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ اور دیگر ایمہ کا اختلاف ہے۔

سوال نمبر ۱۴

اپنے اثر و رسوخ کو دوسروں کی بھلائی کے لیے کہاں تک استعمال کرنا جائز ہے اور اثر و رسوخ کو اپنی بھلائی کے لیے استعمال کرنا کہاں تک جائز ہے جبکہ ایسی صورتوں میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کی حق تلفی بھی ہو سکتی ہے؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

اپنے اثر و رسوخ کو جائز امور میں استعمال کرنا جائز ہے اور ناجائز میں ناجائز ہے خواہ اپنا معاملہ ہو یا کسی دیگر کا۔ کسی کی حق تلفی کرنی ناجائز ہے کیونکہ یہ شرعی حدود سے تجاوز ہے جو کہ منع ہے۔

سوال نمبر ۱۵

فجر کی نماز کا وقت کس لمحہ شروع ہوتا ہے۔ ظہر " " " کیا یہ عصر کی اذان کے وقت تک رہتا ہے۔ عصر " " " مغرب " " " مغرب کی نماز کا وقت کس لمحہ تک رہتا ہے۔ عشاء " " " " تہجد کی نماز کا وقت کس لمحہ شروع ہوتا ہے کیا یہ فجر کی اذان کے وقت تک رہتا ہے۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نماز فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک ہے۔ ظہر کا وقت بعد از زوال اصلی سایہ کے سوا ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے تک ہے اور عصر کی نماز کا وقت غروب

آفتاب تک ہے ۔ سورج ڈوبنے سے پہلے بیس منٹ وقت مکروہ ہے ۔ نماز مغرب کا وقت بعداز غروب آفتاب سفیدی ڈوبنے تک ہے جب سفیدی ختم ہوگئی وقت مغرب ختم ہوا اور عشا آگئی ۔ عشا کا وقت طلوع فجر صادق تک ہے اور وقت مستحب آدھی رات سے پہلے پہلے ہے ۔ عشار کا وقت غروب شمس کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ پینتیس منٹ بعد تک ہوتا ہے ۔ نماز تہجد صبح صادق تک پڑھ سکتا ہے آخری نصف شب نماز تہجد کے لیے افضل ہے۔

سوال نمبر ۱۶

کیا صرف فرض کی رکعتیں ادا کرنے سے نماز ہو جاتی ہے ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

صرف فرض نماز پڑھ لینے سے فرض کی ادائیگی ہو جائے گی لیکن وہ اگر سنتیں چھوڑتا ہے تو شفاعت سے محرومی کا ذریعہ اختیار کرتا ہے جو سنتیں اور نوافل نہیں چھوڑتا وہ فرائض ہرگز ترک نہیں کرتا ، اسی لیے تو فقہاء فرماتے ہیں کہ سنن اور نوافل فرائض کی تکمیل کرتے ہیں ۔

سوال نمبر ۱۷

شکرانے کے علاوہ کسی مراد کے لیے یا کسی کو ثواب پہنچانے کے لیے یا کسی میت کے لیے جبکہ ابھی اس کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھائی گئی ہو نوافل پڑھ لینا ممنوع تو نہیں ؟

الجواب بعونہ تعالیٰ

شکرانے یا کسی حاجت کے لیے نفل پڑھنے جائز ہیں ۔ میت اگر صحیح العقیدہ اہل السنّت والجماعت ہو تو اس کے لیے نفل پڑھے تاکہ اس کو ثواب پہنچے ، بھی جائز ہیں ۔

عند اهل السنة والجماعة صلوٰة كان اوصوماً اوحجاً اوصدقة اوقراءة للقران اوالاذكار اوغيرذالك من انواع البر يصل ذالك الى الميت كما قال الزيلعى ۔

نماز جنازہ اگرچہ ابھی پڑھی نہیں گئی تو اس کو نوافل وغیرہ کا ثواب پہنچایا جا سکتا ہے ۔

سوال نمبر ۱۸

مندرجہ ذیل جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ دینی چاہیئے۔ سیونگ بنک اکاؤنٹ، فکسڈ ڈیپازٹ اکاؤنٹ، ڈیفینس سیونگ سرٹیفکیٹ، پراویڈنٹ فنڈ انشورنس، بیوی کا زیور جبکہ وہ خود نہ کماتی ہو صرف شوہر کماتا ہو۔

الجواب لعونہ تعالیٰ

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ ابھی تک یہ اس کی ملکیت میں نہیں ہے دیگر سیونگ حساب یا دیگر رقم جس کا وہ ذاتی طور پر مالک ہے۔ مالک نصاب بھی ہو حاجت اصلیہ سے مال زائد بھی ہو تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ بیوی کا زیور اگر نصاب ساڑھے سات تولہ یا زائد ہو تو عورت پر فرض ہے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے اگرچہ وہ خود کماتی نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۹

اگر مقروض ہو ایسا کہ ادائیگی کے لیے تنگ نہیں کیا جاتا مثلاً بنک کا مقروض ہو یا مقروض ہو ایسا کہ مجبوری یا اشد ضروریاتِ زندگی کے لیے نہیں بلکہ آسائش زندگی کے لیے قرضہ لیا تو کیا زکوٰۃ اور حج واجب ہے؟

الجواب لعونہ تعالیٰ

مقروض پر زکوٰۃ اور حج واجب نہیں ہے خواہ کسی صورت میں مقروض ہو جائے لیکن عیاشی کے لیے قرض اٹھاتے رہنا شرعاً ممنوع ہے اور ضرورت کے لیے جس کے سوا گذارہ نہیں ہے بشرط نیت ادائیگی جائز ہے۔

سوال نمبر ۲۰

انشورنس کرا لینی جائز ہے؟

الجواب لعونہ تعالیٰ

انشورنس کرا لینی اس وقت جائز ہے جبکہ کمپنی والے سود کا تعین نہ کریں بلکہ رقم لگانے

والوں کو کاروبار سے حصّہ (بطور تجارت مضاربت) دیں۔ اگر بنکوں کی طرح سود دیتے ہیں تو پھر جائز نہیں کیونکہ سود قطعی حرام ہے۔

سوال نمبر ۲۱

ضبطِ تولید کہاں تک جائز ہے؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

جب تک بچّے کی اعضائی تکمیل نہیں ہوئی اس سے قبل اسقاطِ حمل جائز ہے۔ فقہاء اسقاطِ حمل کے متعلق لکھتے ہیں:

لا تأثم مالم تبین من خلقه و ذالك لا یکون الا بمائته و عشرین۔

اعضاء کی تخلیق ایک سو بیس دن تک ہوتی ہے اس کے بعد اسقاط نہیں چاہیے اگر عورت ایسی دوائی استعمال کرے کہ بچہ ہی پیدا نہ ہو تب بھی جائز ہے۔ بہرصورت تکمیل اعضاء سے قبل جائز ہے۔ بعد میں علماء نے اختلاف کیا ہے اکثر کا خیال ہے کہ بعد از تکمیل اعضاء اسقاط نہ کرے۔

سوال نمبر ۲۲

قرآن پاک کی رُو سے پانچ نمازیں کیونکر ثابت ہوتی ہیں پانچ سے کم کیوں نہیں؟

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ کیا پانچ نمازوں کا قرآن میں بیان ہے تو آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی:

فسبحن الله حین تمسون و حین تصبحون و له الحمد فی السموات والارض وعشیا و حین تظهرون۔

اور تمسون میں نماز مغرب اور عشاء مراد ہے اور احادیث میں دونوں کو عشائین کہا گیا

ہے اور تصبحون میں نماز فجر مراد ہے اور عشیا کا معنی ہے کچھ دن یعنی نماز عصر اور تظہرون میں نماز ظہر مراد ہے لہذا پانچ نمازوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک امام نے فجر اور ظہر کی سنتیں نہیں پڑھیں۔ کیا وہ امامت کرا سکتا ہے یا نہیں؟

سائل محمد شریف۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

اگر وقت میں وسعت اور گنجائش ہو تو پھر امام کو سنتیں پڑھ کر نماز پڑھانی چاہیئے۔ اگر اتنا وقت ہو کہ صرف فرض ادا ہو سکتے ہیں تو پھر پڑھا سکتا ہے، اگر وقت کافی ہے تو پھر سنتیں لازمی طور پر پڑھ کر جماعت کرائے۔ فتاوی رضویہ ص ۳۵۰ میں ہے:

اگر وقت میں وسعت ہے تو سنت قبلیہ کا ترک گناہ ہے اور اس کی امامت مکروہ ہے

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ آدمیوں نے ایک شخص کو دیکھا وہ اجنبیہ عورت کے ساتھ ایک بستر پر سویا ہوا تھا۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ اس پر حد لگانی چاہیئے اور کیا یہ امام مسجد بھی بن سکتا ہے یا نہیں؟

اصغر علی از ظفروال ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں حد واجب نہیں ہو گی کیونکہ حد زنا پر ہوتی ہے اور یہاں زنا کا ثبوت ممکن نہیں کیونکہ ثبوت زنا کے لیے چار مردوں کی شہادت ضروری ہے اور صورت مذکورہ

میں صرف دو گواہ ہیں۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

ولو شهد اربعة على رجل بالزنا فشهدوا عند القاضي انهم راوه زنى بهذه المرأة وقالوا راينا ذكره في فرجها قد غاب كما يغيب الميل في المكحلة جازت شهادتهم۔

اور اگر چار مردوں نے کسی مرد پر زنا کی شہادت دی پس وہ قاضی کے پاس شہادت دیں کہ انہوں نے اس آدمی کو اس عورت کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے اور کہیں کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس کا آلہ تناسل عورت کی فرج میں غائب ہوا ہے جیسا کہ میل (سرمچو) مکحلہ (سرمہ دانی) میں غائب ہوتا ہے تب ان کی شہادت جائز اور مقبول ہوگی۔

معلوم ہوا کہ زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر چار سے کم ہوئے تو پھر زنا ثابت نہیں ہوگا اور نہ ہی گواہی قبول ہوگی۔ قاضی خاں میں ہی ہے:

الشهادة على الزنا لا تقبل اذا كان الشهادة اقل من اربعة۔

شہادت زنا میں اگر چار سے کم ہوئی تو قبول نہیں ہوگی چونکہ زنا میں شہادت چار مردوں کی لازم ہے۔ لہٰذا جب تک چار مرد نہیں دیکھیں گے زنا ثابت نہیں ہوگا اور نہ ہی حد لازم ہوگی۔ ہاں تعزیر ان پر لاگو ہو سکتی ہے کیونکہ اجنبیہ کے ساتھ خلوت بالخصوص ایک بستر پہ سونا دونوں کا اعلانیہ فسق و فجور اور موجب تعزیر ہے اور تعزیر دو گواہوں سے ہی ثابت ہو جائے گی کیونکہ تعزیر میں دو گواہ ہی نصاب شہادت ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

رجل قبل حرة اجنبية او عانقها او مسها بشهوة يعزر

اگر کسی مرد نے کسی اجنبیہ عورت کو بوسہ دیا یا اس سے معانقہ کیا یا اس کو شہوت کے ساتھ مس کیا تو اس کو تعزیر لگائی جائے لہٰذا صورت مسئولہ میں جس مرد کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ قابل تعزیر ہے۔ تعزیر کی حیثیت ایک تادیبی ہے یہ حد سے کم ہوتی ہے اور حد کا شریعت میں تقرر ہے اور تعزیر کا شریعت میں تقرر نہیں بلکہ حاکم وقت پر موقوف ہے اور

تعزیر اس جنایت (گناہ) میں ہوگی جو موجب حد نہ ہو، جہاں حد ہو وہاں تعزیر نہیں ہوگی۔
حقوق دو قسم ہے ایک حقوق اللہ اور ایک حقوق العباد۔
حقوق العباد میں سوائے حاکم یا جس کو دونوں فریق حاکم مقرر کریں تعزیر نہیں لگا سکتا ہے اور حقوق اللہ میں جب منہیات کا کوئی ارتکاب کر رہا ہو اس وقت ہر آدمی تعزیر لگا سکتا ہے
اور چونکہ صورت مستفسرہ میں حق اللہ ہے لہذا وہ قابل تعزیر ہے اور اس مرد اور عورت کو تعزیر لگانی چاہیئے اور یہ مرد فاسق معلن ہے اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ امام متقی، پرہیزگار، متدین اور گناہوں سے بچنے والا چاہیئے۔ در مختار میں ہے:

الاحق بالامامۃ الاعلم باحکام الصلوٰۃ بشرط اجتنابہ للفواحش الظاھرۃ۔

یعنی امامت کا حقدار وہ ہے جو نماز کے احکام کا زیادہ واقف ہو اور گناہوں سے بھی بچتا ہو اور یہ آدمی چونکہ فاسق معلن قابل تعزیر ہے اس کو امام بنانا حرام اور مکروہ تحریمی ہے۔ اور اگر ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھی جائے تو اس کا اعادہ لازم ہے۔ فقہاء کا مشہور ضابطہ ہے:

کل صلوٰۃ ادیت مع الکراھۃ التحریمۃ وجبت اعادتہ۔

جو نماز مکروہِ تحریمہ کی حیثیت سے ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ لازم اور ضروری ہے
لہذا ایسے آدمی کو جب تک وہ توبہ علی الاعلان نہ کرے ہرگز امام نہ بنایا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ میں پہلی صف میں زیادہ ثواب ہے یا آخیر صف میں۔ شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

مولوی علم دین از گھنگور ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

اخیر صف میں زیادہ ثواب ہے۔ فتاویٰ نظامیہ ج ۱ صلا۶۷ میں ہے:

ردالمختار ج ۱ ص ۴۱۰ قولہ فی غیر جنازۃ اما فیہا فآخرھا اظہار التواضع لانہم شفعاء فہو احدی بقبول شہادتہم۔ ولان المطلوب فیہ تعدادالصفوف فلو فضل امتنعوا عن التاخر عند قلتہم۔

آخری صف میں زیادہ ثواب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کے لیے سفارشی ہیں۔ سفارش کی قبولیت کے لیے عاجزی لائق ہے اور اظہار تواضع کی صورت آخری صف میں زیادہ ہے دوسرا اس میں تعداد صفوف مستحب ہے۔ اگر پہلی صف کو فضیلت دی جائے تو آخری صف کو لوگ پسند نہیں کریں گے جبکہ وہ قلیل ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ آخری صف میں کھڑا ہونا زیادہ ثواب ہے۔ آخری صف (جنازہ میں) بوجہ تشبیہہ بعبدۃ الاصنام بھی بہتر ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازے کے لیے جو وضو کیا جاتا ہے اس سے فرض نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

محمد امین از امین آباد ضلع گوجرانوالہ

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نماز فرض پڑھنا درست ہے کیونکہ وضو جس نیت سے کیا جائے اس سے ہر قسم کی نماز فرض ونفل وغیرہ درست ہے۔

ردالمختار ج ۱ صہ، کتاب الطہارت میں ہے:

کل وضوء تصح بہ الصلوٰۃ ۔

اسی صفحہ میں ہے :

ان الصلوٰۃ تصح عندنا بالوضوء ولو لم یکن منویاً

یا وضو میں اگر نیت نہ بھی کرے تو پھر بھی اس وضو کے ساتھ نماز ہو سکتی ہے ۔
لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر وضو نماز جنازہ کے لیے کیا ہے تو اس وضو کے ساتھ نماز فرض و نفل وغیرہ بھی پڑھ سکتا ہے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ اگر بندوق کیساتھ شکار کیا جائے اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر گولی چلائی جائے اور جانور مر جائے تو کیا کھانا جائز ہے یا نہیں ؟

ماسٹر محمد اکرم از جھنگ مگھیانہ

الجواب بعونہ تعالیٰ

ذبح کے لیے تیز آلہ کی ضرورت ہے ۔ بندوق چونکہ تیز آلہ میں داخل نہیں ہے، لہٰذا بندوق کے ساتھ جو جانور شکار کیا گیا ہے اور ذبح نہیں کیا گیا اور مر گیا ہے اسکا کھانا جائز نہیں ہے ۔

در مختار کتاب الصید میں ہے :

او بندقۃ ثقیلۃ ذات حدۃ لقتلہا بالثقل لا بالحد ولو کانت خفیفۃ بہا حدۃ حل لقتلہا بالجرح ولو لم یجرحہ لا یوکل مطلقا ۔

ردالمختار میں ہے:

قال قاضی خان لایحل صید البندقة والحجر والمعراض والعصا وما اشبہ ذالک۔

بندوق اور پتھر وغیرہ کے ساتھ چونکہ ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں، جیسا تیز دھار آلہ کیساتھ زخم ہوتا ہے بندوق کے ساتھ زخم نہیں ہوتا۔ لہذا بندوق کے ساتھ اگر شکار کیا گیا ہے اور جانور مر گیا ہے اور بسم اللہ بھی پڑھی گئی ہے اور ذبح نہیں کیا گیا، ایسا شکار حرام ہے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

کتاب الوصایا والمیراث

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی کا ایک لڑکا تھا جس کا نام غلام محمد ہے اور ایک لڑکی فہمیدہ ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں فہمیدہ کو کچھ روپے ہبۃً دیئے اور اشٹام لکھوالیا کہ وہ جو زمین ہے اس سے حصّہ نہیں لے گی بلکہ زمین تمام غلام محمد لے لیگا۔ ہبہ لکھوایا نہیں تھا۔ اب اس کے مرنے کے بعد فہمیدہ نے اپنے حق کا دعوٰی کر دیا ہے کیا شرعاً فہمیدہ وراثت (زمین) سے حصّہ لے سکتی ہے، کیا اس کا دعوٰی صحیح ہے یا نہیں۔ ہمیں تحریر با حوالہ کتب کر دیں کہ کیا فہمیدہ حقدار ہے یا نہیں۔

غلام مرتضیٰ از فیصل آباد

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

کسی چیز کا چھوڑنا اور ترک کرنا اس وقت معتبر ہوتا ہے جبکہ وہ مالک ہو۔ جب مالک ہی نہ ہو تو اس کا اس کو ترک کرنا کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ فہمیدہ اپنے والد کی زندگی میں والد کی زمین کی مالک ہی نہیں تھی لہذا اس کا چھوڑنا اور ترک کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا لہذا وہ وراثت میں دعوٰی کر سکتی ہے اور اس کو وراثت بھی ملے گی۔ الاشباہ والنظائر میں ہے:

لو قال الوارث ترکت حقی لم یبطل حقہ اذ الملک لا یبطل بالترک

وفی الحموی ضابطہ انہ ان کان ملکا لازماً لم یبطل بذالک کما

لومات عن ابنین فقال احدھما ترکت نصیبی من المیراث لم یبطل

لانہ لازم لا یترک بالترک ۔

اگر وارث نے کہا کہ میں نے اپنا حق چھوڑا، اس کا حق باطل نہیں ہوتا کیونکہ ملک لازم ترک کے ساتھ باطل نہیں ہوتا اور حموی میں ضابطہ ذکر کیا گیا ہے کہ ملک لازم ترک کے ساتھ باطل نہیں ہوتا ۔ مثال کے طور پر ایک آدمی مرا اور اس کے دو بیٹے تھے ۔ ایک نے کہا میں میراث سے اپنا حصّہ چھوڑتا ہوں، اس کا حق باطل نہیں ہوگا کیونکہ لازم حق ترک کے ساتھ باطل نہیں ہوتا ۔ مورث کی زندگی میں جب وارث کا حق لازم نہیں ہے تو اس کے ترک کا بالکلیہ اعتبار نہیں ہوگا ۔ ہدایہ شریف میں ہے،

ولا معتبر باجازتھم فی حال حیواتہ لانھا قبل ثبوت الحق اذا الحق

یثبت عند موتہ فکان لھم ان یردوہ بعد وفاتہ ۔

اگر وارث مورث کی زندگی میں اجازت دیں تو ان کی اجازت کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ یہ اجازت اپنے حق کے ثبوت سے پہلے دے رہے ہیں ۔ کیونکہ وارثوں کے حق کا ثبوت موت کے وقت ہوتا ہے ۔

پس ان کے لیے جائز ہے کہ وفات کے بعد اجازت کو رد کر دیں ۔ وارث اگر اپنے مورث کی زندگی میں اپنے حق کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر فہمیدہ نے دعویٰ کر دیا ہے تو وہ حق بجانب ہے اور وارث بھی ہوگی ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ محمد علی نے اپنا نصف مال مسکینوں اور غریبوں پر خیرات کرنے کے لیے وصیت کی اور مال کا چوتھائی حصّہ اپنی بیوی کو دینے کیلئے

وصیت کی بعد میں وہ مرگیا اور اس کی دو لڑکیاں ہیں وہ اس وصیت پر ناراض ہیں۔ اب کیا وہ لڑکیاں وصیت کو روک سکتی ہیں یا نہیں۔ کیا وصیت سے چوتھائی حصہ بیوی کو بھی دیا جائے گا یا نہیں شرعی حکم تحریر فرمائیں۔

غلام محمد میرپور آزاد کشمیر۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں مساکین کے لیے نصف مال کی وصیت ناجائز ہے اور اسی طرح اپنی بیوی کے لیے بھی وصیت ناجائز ہے۔ مساکین کے لیئے وصیت ثلث مال کی ہوگی نصف کی نہیں اور بیوی کے لیے وصیت بالکلیہ نہیں ہوگی بلکہ دو ثلث مکمل طور پر ورثہ کے درمیان ان کے حصص کے مطابق تقسیم ہوگی۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

ولا تجوز الوصية للوارث عندنا الا ان يجيزها الورثة ولو اوصى لوارثه ولا جنبي صح في حصة الاجنبي ويتوقف في حصة الوارث على اجازة الورثة ان اجازوا جاز وان لم يجيزو بطل ولا يعتبر اجازتهم في حياة الموصي حتى كان لهم الرجوع بعد ذالك۔

اور ہمارے نزدیک وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وارث جائز رکھیں اور اگر ایک آدمی نے وارث اور اجنبی کے لیے وصیت کی تو اجنبی کے لیے وصیت جائز ہے اور وارث کے حق میں جو وصیت ہے وہ دیگر وارثوں کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اگر وارث جائز رکھیں تو جائز اور اگر جائز نہ رکھیں تو باطل ہے اور مورث کی زندگی میں اگر وہ اجازت دیں تو غیر معتبر ہے حتیٰ کہ مورث (موصی) کے مرنے کے بعد پھر وہ رجوع کر سکتے اور وصیت کو ختم کر سکتے ہیں اور ہدایہ میں ہے:

ولا تجوز بما زاد على الثلث الا ان يجيزها الورثة ولو اجاز بعض ورد بعض تجوز على المجيز بقدر حصة۔

اور ثلث سے زائد وصیت جائز نہیں مگر یہ کہ وارث جائز رکھیں۔ اگر بعض وارثوں نے اجازت دی اور بعض نے تردید کی تو جائز رکھنے والے کے لیے اس کے حصہ کے مطابق جائز ہوگی اور در مختار میں ہے:

ولا تعتبر اجازتهم حال حیاته اصلاً بل بعد وفاته۔

اگر وصیت کے متعلق مورث (موصی) کی زندگی میں وارث اجازت دے دیں تو اس کا اعتبار نہیں ہے بلکہ بعد از وفات اجازت دیں تو پھر اعتبار ہوگا۔ فتاویٰ قاضی میں ہے:

رجل اوصی بجمیع ماله للفقراء اولرجل بعینه لا یجوز ذالک الا من الثلث فان اجازت الورثة فی حیاة المورث لا یعتبر اجازتهم وکان لهم الرجوع وان اجازوا بعد موته صحت الاجازة۔

ایک مرد نے اپنے تمام مال کی وصیت فقیروں کے لیے یا کسی خاص آدمی کے لیے کر دی تو یہ صرف ثلث مال سے جائز ہوگی۔ اگر وارث اس کی زندگی میں جائز رکھیں تو ان کی اجازت غیر معتبر ہے اور وہ رجوع کر سکتے ہیں اور اگر موت کے بعد اجازت دیں تو پھر صحیح ہے اور صورت مسئولہ میں وصیت نصف مال کی جائز نہیں ہے بلکہ ثلث مال سے ہوگی اور بیوی کے لیے وصیت جائز ہی نہیں۔

لہٰذا مال وارثوں کے درمیان جن میں بیوی بھی ہے حصص کے مطابق تقسیم کیا جائیگا یعنی ایک ثلث غرباء کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا اور دو ثلث وارثوں کے درمیان ہوگا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ غلام علی فوت ہو گیا ہے ایک اس کے بھائی کا لڑکی ہے اور ایک اس کی ہمشیرہ کا لڑکا ہے۔ اس کے سوا غلام علی کا کوئی وارث نہیں ہے ان کی وراثت

کیسے تقسیم ہوگی۔ بینوا وتوجروا۔

غلام حسین خطیب ٹھٹھر والی ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں قرض اور دیگر ماتقدم علی الارث کے بعد متوفی کا کل ترکہ تین حصوں پر تقسیم ہوگا۔ دو حصے بھائی کی لڑکی لے گی اور ایک حصہ ہمشیرہ کا لڑکا لے گا۔ شریفیہ میں ہے:

یقسم المال علی الاخوۃ والاخوات مع عدد الفروع والجہات فی الاصول وھو الظاھر من قول ابی حنیفۃ فما اصاب کل فریق من تلک الاصول یقسم بین فروعھم۔

مال کی تقسیم بھائیوں اور بہنوں پر بلحاظ عدد فروع اور جہات کے اصول میں ہوگی اور یہی ابوحنیفہ کا ظاہر قول ہے پس جو ہر فریق کے اصول کو ملتا تھا وہی فروع میں تقسیم کیا جائیگا لہٰذا صورت مذکورہ میں بھائی کی لڑکی کو دو حصے ملیں گے کیونکہ بھائی کے دو حصے تھے اور بہن کے لڑکے کو ایک حصہ ملے گا کیونکہ بہن کا اپنا حصہ ایک تھا جو اصول کو ملا وہی فروع کو بھی ملا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک قطعہ اراضی زرعی قبلہ والد صاحب نے کلیم کے عوض الاٹ کرائی کلیم جدی جائیداد کا تھا وہ اراضی انہوں نے اپنے بڑے لڑکے کے نام بذریعہ بیع رجسٹری تبدیل کر دی۔ منشا یہ تھا کہ قبلہ والد صاحب اراضی کو فروخت کرنا چاہتے تھے مگر لڑکا فروخت کے خلاف تھا اس لیے تبدیل کرانے کی نوبت آئی اب جملہ اولاد اپنا حصہ طلب کرتے ہیں۔ والدین اللہ کے فضل سے حیات ہیں۔ آپ یہ تحریر فرمائیں کہ جملہ اولاد کا شرعی حصہ آتا ہے یا نہیں تاکہ شرعی فیصلہ ہو سکے۔ حضور اراضی ہبہ نہیں ہوئی بلکہ بیع ہوئی ہے اور اب قبلہ والد صاحب نے

ایک بیان حلفی بھی دیا ہے کہ میں جو دے چکا دے چکا۔

المستفتی: غلام شوکت قریشی ضلع ساہیوال۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

جہاں تک وراثت کی تقسیم کا تعلق ہے وہ میت کی وراثت تقسیم ہوتی ہے۔ زندہ انسان کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی۔ آپ زمین کی تقسیم کے متعلق سوال کر رہے ہیں۔ آپ کے والد صاحب زندہ ہیں تقسیم وراثت کا کیا مطلب ہے۔ والد اپنی زندگی میں اپنی اولاد سے ایک کو بخصوصہ ہبہ بھی کر سکتا ہے اور والد اپنے بیٹے کے ہاتھ بیع بھی کر سکتا ہے۔ جب والد نے ایک لڑکے کے نام اراضی بیع کر دی ہے تو وہی لڑکا اس کا مالک ہے۔ بھائیوں کا مطالبہ کسی طرح بھی تقسیم وراثت کا جائز نہیں ہے جبکہ والد زندہ ہے۔ بصورت مذکورہ میں تو والد مالک ہی نہیں رہا جب مالک ہی نہیں تو تقسیم کا کیا مطلب۔ اگر بالفرض ہوتا بھی تو پھر بھی والد کی زندگی میں وراثت کی تقسیم کا استحقاق ہی نہیں تھا۔ جو بھائی مطالبہ کرتے ہیں ان کا مطالبہ شرعاً درست نہیں ہے البتہ وہ بھائی جس کے نام زمین ہے اور جو مالک ہے وہ دوسرے بھائیوں پر احسان کرے۔ بطور ہبہ ان کو کچھ دے دے تو اس کی مرضی ہے ورنہ ان کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک عورت سکینہ بی بی فوت ہوئی اس نے ایک خاوند محمد[1] علی اور ایک ماں[2] حلیمہ بی بی اور دو بہنیں رشیدہ[3] بی بی اور غلام[4] فاطمہ چھوڑی ہیں اب ان کی وراثت کیسے تقسیم ہو گی۔

المستفتی: نذیر عالم
آزاد کشمیر

الجواب بعونہٖ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں قرض اور دیگر ما تقدم علی الارث کے بعد نصف خاوند کو ملے گا اور ایک حصہ ماں کو اور چار دونوں بہنوں کو ، اصل مسئلہ چھ سے بنے گا

مسئلہ ۶ عول شدہ ۸ سکینہ بی بی لیکن پھر عول ہو کر آٹھ سے ہوگا ۔ اب مال کے آٹھ حصے کر کے تقسیم کیے جائیں گے ۔ عول کا معنی یہ ہے :

ان یزاد علی المخرج من اجزائہ اذا ضاق عن فرض ۔

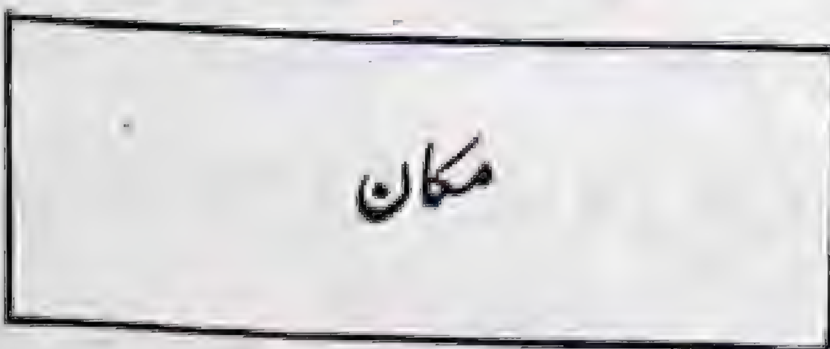
یعنی جب مخرج ادائے فرض سے تنگی کرے تو مخرج پر اس کے اجزاء سے کچھ زیادہ کیا جائے ۔

مطلب یہ کہ وارثوں کے حصے جب ملائے جائیں تو اس عدد سے بڑھ جائیں جس سے مسئلہ بنا تھا ۔ چونکہ صورت مسئولہ میں مسئلہ چھ سے بنا تھا اور وارثوں کے حصے ملائے گئے تو آٹھ ہو گئے ۔ اب مال کے کل آٹھ حصے کر کے تقسیم کر دیئے جائیں گے ۔ تین خاوند (محمد علی) کو دیئے جائیں گے اور ایک حصہ حلیماں کو ملے گا اور رشیدہ اور غلام فاطمہ کو چار حصے دیئے جائیں گے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب ۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک مکان دو بھائیوں کے نام ہے اور مندرجہ ذیل صورت میں وارث مذکور ہیں ؟



فوت ہو گیا — فوت ہو گیا

مولا بخش ولد الٰہہ بخش مرحوم — کرم بخش ولد الٰہہ بخش مرحوم

بیوہ مولا بخش — بیٹا عاشق — بیٹا خدا بخش — بیوہ کرم بخش — بیٹا — بیٹا — بیٹی — بیٹی — بیٹی

بیوہ مولا بخش فوت — انورہ بیٹی کرم بخش فوت

بیٹا عاشق — بیٹا خدا بخش — والدہ — بھائی — بھائی

بیوہ کرم بخش — منظور — یعقوب — وزیرہ — عزیزہ — بیٹا امجد

عاشق ولد مولا بخش فوت — بیوہ کرم بخش فوت

بیٹا امجد — بھائی خدا بخش — بیٹا منظور — بیٹا یعقوب — بیٹی وزیرہ — بیٹی عزیزہ — امجد ابن انو[رہ]

خدا بخش ولد مولا بخش فوت — یعقوب ولد کرم بخش فوت

بھائی عاشق کا بیٹا امجد صرف

بھائی منظور — بیوہ یعقوب — بہن وزیرہ — امجد ابن انورہ — بہن عزیزہ

مذکورہ صورت میں (۱) یعقوب کی اولاد نہیں ہے ، (۲) خدا بخش کی کوئی اولاد نہیں ہے (۳) امجد کا کوئی بھائی بہن نہیں ہے ۔ (۴) انورہ بیگم اپنے والد کرم کے فوت

ہونے کے بعد فوت ہوئی ہے۔

مرسلہ از دفتر انوار الصوفیہ کوٹ عثمان خاں قصور ضلع قصور۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مذکورہ میں جب کہ نصف مکان کا مالک مولا بخش ولد الٰہی بخش مرحوم تھا۔ مولا بخش کے تین وارث تھے۔ ایک اس کی عورت اور دو لڑکے (عاشق اور خدا بخش) عورت فوت ہوگئی اور خدا بخش بھی لاولد فوت ہوگیا۔ عاشق کا صرف لڑکا امجد موجود ہے اور امجد اب اس نصف حصہ کا مکمل وارث ہوگا اور دوسری صورت میں جہاں کرم بخش کی وراثت کی تقسیم کا تعلق ہے وہاں انورہ بنت کرم بخش کا بیٹا امجد اپنی والدہ کی وراثت کا وارث ہے کیونکہ انورہ بیگم اپنے باپ کی وفات کے بعد فوت ہوئی ہے لہٰذا اپنی والدہ کے حصہ کا وہ وارث ہے بعد میں جب بیوہ کرم بخش بھی فوت ہوگئی تو وارث منظور، یعقوب، وزیرہ اور عزیزہ رہے کرم بخش کی وراثت سے چار حصے منظور اور یعقوب کو ملیں گے اور دو حصے وزیرہ اور عزیزہ کو ملیں گے۔ مال کے کل چھ حصے ہوں گے۔

المیت ـــ ۶ ـــ متوفی کرم بخش

عزیزہ	وزیرہ	یعقوب	منظور
۱	۱	۲	۲

جس سے چار دونوں لڑکوں کو اور دو حصے دونوں لڑکیوں کو للذکر مثل حظ الانثیین کے ضابطہ اور قاعدہ سے اور انورہ کا جو بیٹا امجد ہے وہ یہاں پر محروم الارث ہے کیونکہ امجد یعقوب اور منظور کا بھانجہ ہے۔ منظور اور یعقوب کے ساتھ وہ وراثت میں شریک نہیں ہوگا، امجد اپنی ماں کا وارث ہوگا۔ اگر بیوہ کرم بخش کی وراثت بھی ہو تو پھر بھی امجد ابن انورہ کو کچھ نہیں ملے گا کیونکہ وہ بیوہ کرم بخش کا نواسہ ہے۔ بیوہ کرم بخش کی جب اولاد موجود ہے تو نواسہ محروم ہوگا۔ پھر صورت مسئولہ میں یعقوب ولد کرم بخش فوت ہوا ہے اپنے

اس کی بیوہ کو بشرطیکہ یعقوب کی اس سے کوئی اولاد نہیں ہے تو چوتھا حصہ ملے گا کیونکہ یہ ذوی الفروض سے ہے۔

ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد۔

یعنی عورتوں کے لیے چوتھا حصہ ہے جبکہ اولاد نہیں ہے۔

اب بیوہ یعقوب کو چوتھا حصہ ملے گا امجد کو یہاں بھی کچھ نہیں ملے گا کیونکہ یعقوب اس کا ماموں ہے اور امجد اس کا بھانجا ہے جو کہ محروم ہے۔ بیوہ یعقوب کو چوتھا حصہ دینے کے بعد اس کا بھائی منظور عصبہ ہے اس کے ساتھ اس کی بہنیں بھی عصبہ ہو جائیں گی۔

ومع الاخ لاب وام للذکر مثل حظ الانثیین یصرن به عصبة لاستوائهم فی القرابة الی المیت۔

یعنی ہمشیرگان اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدہ کے مطابق وراثت تقسیم ہو گی یہاں پر بھی امجد ابن انورہ کو کچھ نہیں ملے گا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

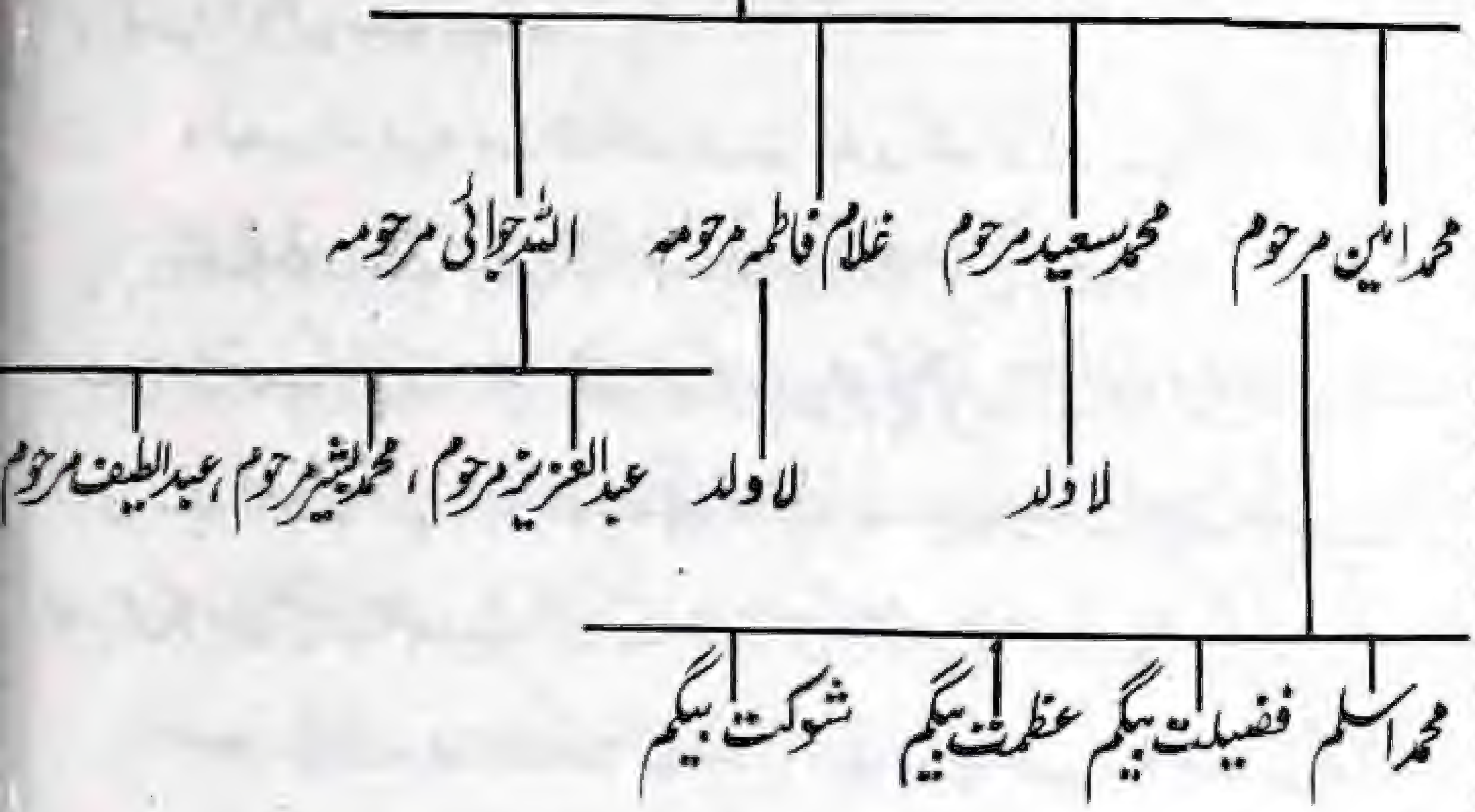
کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل صورت میں :

۱۔ مسماۃ اللہ جوائی مرحومہ، تین پسران (میاں عبداللطیف صاحب، میاں عبدالعزیز صاحب، میاں محمد بشیر صاحب)

۲۔ میاں محمد امین صاحب مرحوم، ایک پسر تین دختران (محمد اسلم، فضیلت بیگم، عظمت بیگم، شوکت بیگم)

۳۔ میاں محمد سعید صاحب مرحوم (لاولد)

۴۔ غلام فاطمہ مرحومہ (لاولد)



عبداللطیف اپنے ماموں و خالہ کی زندگی میں حیات تھے اور اپنی خالہ و ماموں کی وفات کے بعد بھی حیات تھے مگر اب وہ بھی وفات پا چکے ہیں۔ اب جو اصل مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم مسمی محمد سعید اور مسماۃ غلام فاطمہ کی جائیداد کا اصل وارث کون ہوگا جبکہ اس وقت ان کے قریبی رشتہ داروں میں ایک بھتیجا اور تین بھتیجیاں حیات ہیں جبکہ ایک بھانجہ ان دونوں کی زندگی میں حیات تھا۔ اب وہ بھی فوت ہو چکا ہے۔

محمد طاہر ریواز گارڈن لاہور

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں محمد اسلم بھتیجا چونکہ عصبہ ہے لہٰذا یہی وارث ہوگا۔ سراجی میں ہے :

ثم جزء ابیہ ای الاخوۃ ثم بنوھم

اور بھتیجیاں عصبہ نہیں ہیں بلکہ ذوی الارحام سے ہیں اور عصبہ وہ رشتہ دار ہیں جو کہ ذوی الفروض کی عدم موجودگی میں تمام ترکہ کے مالک ہوتے ہیں اور عصبہ کے ہوتے ہوئے ذوی الارحام

محروم ہوتے ہیں اور یہ بھتیجیاں ذوی الارحام سے ہیں۔

والصنف الثالث ینتمی الی ابوی المیت وھم اولاد الاخوات و بنات الاخوۃ و بنو الاخوۃ۔

یعنی وہ رشتہ دار جو میت کے والدین کی طرف منسوب ہوں مثلاً بہنوں کی اولاد بھانجے بھانجیاں اور بھائیوں کی بیٹیاں یعنی بھتیجیاں یہ ذوی الارحام سے ہیں۔ (سراجی ص ۸۵)

جب بھتیجیاں ذوی الارحام سے ہوئیں تو اب عصبہ کی موجودگی میں یہ محروم ہو جائیں گی اور یہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ بھی نہیں بن سکتیں۔ بھتیجا کے ساتھ بھتیجی عصبہ نہیں ہے۔ (ذکائیہ بحوالہ سراجیہ ص ۴۳)

ذوی الفروض وہ وارث ہیں جن کا حصہ قرآن میں مقرر کر دیا گیا ہے اور ذی رحم میت کا وہ رشتہ دار وارث ہے جو نہ ذی فرض ہو اور نہ عصبہ ہو۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں محمد اسلم مسمی محمد سعید اور مسماۃ غلام فاطمہ کا وارث ہوگا اور اس کی ہمشیرگان فضیلت بیگم، عظمت بیگم اور شوکت بیگم وارث نہیں ہوں گی لہٰذا کل جائیداد محمد اسلم لیگا۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ محمد اکرم فوت ہو گیا ہے اس کے قریبی وارثوں سے صرف دو ہی ہیں ایک باپ محمد دین اور ایک بیٹی حفیظاں بی بی اب محمد اکرم کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی۔

سائل محمد دین از شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں قرض اور دیگر ما تقدم علی الارث کے بعد نصف بیٹی حفیظاں بی بی کو دیا جائے گا اور ایک حصہ باپ کو ذوی الفروض ہونے کی وجہ سے اور دو رکھتے

عصبہ ہونے کی وجہ سے دیئے جائیں گے اور مسئلہ چھ سے بنے گا۔

المسئلہ ۶ — محمد اکرم

حفیظاں بی بی	محمد دین
۳	۳

اگر میت بیٹا یا پوتا چھوڑے تو باپ کو کل مال کا چھٹا حصہ ملتا ہے۔ اگر میت نے بیٹی چھوڑی ہے اور بیٹا کوئی نہیں چھوڑا تو باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور باپ عصبہ بھی ہوگا۔ صورت مذکورہ میں میت نے چونکہ بیٹی چھوڑی لہذا باپ عصبہ بن کر دو حصے بحیثیت عصبہ لے گا اور ایک حصہ ذوی الفروض ہونے کی حیثیت سے لے گا اور نصف یعنی تین حصے بیٹی (حفیظاں بی بی) لے گی۔ سراجی میں ہے:

الفرض المطلق وھو السدس وذالک مع الابن وابن الابن وان سفلت۔ (سراجی ص ۱۵)

الغرض تین حصے باپ لے گا اور تین حصے بیٹی لے جائے گی اور مسئلہ چھ سے ہوگا۔
واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل سوالات میں:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق نے سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا کو وراثت پدری (باغ فدک) سے محروم کر دیا تھا۔ حالانکہ قرآن پاک میں ہے:

یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔

اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق حکم فرماتے ہیں کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

اس آیت کریمہ کے لحاظ سے حضرت فاطمہ وارث تھیں لیکن ابوبکر نے ان کو

وراثت سے حصہ نہیں لینے دیا اور ابوبکر نے جو حضرت سیدہ کے سامنے حدیث پیش کی (لا نورث ما ترکنا ہ صدقۃ) اس کے راوی صرف ابوبکر ہیں جو ایک فریق کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور پھر یہ حدیث خبر واحد ہے جو کہ حجۃ نہیں ہے۔

۲۔ فدک مال فئی سے تھا اور اس میں حضور علیہ السّلام کا حصّہ تھا۔ حضرت سیدہ نے یہی طلب کیا تھا اور ابوبکر نے دینے سے انکار کیا۔

۳۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام اپنے والد داؤد علیہ السّلام کے وارث ہوئے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: و ورث سلیمان داؤد۔

اسی طرح حضرت زکریا علیہ السّلام نے دعا مانگی تھی کہ الٰہی مجھے ایک ولی عہد عطا فرما جو میرا وارث بنے۔

۴۔ جب باغ فدک حضور علیہ السّلام نے حضرت سیدہ کو ہبہ کر دیا تھا تو پھر ابوبکر نے حصّہ کیوں نہ دیا جب کہ حضرت فاطمہ نے علی اور ام ایمن کو بطور گواہ پیش کیا تو ابوبکر نے کہا ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی قبول نہیں ہوتی اور مقدمہ خارج کر دیا۔

اسی وجہ سے سیدہ فاطمہ ابوبکر کا جواب سن کر ناراض ہوگئیں اور جب تک زندہ رہیں ابوبکر سے کلام تک نہیں کی اور جب حضرت سیدہ کا انتقال ہوا تو جناب امیر علیہ السّلام نے جناب سیدہ کو رات کے وقت دفن کر دیا اور ابوبکر کو اطلاع بھی نہیں دی۔

ان تمام سوالات کے جوابات بمعہ حوالجات قرآن و حدیث سے تحریر فرمائیں۔

سید محمد سعید شاہ ۔ سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

۱۔ اصل سوال باغ فدک کے متعلق کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ شیعہ اور اہل السنّت کے درمیان مابہ النزاع ہے۔ فدک خیبر کے علاقہ میں یہودیوں کا ایک گاؤں تھا۔ ۷ھ میں نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس گاؤں کے باشندوں کو دعوت اسلام دی

انہوں نے مسلمان ہونے سے انکار کیا اور لڑائی بھی نہیں کر سکتے تھے لہٰذا فدک کی نصف زمین نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دے کر صلح کر لی اور جو چیز بغیر جنگ وقتال کے مسلمانوں کے ہاتھ لگے اس کو فئی کہتے ہیں۔ اگر جنگ سے حاصل ہو تو اسے غنیمت کہا جاتا ہے۔ باغ فدک مال فئی سے تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم فدک کی آمدنی اہل بیت کے نفقہ میں بھی صرف فرماتے تھے اور فقراء اور مساکین کو بھی دیتے تھے اس آمدنی سے مجاہدین کی امداد بھی فرماتے تھے اصحاب صفہ پر بھی اسی آمدنی سے خرچ کیا جاتا تھا۔ حضرت امیر المومنین امام المسلمین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں بھی اسی طرح کیا جیسا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو کرتے دیکھا۔

سائل نے جو قرآن پاک کی آیت پیش کی ہے اس آیۃ شریفہ میں خطاب امّت کو ہے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ امّت کے لیے یہ حکم ہے کہ لڑکے کو دوگنا حصہ دیا جائے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس حکم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ قرآن پاک میں متعدد ایسے مقامات ہیں کہ خطاب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہے مگر مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی امّت ہے اس آیت سے پہلے ہی یہ آیت ہے:

فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلث وربع۔

یعنی نکاح کرو عورتوں سے جن کو تم پسند کرتے ہو دو۲ یا تین۳ یا چار۴ تک۔

لیکن یہ حکم امت کے لیے ہے کیونکہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو چار سے زیادہ شادیاں کرنا بھی جائز تھا۔ اسی طرح اس کے بعد کی آیات تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ اور ومن یعص اللہ ورسولہ میں بھی امت ہی مراد ہے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مراد نہیں۔ اسی طرح لا تبطلوا اعمالکم وتقطعوا ارحامکم وغیرہ وغیرہ

اس آیت سے حضرت سیدہ علیہا السلام کے لیے وراثت ثابت نہیں ہوتی حضرت سیدہ اور حضرت عباس جب میراث طلب کرنے کے لیے آئے حضرت سیدہ نے فدک کا مطالبہ کیا اور حضرت عباس نے سہم خیبر کا تو اس کے جواب میں حضرت ابوبکر نے کہا:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا نورث ما ترکناہ صدقۃ انما یأکل آل محمد من ھذا المال۔

ہمارا (انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہے ہاں آل محمد اس سے کھائیں گے۔

پھر ابوبکر نے کہا بخدا جو کام میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے اس کو ترک نہیں کروں گا (بخاری)

اس حدیث نے وضاحت کردی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت اس طرح نہیں ہے جیسا کہ امت کی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم میں امت سے مستثنیٰ ہیں اور یوصیکم اللہ کے خطاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام داخل نہیں ہیں بلکہ شیعہ حضرات خود اس آیت میں تخصیص کے قائل ہیں اور کتب فقہ شیعہ میں مانع ارث بیس تک شمار کیے گئے ہیں۔ جب آیت کریمہ مخصوص البعض ہے تو پھر یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل نہیں ہوگا اور اس آیت سے سائل کا حصہ وراثت نبوی پر استدلال صحیح نہیں ہے اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق نے جب حدیث لا نورث ما ترکناہ صدقۃ پیش کی تو حضرت فاطمہ نے دوبارہ مطالبہ نہیں کیا۔

سوال میں جو یہ کہا گیا ہے کہ حدیث کے راوی صرف حضرت ابوبکر ہیں یہ بھی صحیح نہیں بلکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علاوہ اکابر صحابہ [illegible]

جن میں حضرت علی، عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت عباس، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف طلحہ بن عبداللہ، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص، ابوہریرہ، حضرت عائشہ اور حضرت حذیفہ المتوفی ۳۶ھ اور حضرت ابوالدرداء المتوفی ۳۲ھ رضی اللہ عنہم اجمعین پھر اس حدیث کو کتب شیعہ معتمدہ میں بیان کیا گیا ہے۔

اصول کافی باب العلم والتعلم میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن اورثوا العلم فمن اخذہ منہ اخذہ بحظ وافر۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور تحقیق انبیاء کسی شخص کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے پس جس نے علم دین حاصل کیا اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔

ایک اور روایت صاحب اصول کافی نے باب صنعت العلم میں بیان کی ہے۔ جو شیعہ قول کے مطابق زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس روایت کے تمام راوی شیعہ ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان العلماء ورثۃ الانبیاء لم یورثوا درھما ولا دینار او انما اورثوا احادیث من احادیثھم فمن اخذہ بشئی منھا فقد اخذ حظاً وافراً۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ انبیاء نے کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بنایا انہوں نے تو صرف شریعت کی باتوں کا وارث بنایا تو جس کسی نے ان دین کی باتوں کو حاصل کیا اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔

معلوم ہوا کہ انبیاء کی وراثت صرف دین اور شریعت ہے اور پھر اس میں کلمہ انما حصر کا مفید ہے۔ مطلب یہ بنے گا کہ انبیاء کی وراثت صرف اور صرف

شریعت اور دین ہے دنیاوی مال نہیں ہے۔

ثابت ہوا کہ یوصیکم اللہ میں وراثت مالی کا ذکر ہے جو انبیاء کی نہیں ہوتی لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اس آیت کریمہ میں داخل نہیں ہیں۔ اس آیت شریفہ سے تقسیم وراثت نبوی پر دلیل پکڑنی صحیح نہیں ہے اور حدیث ابوبکر نے اس کی تشریح اور وضاحت کر دی ہے کہ حضور علیہ السلام کی وراثت دنیاوی مال نہیں ہے بلکہ علم اور دین شریعت ہے۔ لہٰذا حضور کی وراثت کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسی لیے تو سیّدہ نے حدیث ابوبکر سن کر دوبارہ وراثت کا مطالبہ ہی نہیں کیا اور سائل کا یہ کہنا کہ یہ حدیث (ابوبکر) خبر واحد ہے اور خبر واحد قابل حجۃ نہیں ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ خبر واحد قابل حجۃ ہے پھر اس حدیث کو ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی الرازی المتوفی ۳۲۲ھ اصول کافی میں بیان کر رہے ہیں اور اصول کافی تو امام غائب علیہ السلام کی تائید و تصدیق شدہ کتاب ہے اور اصول کافی کی تمام حدیثیں صحیح ہیں جس سے شیعہ انکار ہی نہیں کر سکتے اور ایک جماعت صحابہ کی بھی اس کو روایت کر رہی ہے لہٰذا یہ حدیث متواتر المعنی کم از کم مشہور تو ضرور ہے اور خبر مشہور سے قرآن پر زیادتی بھی جائز ہے اور یہ حدیث ابوبکر نے خود نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنی تھی۔ ابوبکر پر واجب تھا کہ اس پر عمل کرتے لہٰذا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر عمل کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ حدیث متواتر سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی متواتر اور غیر متواتر کی تقسیم تو ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا نہیں ہے۔ حضرت صدّیق اکبر نے تو یہ حدیث خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنی تھی ان کے لیے یہ متواتر سے بھی زیادہ اہم تھی لہٰذا آپ نے اس حدیث کے مطابق فیصلہ کر دیا بہرکیف حدیث صحیح ہے اور آیت عام مخصوص البعض ہے اور آیت کریمہ کے حکم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم داخل نہیں ہیں۔

۱۲۔ سائل نے جب باغ فدک کو فئی ہونا تسلیم کر لیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے جیسا کہ

ہم نے جواب نمبر ۱ میں ذکر کیا ہے کہ فدک مال فئی سے تھا تو اب بات بالکل صاف ہے تو مال فئی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا اور فئی کے مصارف خود قرآن نے بیان کئے ہیں

ما آفاء اللّٰہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللّٰہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل ۔

جو عطا کرے دے اللہ (بغیر جنگ کے) اپنے رسول کو گاؤں والوں سے تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے ہے اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسافروں کیلئے ہے ۔

یہ آیت خود ہی بتا رہی ہے کہ مال فئی وقف ہوتا ہے کسی کی ملکیت نہیں ہوتا اس کا متولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بنایا گیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس آمدنی کو یتیموں، مسکینوں، محتاجوں اور رشتہ داروں پر صرف فرمائیں، حضور علیہ السلام اس کے متولی تھے اور یہ مال وقف تھا اور مال وقف میں میراث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر یہ مال ملکیت میں شمار ہوتا تو یتیموں، مسافروں اور محتاجوں کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا ۔ اگر اس سے حضور علیہ السلام کی ملکیت ثابت ہو تو پھر یتیموں اور مسکینوں کی بھی ملکیت ثابت ہو گی ۔

معلوم ہوا کہ ملکیت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم متولی ہیں اور آپ کو کلی طور پر اختیار دیا گیا کہ وہ مصارف پر تقسیم فرمائیں ۔

۲۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جو حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے ہیں اس سے وراثت فی العلم والنبوہ مراد ہے ۔ مال متروکہ کی وراثت مراد نہیں ہے کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس صاحبزادے تھے ۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی وراثت میں وہ تمام شریک تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی کیا تخصیص تھی ۔ کیا اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے دوسرے لڑکوں کو محروم کر دیا تھا ۔ جب وہ محروم نہیں تھے تو پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کا خصوصی ذکر وراثت فی المال میں نہیں تھا بلکہ وراثت فی العلم والنبوت مراد ہے اس سے مطالبہ فدک پر استدلال کرنا غلط

ہے علاوہ ازیں وراثت مالی کا ذکر کرنا حضرت سلیمان علیہ السّلام کے لیے بھی قابل تذکرہ بات نہیں ہے یہ تو ایک معمولی بات ہے جس کو ہر آدمی سمجھتا ہے۔ ہر باپ کی مالی وراثت اس کی اولاد کو ملتی ہے اور حضرت زکریا علیہ السّلام کا اپنے ولی عہد (یحییٰ علیہ السلام) کے لیے وراثت مالی کے لیے دعا کرنا یہ بھی اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ صرف اپنی وراثت کا ذکر کرتے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے تمام اولاد یعقوب کا وارث تو نہیں ہونا تھا۔ آل یعقوب کے وارث ان کے بیٹے تھے نہ کہ یحییٰ علیہ السّلام تمام کے وارث تھے بلکہ یہاں بھی وراثت فی العلم والنبوت مراد ہے لہٰذا اس سے یہاں شیعہ کا استدلال کرنا بھی غلط ہے۔ وراثت کا مسئلہ انبیاء کے ترکہ میں جاری نہیں ہوتا حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السّلام کے لیے فرمایا:

ان ھٰذا لھو الفضل المبین۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مراد اس سے نبوت ہے۔ مالی وراثت مراد نہیں ہے۔ (تفسیر صافی ج ۲ صـ ۲۳) اصول کافی میں ہے:

قال ابو عبد اللہ ان داؤد ورث علم الانبیاء وان سلیمان ورث داؤد وان محمدؐ اورث سلیمان وانا ورثنا محمدؐ ا۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد انبیاء کے وارث ہوئے اور سلیمان داؤد کے اور محمد سلیمان کے وارث ہوئے اور ہم لوگ محمد صلی اللہ علیہ [illegible] کے وارث ہوئے معلوم ہوا وراثت سے مراد علم و نبوت ہے۔

۴۔ سائل نے جو فدک کے [illegible] متعلق کہا ہے یہ ایک [illegible] اختلافی اور [illegible] اس میں [illegible] بھی [illegible] نہیں ہے۔ کتب اہل السنت [illegible] میں ایسی صحیح روایت نہیں ہے کہ خاتون جنت نے ہبہ یا [illegible] کا دعویٰ کیا ہو البتہ مشکوٰۃ میں یہ روایت موجود ہے: وان فاطمۃ سئالت ان [illegible]

اور سیدہ فاطمہ نے جب یہ سوال کیا کہ حضور انہیں فدک عطا فرمائیں تو حضور [illegible]

اللہ علیہ وسلم نے انکار کر دیا اور اگر شیعہ اپنی کتب سے باغ فدک کا ہبہ ہونا ثابت کریں تو اس کے جواب کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے اور نہ ہی شیعہ کے اقوال اہل السنّت پر حجت ہیں۔

ابن الحدید شرح نہج البلاغہ میں ہے کہ سیدہ نے جب فدک کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکر نے کہا:

سیّدہ! تم میرے نزدیک صادقہ اور امینہ ہو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے باغ فدک کے معاملہ میں آپ کے ساتھ وعدہ کیا ہے تو اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں اور فدک تمہارے حوالہ کرتا ہوں تو سیدہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے میرے ساتھ باغ فدک کے معاملہ میں کوئی عہد نہیں فرمایا۔

اس روایت سے ثابت ہوگیا کہ فدک ہبہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو شیعہ کی خود ساختہ داستان ہے۔ اگر ہبہ یا وصیّت ہوتی تو سیّدہ فرما دیتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے ہبہ کر دیا ہے۔ پھر سائل نے جو یہ کہا ہے کہ حضرت ابوبکر صدّیق نے حضرت علی اور ام ایمن کی گواہی کو مسترد کر دیا چونکہ ہبہ نہیں تھا اور نہ ہی ہبہ پر گواہ پیش ہوئے یہ تمام غلط واقعہ ہے۔ اگر بالفرض والتقدیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو نصاب شہادت دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ جب نصاب شہادت مکمل ہی نہیں تھا تو اس کو شرعاً مسترد ہی کرنا تھا۔ پھر جب نص قطعی سے ثابت ہے کہ گواہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں تو حضرت سیدہ فاطمہ کا ایک مرد اور ایک عورت کو گواہ پیش کرنا نصاب شہادت کے خلاف ہے لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مجبور تھے کہ وہ قرآن پاک اور سنّت رسول کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ ابوبکر صدّیق نے قرآن اور سنّت کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ نصاب شہادت کے مطابق گواہ پیش نہ کرنے پر بھی ضعف روایت پر درایت کے لحاظ سے دلالت قوی ہے۔ ہبہ میں

قبضہ بھی ضروری ہے جب تک موہوب پر موہوب لہ کا قبضہ نہ ہو جائے اس وقت تک ہبہ تمام نہیں ہوتا۔ فدک پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قبضہ رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمہ کو قبضہ نہیں دیا بلکہ انکار فرمایا جیسا کہ اہل تشیع کی روایات کے حوالہ سے بھی گذر چکا ہے اور سائل نے جو یہ کہا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ فوت ہونے تک ابوبکر پر ناراض رہی ہیں یہ بھی حضرت سیدہ کی کلام نہیں ہے بلکہ راوی نے اپنا تاثر بیان کیا ہے۔ ناراضگی تو ایک قلبی فعل ہے جس کے متعلق اظہار لسانی طور پر ضروری ہے۔ فدک کا ذکر کتب احادیث اہل السنت میں چودہ مقامات پر ہوا ہے صرف چار مقامات پر راوی نے اپنی طرف سے تذکرہ ناراضگی کا بیان کیا ہے دس مقامات میں ذکر نہیں کیا گیا۔ علی طریق تسلیم ہم کہتے ہیں کہ کتب شیعہ میں موجود ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئی تھیں۔

شرح نہج البلاغہ علامہ ابن میثم میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ باغ فدک میں وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے فرضیت بذالك تو حضرت سیدہ راضی ہو گئیں اور فدک میں اسی پر عمل کرنے کو ابوبکر سے عہد لیا اور حضرت ابوبکر صدیق فدک کی پیداوار کو لیتے تھے اور جتنا اہل بیت پر خرچ ہوتا تھا ان کی خدمت میں بھیج دیتے تھے۔

معلوم ہوا کہ حضرت سیدہ علیہا السلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے راضی تھیں اور سائل کا یہ کہنا کہ ابوبکر نے سیدہ کے جنازہ میں شرکت نہیں کی یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ کتب صحاح ستہ میں بلکہ اہل السنت والجماعت کی کسی معتبر کتاب میں کسی بھی روایت میں یہ ثابت نہیں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ کا جنازہ نہیں پڑھا البتہ طبقات ابن سعد (مصنفہ محمد بن سعد بن منیع زہری المتوفی ۲۳۰ھ) میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جنازہ

پڑھا اور چار تکبیریں کہیں یعنی صلی ابوبکر الصدیق علی فاطمة بنت رسول اللہ وکبّر علیہا اربعًا۔

ملّا باقر مجلسی جو کہ شیعہ کے عظیم مجتہد ہیں کہتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ صرف سات آدمیوں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھی جن میں ابوذر[1]، سلمان فارسی، حذیفہ، عبداللہ بن مسعود، مقداد[2] ومن امام ایشاں بودم۔ کہ میں ان کا امام تھا اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ جنازہ میں صرف سات آدمی شریک ہوئے ہیں ان میں حضرت امام حسن علیہ السلام و امام حسین علیہ السلام و حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی نہیں تھے کیا حضرت سیدہ ان سے بھی ناراض تھیں، گویا کہ سائل نے جو ناراضگی جنازہ میں عدم شرکت کی وجہ سے سمجھی ہے بھی غلط ہے۔ لازم آئے گا کہ حضرت سیدہ علیہا السلام اپنے پیارے بیٹوں حضرت حسن علیہ السلام و امام حسین علیہ السلام سے بھی ناراض ہوں، باوجودیکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس کو جناب سیدہ کی خدمت کے لیے چھوڑ دیا تھا اور سیدہ کی تیمارداری کی تمام خدمات وہی انجام دیتی رہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت اسماء بنت عمیس کے ساتھ حضرت علی نے نکاح کیا تھا۔ الغرض حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق سے راضی تھیں اور ابوبکر نے مسئلہ فدک میں سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق فیصلہ کیا تھا اور حضرت سیدہ علیہا السلام نے اس کو تسلیم بھی کر لیا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ہی حضرت ابوبکر کو سیدہ کی وفات کے متعلق مطلع کر دیا تھا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

---

[1] ابوذر غفاری المتوفی ۳۲ھ ۱۲

[2] حضرت مقداد بن اسود کندی رضی اللہ عنہ المتوفی ۳۳ھ ۱۲

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی محمد شریف فوت ہوا اس نے مندرجہ ذیل وارث چھوڑے ہیں۔ ایک باپ غلام حسین ایک ماں شریفاں بی بی دو بھائی محمد اسلم اور محمد اکرم چھوڑے ہیں ان کی وراثت تقسیم کس طرح ہوگی۔ شرعی حکم تحریر کیا جائے۔

منگلا کالونی

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں قرض اور دیگر ماتقدم علی الارث کے بعد دونوں بھائی محروم ہیں کیونکہ میت کے باپ کے ہوتے ہوئے میت کے بھائیوں کو کچھ نہیں ملتا بھائی محروم ہوجاتے ہیں۔ اصل مسئلہ چھ سے بنے گا

المیـ	۶	المتوفی محمد شریف	
باپ	ماں	بھائی	بھائی
۵	۱	محروم	محروم

باپ کو پانچ حصے ملیں گے اور ماں کو ایک حصہ۔ اگر بھائی نہ ہوتے تو ماں کو کل مال کا تہائی حصہ ملنا تھا لیکن ان دونوں بھائیوں نے اگرچہ خود محروم ہیں لیکن ماں کا حصہ کم کر دیا ہے اور اب ان بھائیوں کی وجہ سے ماں شریفاں بی بی کو چھٹا حصہ ملے گا۔ سراجی میں ہے:

فانہما لا یرثان مع الاب ولکن یحجبان الام من الثلث الی السدس۔

کہ بھائی خود تو وارث موجودگی باپ میں نہیں ہو سکتے لیکن ماں کو ثلث (تہائی حصہ) سے محروم کر کے چھٹا حصہ دلائیں گے یعنی ماں کو تہائی کی بجائے چھٹا حصہ ملے گا۔

بہر کیف صورت مسئولہ میں دونوں بھائی محمد اسلم اور محمد اکرم محروم ہوں گے۔ باپ کی موجودگی میں میت کے بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ پانچ حصے والد لے جائیگا اور ایک حصہ ماں کو ملے گا۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ کشور سلطانہ کا نکاح ہادی نواز ش سے کیا گیا اس کے والدین نے کشور سلطانہ کو جہیز میں تمام سامان دیا اور ہادی نوازش کی بیوی کشور سلطانہ بعد میں فوت ہوگئی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کشور سلطانہ کے سامان اور زیور کا وارث کون ہوگا۔ مندرجہ ذیل وارث موجود ہیں :

ہادی نوازش اور اس کی بیوی کشور سلطانہ کے والدین شرعی فیصلہ تحریر کیا جائے۔

اعجاز احمد ساکن بوبک مرالی ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں بعد از وضع مصارف تجہیز و تکفین و ادائے دیون و اجراء وصیت وغیرہ جبکہ میت کی کوئی اولاد نہیں ہے تو اس کے خاوند ہادی نوازش کو نصف مال دیا جائیگا قرآن پاک میں ہے:

ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم یکن لھن ولد۔

اگر عورت کی اولاد نہ ہو تو پھر خاوند کو تمام مال سے نصف ملے گا اور کل مال کے چھ حصے کیے جائیں گے۔ تین نوازش ہادی لے گا اور دو کشور سلطانہ کے والد کو دیئے جائیں گے اور ایک حصہ کشور سلطانہ کی والدہ کو۔

المیت ۶ کشور سلطانہ

خاوند	باپ	ماں
۳	۲	۱

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

ضمیمہ فتاویٰ جماعتیہ

مفتی غلام رسول

دارالعلوم نقشبندیہ

علی پور شریف ضلع سیالکوٹ

ضمیمہ فتاویٰ جماعتیہ

جناب محترم امجد علی صاحب چشتی ایم اے ڈائریکٹر مکتبہ شرکت حنفیہ لمٹیڈ گنج بخش روڈ لاہور نے جب فتاویٰ جماعتیہ حصہ اول کی کتابت مکمل کروالی تو محترم جناب رانا شبیر احمد خان صاحب (ملتان) فرمانے لگے کہ فتاویٰ جماعتیہ حصہ اوّل کے ساتھ ہی دو استفتاء (ایک مسئلہ رجم اور دوسرا مالک اراضی کی رضامندی کے بغیر اس سے اراضی کا حاصل کرنا) ضرور شامل کریں، میں نے عرض کیا کہ حصہ اول کی کتابت تو مکمل ہو چکی ہے، تو حضرت عالی جناب صاحبزادہ پیر سید منور حسین شاہ صاحب مدظلہ العالی فرمانے لگے کہ بطور ضمیمہ ان مسائل کو فتاویٰ جماعتیہ حصہ اول میں شامل کر لیا جائے لہٰذا چند استفتاء اور ان کے جوابات (بلا ترتیب الواب) فتاویٰ جماعتیہ حصہ اول کے ساتھ منسلک کر دیئے ہیں۔

مفتی، غلام رسول

علی پور شریف، ضلع سیالکوٹ

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ بندہ نے سنا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے قسطنطنیہ فتح کیا وہ جنتی ہوگا اور یہ پڑھا ہے کہ سب سے پہلے جو لشکر حملہ آور ہوا تھا اس کا سپہ سالار یزید بن معاویہ تھا التماس ہے جو حدیث مبارک صحیح ہے وہ تحریر فرماویں اور اس حدیث کا راوی کون ہے اور یہ حدیث کس باب اور کس صفحہ پر ہے۔

محمد رشید ٹھیکیدار چانگانوالی مشرقی جلالپور جٹاں ضلع گجرات

الجواب بعونہ تعالیٰ

جس حدیث کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے وہ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح البخاری باب الجہاد صفحہ ۴۰۹ میں ذکر کی ہے۔ اس حدیث کے راوی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لشکر رومیوں کے ساتھ جہاد کرے گا وہ مغفور لہم ہے۔ یعنی ان کو مغفرت کی بشارت ہے۔ اس حدیث میں یزید کا لفظ تک نہیں ہے البتہ امام بدرالدین عینی شارح بخاری لکھتے ہیں کہ یہ لشکر قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھیجا تھا۔ اور امیر لشکر سفیان بن عوف تھے یزید نہیں تھا اور اس لشکر میں حضرت ابن عباسؓ، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ابن زبیرؓ ابو ایوب انصاری بھی تھے ان اکابر صحابہؓ کا یزید کیسے سردار بن سکتا تھا علامہ عینی فرماتے ہیں۔ قلت الاظہر ان ھؤلاء السادات من الصحابۃ کانوا مع سفیان ھذا ولم یکونوا مع یزید بن معاویہ میں کہتا ہوں کہ بہت ظاہر یہی ہے کہ یہ کبار صحابہ سفیان بن عوف کے ساتھ تھے یزید بن معاویہ کے ساتھ نہیں تھے۔ اور نہ ہی یزید ان کا سپہ سالار تھا اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یزید اس لشکر میں موجود تھا تو پھر بھی یزید اس بشارت عظمیٰ (مغفور لھم) سے خارج ہے جیسے کہ وہ لوگ خارج ہیں جو کہ اس جنگ میں

شامل ہوئے لیکن بعد میں انہوں نے ارتداد کیا تھا لہٰذا یہ حدیث مقید ہے بایں معنے کہ ان کے لئے مغفرت ہے جو کہ ایمان پر فوت ہوئے، (عمدۃ القاری ص ۶۴۹ ج ۶) امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے یزید کو کافر کہا ہے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی فرماتے ہیں لرکز یزید بدین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ یزید نے دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر کیا (تفسیر مظہری ص ۲۲) قاضی ابو یعلیٰ اور ابن جوزی، یزید کو ملعون کہتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی شخص نے یزید کو امیر المومنین کہا تو عمر بن عبد العزیز نے اسے کوڑے لگوائے (نبراس ص ۵۵۱) علامہ تفتازانی شرح عقائد میں لکھتے ہیں لعنۃ اللہ علیہ وعلی انصارہ واعوانہ کہ اللہ کی لعنت ہو اس پر اور اس کے مددگاروں پر، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ علماء اہلسنت کا اس پر اتفاق واجماع ہے کہ یزید فاسق اور فاجر تھا، اور گناہ کبیرہ کرنے پر جسارت کرتا تھا (عرفان شریعت ص ۲۱) جب یزید فاسق اور فاجر اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ وغیرہ کے نزدیک کافر اور ملعون ہے تو پھر اس کو جنتی کہنا یا اس کے لئے مغفرت ثابت کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، فاسق اور فاجر کی تعریف بھی شرعاً منع ہے، چہ جائیکہ جب بعض ائمہ کرام بالخصوص امام احمد بن حنبل یزید کو کافر کہہ رہے ہیں پھر اس کی تعریف کہاں صحیح ہوگی، بہر صورت یزید کی تعریف اور اس کو جنتی وغیرہ نہیں کہنا چاہیئے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب،

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین وفقیہان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قریباً آٹھ مرلے جگہ عرصہ پندرہ سال سے (نقشہ الف سے ظاہر ہے) مسجد کے لئے وقف کی گئی ہے اب وہاں عارضی طور پر مسجد کا ایک کمرہ تعمیر کیا ہوا ہے جس میں قریباً اڑھائی سال سے نماز پنجگانہ با جماعت اور جمعہ باقاعدگی سے ادا کیا جارہا ہے ب رقبہ کو مدرسہ کے لئے رکھا گیا ہے، مسجد

کو وسعت دینے کے لئے ج پلاٹس کے مالکان سے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی جو
بار آور ثابت نہیں ہوئی دوسری سائڈ پہ مدرسہ کی جگہ ہے اور باقی دو طرف گلیاں ہیں اب
اگر مسجد کو مدرسہ والی جگہ میں منتقل کیا جائے اور موجودہ مسجد کی جگہ مدرسہ بنا دیا جائے تو کیا یہ
جائز ہے؟ ایسا کرنا مسجد کو وسیع کرنے کے لئے ضروری ہے نیز مسجد یا مدرسہ کی رقم کو بڑھانے
کے لئے کسی نفع بخش کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

نقشہ

گلی ۱۱

کمرہ مسجد

مسجد ۱۵۰ x ۴۵

ج فروخت شدہ پلاٹس

گلی ۱۵

مدرسہ کے لئے

ب

۱۲۰

(۳۳

گلی

گلی

گلی

گلی

سائل

الحاج رانا محمد علی خاں

مکان نمبر ۸ ۵ ۴ ۴ بلاک نمبر ۴

بھلوال سرگودھا

الجواب

صورت مسئولہ میں جو مسجد بنائی گئی ہے وہ مسجد ہی رہے گی اس کو مدرسہ کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔ وقال ابو یوسف ھو مسجد ابداً الیٰ قیام الساعۃ لایعود میراثا ولایجوز نقلہ ونقل مالہ الی مسجد آخر سواء کان یصلون فیہ اولا یصلون وعلیہ الفتوی کذا فی الحاوی القدسی اگر مسجد کو وسیع کرنا ضروری ہے تو اس پلاٹ کو ہی ساتھ ملایا جائے اگر وہ آدمی نہیں دیتا جو زمین مسجد کے ساتھ ملحق ہے تو اس کو واجبی قیمت دے کر جبراً اس سے لی جائے اور مسجد کو وسیع کر لیا جائے یہ نہیں ہو سکتا کہ مسجد کو مدرسہ کی طرف منتقل کیا جائے البتہ مسجد کی طرف مدرسہ کی زمین منتقل ہو سکتی ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے اگر مسجد کے ساتھ کوئی وقف شدہ زمین ہے اگرچہ وہ مسجد کے نام پر وقف نہ ہو بلکہ دیگر وقف ہے تو اس کو مسجد میں شامل کر لینا جائز ہے۔ لیکن مسجد کو منتقل کرنا جائز نہیں وہ قیامت تک مسجد ہے (مجموعہ فتاوی صہ ۲۷۳)

اور مسجد کی آمدن سے دکان یا مکان خرید کرنا کہ اس کی آمدن مسجد پر ہی صرف ہو گی یہ جائز ہے لیکن مسجد کی رقم سے تجارت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ تجارت میں نقصان کا اندیشہ ہے اسی طرح وقف شدہ رقم مدرسہ کے لئے جو ہے اس سے بھی تجارت نہ کی جائے۔ البتہ اگر وقف کرنے والے نے خود اپنی رقم کسی دکان میں لگا دی ہے اور کہا ہے کہ اس کا نفع مدرسہ میں لگتا رہے تو یہ صورت جائز ہے بہر صورت مذکورہ صورت میں مسجد منتقل نہیں ہو سکتی۔ قیامت تک وہ مسجد ہی رہے گی اس میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں ہے اسی طرح وقف رقم کے ساتھ تجارت بھی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ وقف کے مال میں نقصان کا احتمال ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ سید زادی کا نکاح غیر سید کے ساتھ کیسا ہے اور اگر جائز نہیں تو اعلحضرت نے جو جائز لکھا ہے تو اس کا کیا جواب ہے؟

(سائل عبدالغنی ایسپائے) ڈنمارک

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں سیدزادی کا نکاح غیر سید کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ سیدزادی کا غیر سید کفوٴ نہیں ہے اور غیر کفوٴ میں نکاح منعقد نہیں ہوتا فقہاء کرام فرماتے ہیں و روی الحسن عن ابی حنیفتہ عدم جوازہ ای عدم جواز النکاح من غیر کفوٴ وعلیہ فتویٰ قاضی خان قال السرخسی هذا اقرب الی الاحتیاط۔ حضرت حسن بن زیاد نے (المتوفی ۲۰۴ھ) امام ابوحنیفہ (المتوفی ۱۵۰ھ) سے روایت کی ہے کہ غیر کفوٴ میں نکاح منعقد نہیں ہو سکتا قاضی خان (المتوفی ۵۹۳ھ) نے اس کو ہی مفتی بہ کہا ہے شمس الائمۂ سرخسی (المتوفی ۴۹۰ھ) نے فرمایا کہ یہی محتاط اور معتبر ہے کہ غیر کفوٴ میں نکاح نہیں ہو سکتا، علامہ ابن ہمام (المتوفی ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں والعجمی لا یکون کفواً للعربیۃ ولو کان العجمی عالما او سلطانا وھو الاصح (فتح القدیر، شرح وقایہ) عجمی (غیر عرب) کسی عرب عورت کا ہم کفوٴ نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ عجمی عالم اور بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی زیادہ صحیح ہے امام طحطاوی (المتوفی ۱۲۳۱ھ) الاصح ان ذا الجاہ کالسلطان والعالم لا یکون کفواً للعلویۃ بہت صحیح یہ ہے کہ بلند مرتبہ جیسا کہ بادشاہ اور عالم یہ علویہ کے لئے ہم کفوٴ نہیں بن سکتا۔ حافظ ابن حجر مکیؒ (المتوفی ۹۷۳ھ) لکھتے ہیں من خصائصہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اولاد بناتہ صلی اللہ علیہ وسلم ینسبون الیہ لا یکافئہ احد فلا یکافئ من انتسب الا من انتسب الیہ فالعباسی مثلاً لیس کفواً للشریفۃ وان کان من بنی ہاشم فیخص بذالک اطلاقھم ان بنی ہاشم والمطلب اکفاء، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص کریمہ میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کی بیٹیوں کی اولاد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بحیثیت نسب منسوب ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی کفوٴ اور ہم مثل نہیں ہے۔ آپؐ کی اولاد کا بھی کوئی کفوٴ نہیں ہوگا مگر وہی جو کہ آپ کی نسب عترت میں سے ہو پس مثلاً عباسی۔ سیدہ کے لئے کفوٴ نہیں ہوگا، اگرچہ دونوں بنی ہاشم سے ہیں تو اس (ضابطہ) سے اس قول کی تخصیص کی جائے گی کہ بنی ہاشم و بنی مطلب ایک ہی ہیں، یعنی کفوٴ میں ایک نہیں بلکہ مال غنیمت وغیرہ میں ایک

ہیں علامہ ابن حجر مکّی کی کلام کا مفاد اور مفہوم یہ ہے کہ عباسی اور سیّدہ ایک دوسرے کے ہم کفوء نہیں ہو سکتے اگرچہ دونوں بنی ہاشم سے ہیں جہاں فقہاء نے یہ بیان کیا ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صدقات اور مال غنیمت وغیرہ میں ایک ہیں نہ کہ کفوء میں ایک ہیں جب کفوء میں ایک نہ ہوئے تو پھر عباسی مرد کا نکاح سیّدہ سے نہیں ہو سکے گا۔ جب عرب، قریش، بنی ہاشم بنی عباس۔ علوی۔ غیر فاطمی۔ سیّدہ کے لئے کفوء نہیں بن سکتے، تو عالم۔ پٹھان۔ مغل۔ عجمی کیسے سیّدہ کے لئے ہم کفوء بن سکتے ہیں۔ سیّدہ کے لئے فاطمی سیّد ہی کفوء بنے گا۔ اگر کسی غیر سیّد نے سیّدہ کے ساتھ نکاح کیا تو وہ بالکلیہ منعقد ہی نہیں ہو گا۔ حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خان فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ المتوفی (۱۳۴۰ھ) فتاویٰ رضویہ میں فرماتے ہیں کہ صاحب در مختار (محمد بن علی علاؤ الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں الکفاءۃ تعتبر فی العرب والعجم دیانتہ، یعنی عرب وعجم میں دیانت کے لحاظ سے کفوء کا اعتبار کیا گیا ہے تنویر الابصار میں ہے یفتی فی غیر الکفوء بعدم جوازہ اصلاً وھو المختار للفتویٰ لفساد الزمان۔ غیر کفوء میں نکاح کے عدم جواز کا بالکلیہ فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ فساد زمانہ کی وجہ سے یہی مختار اور قابل فتویٰ ہے فتاویٰ رضویہ میں ہی لکھتے ہیں کہ نکاح غیر کفوء میں باطل محض ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کلام سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح غیر کفوء میں باطل محض ہے لہٰذا سیّد زادی کا نکاح غیر سیّد سے ہرگز منعقد نہیں ہو گا، اور سائل کا یہ کہنا کہ اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے کہ مغل پٹھان کا سیّد زادی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مفتیٰ بہ قول نہیں ہے بلکہ یہ عبارت الحاقی ہے اسی لئے اس کے ساتھ کوئی دلیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہٗ ایسے مسائل میں دلائل بیان کرتے ہیں جب کوئی دلیل بیان نہیں کی گئی تو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا یہی قول معتبر ہو گا کہ نکاح غیر کفوء میں باطل محض ہے، خواجہ خواجگان علامہ زمان سیّد پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ مہریہ میں تحریر فرماتے ہیں نکاح مذکور جائز نیست ومفتی بجوازہ نہ تنہا بر دلالۃ سیّدہ ظلم روا داشتہ

ل شاہ ۱۲۵

بلکہ بر کافہ اہل اسلام بمقتضائے آیت قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ و بفحوائے حدیث لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین مودۃ وحب قرابت نبویہ را بر خود فرض و از اصول ایمان مے شمارند۔ جور بے حد وستم بے عد نمودہ چہ پر ظاہر است کہ در صحت نکاح سیدہ ہاشمیہ فاطمیہ در غیر کفو بناءً علی المودۃ فا المحبۃ المذکورہ ہزارہا دل بوجہ حرمت اہل بیت رنجیدہ و شکستہ خواہند بود مستون فقہ مملو اند و مشحون از عدم این چنیں نکاح لعدم کفاءۃ العجمی لا یکون کفواً للعربیۃ ولو کان عالماً او سلطاناً وھو الاصح در مختار یفتی فی غیر الکفوٴ بعدم جوازہ اصلاً وھو المختار للفتویٰ لفساد الزمان در مختار پس در صورت مسطورہ صحبت صحبتِ زنا خواہد بود لہٰذا بر اہل اسلام لازم کہ سیدہ را از عجمی جدا کنانند و مفتی صاحب را واجب کہ آئندہ با ہچمیں افتاآت کہ مستلزم ہتک حرمت و شان اہل بیت باشند توجہ نہ نمایند و متمسک نہ باشد بر ینکہ سیادت قطعیہ نیست فان عدم قطعیۃ السیادۃ لا یستلزم قطعیۃ عدم السیادۃ فو احتمالھا تکفی مصادرۃ نحے موجبات الھتک علی المحب اعاذنا اللہ منہ فکیف حال الواد و قد طلب صلی اللہ علیہ وسلم منا المودۃ فی قرابتہٖ" یعنی نکاح مذکورہ جائز نہیں اور جواز کا فتویٰ دینے والے نے فقط سیدہ مذکورہ کے وارثوں پر ظلم ہی نہیں کیا بلکہ تمام اہل اسلام پر بھی ظلم کیا ہے کیونکہ حسب ارشاد خداوندی اور حدیث مذکورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت سے محبت رکھنا تمام اہل اسلام اصول ایمان سمجھتے ہیں اور بہت ظاہر ہے کہ نکاح مذکورہ کی وجہ سے ہزارہا دل اہل بیت کی ہتک حرمت سے رنجیدہ ہوں گے اور تمام مستون فقہ (کتب فقہ) اس قسم کے عدم جواز پر متفق ہیں۔ کیونکہ یہ نکاح غیر کفو میں ہے جیسا کہ در مختار میں مذکور ہے پس صورت مذکورہ میں یہ صحبت زنا ہو گی لہٰذا اہل اسلام پر لازم ہے کہ سیدہ کو عجمی سے جدا کرائیں، اور مفتی پر لازم ہے کہ آئندہ اس قسم کے فتووں سے اجتناب کرے۔ جن میں ہتک حرمت اہلِ بیت کرام ہو اور یہ وجہ پیش نہیں کرنی چاہیئے، کہ سیدہ کا آلِ رسول

سے ہونا قطعی اور یقینی نہیں کیونکہ اگر اس امر کا یقین نہیں تو یہ یقین کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ غیر سیدہ ہے، لہٰذا سیادت کی بو بھی محبت والے پر سنگ حرمت سے مستوجب سزا ہونے کے لئے کافی ہے خدا کی پناہ چہ جائیکہ مدّعی مودّت ایسا کرے حالانکہ ہم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہل قرابت کے متعلق مودّت (محبت) کا مطالبہ کیا ہے"

حضرت قبلہ پیر سیّد مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۶ھ) کی کلام سے بھی معلوم ہوا کہ سیّد زادی کا نکاح غیر سیّد سے نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مفتی کو جواز کا فتویٰ ہرگز نہیں دینا چاہیئے کیونکہ اس میں آل رسول کی توہین ہے جو کہ ایک سنگین جرم ہے قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین پیر سیّد حافظ جماعت علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۷۰ھ) بھی فرماتے ہیں، جو لوگ غیر سیّد ہو کر سیّد زادیوں سے نکاح کر لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو کیسے مسلمان کہہ سکتے ہیں ہر نماز میں اللھم صل علی محمدؐ و علیٰ آل محمدؐ پڑھتے ہیں اگر یہ نہ پڑھیں تو نماز ہی نہیں ہوتی پھر سیّد زادیوں کے ساتھ نکاح کرتے ہیں حالانکہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ سیدہ کا نکاح غیر سیّد کے ساتھ نہیں ہو سکتا (ملفوظات امیر الملت) بہرکیف صورت مسئولہ میں سیّد زادی کا نکاح غیر سیّد کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

بخدمت حضرت قبلہ مفتی صاحب دار العلوم نقشبندیہ علی پور سیداں شریف

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ جناب، حسب ذیل سوالات کے جوابات مدّلل بمطابق شرع شریف بحوالہ کتب معتبرہ مطلوب ہیں ازرہ کرم فرمائی صورت ہائے مسئولہ کے جوابات سے سرفراز فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

۱۔ کیا مسلمان کے لئے سود لینا اور دینا حرام ہے؟

۲۔ یہ کہ پاکستان کے ایک شہری نے جو مسلمان ہے حکومت سے قرض لیا۔ حکومت نے

یہ قرض سود پر دیا، مسلمان شہری یہ جانتے ہوئے کہ سود کا دینا نص قطعی سے حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عتاب و نافرمانی سے بچنے کے لئے سود دینا نہیں چاہتا مگر حکومت وقت سے اس کارِ حرام پر مجبور کرتی ہے ایسا مقروض مسلمان اللہ تعالیٰ کا حکم مانے یا حکومت وقت کا؟

(۳) یہ کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ کوئی قانون خلاف کتاب و سنت پاکستان میں اجرا نہیں کیا جا سکتا کیا کوئی حاکم وقت سود کا لین دین جائز قرار دے سکتا ہے؟

(۴) یہ کہ پاکستان میں وفاقی شرعی عدالت موجود ہے اگر فعل حرام سے بچنے کے لئے ایسا مقروض مسلمان اس عدالت سے رجوع کرے اور کسی مصلحت وقت کے پیشِ نظر عدالت موصوف سودی لین دین روا قرار دے اور ایسا مقروض مسلمان خدا اور رسول کی نافرمانی پر مجبور ہو تو کیا ایسا حاکم یا عالم دین با اختیار سے بارگاہ خداوندی میں مواخذہ ہوگا۔

مہربانی فرما کر دلائل سے مزین فرما کر فتویٰ صادر فرمائیں۔ بینوا وتوجروا

محمد شبیر احمد خان عفی عنہ ساکن موضع عمر پور ضلع ملتان

الجواب بعونہ تعالیٰ

۱۔ صورت مسئولہ میں مسلمان کے لئے سود دینا اور لینا نص قطعی سے حرام ہے قرآن پاک میں ہے "واحل اللہ البیع وحرم الربوا" اور اللہ تعالیٰ نے حلال کیا بیع کو اور حرام کیا سود کو، اہل لغت اور اہل زبان ربوا کا معنی زیادتی اور بڑھنا کرتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ربا کی تعریف یہ کی گئی ہے الربا شرعاً فضل خال عن عوض بمعیار شرعی (وھو الکیل والوزن) مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ (بحوالہ تنویر الابصار ص ۱۹۶) یعنی ہر وہ زیادتی جو کسی عوض کے بغیر ہو اور معاوضہ میں ایک فریق کے ساتھ خاص ہو اور قرآن پاک میں ہے وذروا مابقی من الربوا اور جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو بھی چھوڑ دو، قرآن پاک میں مختلف سورتوں کی تقریباً آٹھ آیات میں اور متعدد احادیث میں سود کو حرام قرار

دیا گیا ہے۔ لہٰذا سود لینا اور دینا دونوں صورتوں میں حرام ہے۔

۲۔ سودی لین دین مفلسی اور ناداری کی وجہ سے یا تجارت وغیرہ کی غرض سے ہو تو پھر بھی حرام ہے قرآن پاک نے مطلق سود کو حرام قرار دیا ہے یعنی قرض پر نفع لینا خواہ بوجہ مجبوری ہو حرام ہے آیت کریمہ مطلق ہے جس میں مجبوری وغیرہ کی تخصیص نہیں کی گئی اگر مقروض کو حکومت سود دینے پر مجبور بھی کرے اور وہ دے دے تو اس کا سود دینا حرام ہے اور حکومت وقت کا حرام پر مجبور کرنا یہ ایک اور جرم ہے گناہ اور حرام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں خواہ وہ حاکم وقت کیوں نہ ہو لاطاعۃ فی المعصیۃ کہ معصیت (گناہ) میں اطاعت نہیں ہے اندریں صورت مسلمان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننا لازم ہے اور حکومتِ وقت کا نہیں۔

۳۔ سائل کا یہ کہنا کہ آئین پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ کوئی قانون خلاف کتاب و سنت پاکستان میں جاری نہیں ہوگا کیا کوئی حاکم وقت سود کا لین دین جائز قرار دے سکتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اگر یہ شق موجود نہ ہوتی تو پھر بھی کسی مسلمان حاکم کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ سود کو جائز قرار دے اگر دے گا تو اس کا یہ فعل خروج عن الاسلام تصور کیا جائے گا۔

۴۔ مقروض مسلمان کو ضرور شرعی عدالت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اگر شرعی عدالت کسی مصلحت کی وجہ سے سودی لین دین کو جائز قرار دے تو بارگاہ خداوندی میں یقیناً مجرم ہے اور اس سے ضرور مواخذہ ہوگا قرآن پاک میں ہے فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ اگر ایسا نہ کرو گے (یعنی سود کو نہ چھوڑو) تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑائی کا یقین کر لو یہ زجر شدید ہی مواخذہ ہر تنبیہ عظیم ہے بہرحال سود حرام ہے اس میں مجبوری اور غیر مجبوری کا بھی لحاظ نہیں ہے سود کا لین دین عام آدمی کرے یا حکومت وقت کرے قطعی حرام ہے فعل حرام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں اگر بالغرض کوئی عدالت اس کو جائز قرار دے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے تو پھر وہ شرعی عدالت تصور نہیں کی جائے گی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین۔ مفسران کرام۔ محققین عظام اس مسئلہ میں کہ کسی کی ملکیت اراضی کو کوئی حاکم یا شخص بغیر رضا مندی مالک لے سکتا ہے یا نہیں

اگر شرع شریف میں لینے کا جواز ملے تو معاوضہ کی ادائیگی میں اگر حکومت ایسا قانون نافذ کر دے جس کی رو سے معاوضہ بازاری قیمت سے بہت ہی زیادہ کم ہو تو شرعاً ایسے قانون کی کیا حیثیت ہے حوالہ جات صریحیہ سے جواب کو مزین فرما کر مشرح تفصیلاً فرمائیں

بینوا۔ توجروا۔ احقر العباد

محمد شبیر احمد خاں جماعتی عفی عنہٗ از موضع عمر پور ڈاکخانہ چک ماہی تحصیل وضلع ملتان۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں جو لوگ اراضی کے مالک ہیں ان کی ملکیت سے زمین کو نکالنا اور ان کی حق ملکیت کو ختم کرنا شرعاً صریح ظلم اور ناجائز ہے قرآن پاک میں ہے یا ایھا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ الخ اے ایمان والو، آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ ہاں اگر باہمی رضامندی سے تجارت ہو تو حرج نہیں۔ اور قرآن پاک میں ہے لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا۔ الخ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور حکام کے پاس اس معاملے کو اس لئے نہ لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ جانتے ہوئے کھا جاؤ آیۃ کریمہ (لاتاکلوا اموالکم) کی تفسیر میں علامہ محمد بن جریر طبری المتوفی (۳۱۰ھ) فرماتے ہیں فتاویل الکلام ولایاکل بعضکم اموال بعض فیما بینکم بالباطل واکلہ بالباطل اکلہ من غیر وجہ الذی اباحہ اللہ لآکلیہ، حدثنا الحسن بن یحییٰ قال اخبرنا عبدالرزاق قال اخبرنا معمر عن قتادہ فی قولہ وتدلوا بھا الی الحکام قال لاتدلی بمال اخیک الی الحاکم وانت تعلم انک ظالم فان قضاہ لا یحل لک شیا کان حراماً علیک (ابن جریر ص۱۰۳) یعنی بعض تمہارا بعض کا مال نہ کھائے اور

باطل مال کھانا یہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کھانے والوں کے لئے مباح اور حلال نہیں کیا اور قتادہ سے اسی آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ تو باطل مال کھانے کے لئے کسی حاکم کے پاس نہ جا حالانکہ تو جانتا ہے کہ تو ظالم ہے کیونکہ قاضی کی قضا بھی تجھ پر حرام کو حلال نہیں کرے گی۔ قاضی ناصرالدین بیضاوی (المتوفی ۶۸۵ھ) لکھتے ہیں کہ عبدان الحضرمی نے امرءالقیس کندی پر زمین کا دعویٰ کر دیا اور اس کے پاس شہادت نہیں تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ امرءالقیس حلف اٹھائے جب امرءالقیس کندی نے حلف اٹھانے کا ارادہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی ان الذین یشترون بعہد اللہ وایمانھم۔ الخ تو یہ حلف اٹھانے سے رک گئے اور زمین عبدان کو دے دی (تفسیر بیضاوی ص ۱۳۲) امام علی بن محمد بن ابراہیم (المتوفی ۷۴۱ھ) تفسیر خازن میں لکھتے ہیں کہ باطل مال کھانے کے کئی طریقے ہیں جن میں زیادتی کے ساتھ یا غضب کے ساتھ مال کھانا بھی داخل ہے (تفسیر خازن ص ۱۲۵) اسی طرح امام فخرالدین رازی (المتوفی ۶۰۶ھ) بھی اپنی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ غصب کے ساتھ مال کھانا حرام ہے (تفسیر کبیر ج) شیخ طریقت پیر سید کرم شاہ صاحب فاضل جامعہ ازہر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اسلامی نظام معاشیات کا ایک اور قاعدہ بیان ہو رہا ہے یعنی ناجائز طریقہ سے لوگوں کے مال نہ کھاؤ، علامہ قرطبی فرماتے ہیں من اخذ مال غیرہ لا علی وجہ اذن الشرع فقد اکل بالباطل وہ شخص جس نے ایسے طریقے سے مال حاصل کیا جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی تو اس نے باطل ذریعہ سے کھایا۔

اس میں جوا، دھوکہ دہی، زبردستی چھین لینا، کسی کے حقوق کا انکار اور وہ مال جسے اس کے مالک نے خوشی سے نہیں دیا سب اکلِ باطل میں داخل ہیں علامہ قرطبی نے یہ تصریح بھی کی ہے اگر کوئی شخص رشوت دے کر یا جھوٹی قسم کھا کر یا جھوٹیاں گواہیاں دلوا کر اپنے حق میں فیصلہ کرالے تو قاضی کا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ لحرام لایصیر حلالا بقضائے القاضی، حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی سن لیجئے تم میرے

پاس جھگڑے چکانے کے لئے آتے ہو ممکن ہے تم میں سے ایک فریق زیادہ چرب زبان ہو اور میں (بفرض محال) اس کے حق میں فیصلہ دے دوں اگر میں کسی کو اس کے بھائی کا حق دے دوں تو وہ ہرگز نہ لے بے شک وہ اس کے حق میں آگ کا ایک ٹکڑا ہے اگر ہمارا لین دین باہمی قرآن کے اس حکم اور حضور کے اس واضح ارشاد کے مطابق ہو جائے تو کتنی مقدمہ بازیاں ختم ہو جائیں ان کی پیروی جو بے محابا روپیہ اور بے اندازہ وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچ جائے ان مقدمہ بازیوں کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ قریبی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں باہمی محبت اور اخلاص کی جگہ نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اگر ہم قرآن کے اس حکم کو سچے دل سے مان لیں تو اسلامی معاشرہ ان سب خرابیوں سے پاک ہو جائے گا اور اس کا ماحول اتنا پاکیزہ اور خوشگوار بن جائے گا جس کا اس وقت ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کاش! قرآن کو سینے سے لگانے والا مسلمان اس پر عمل کرنے کی اہمیت کا بھی احساس کرے۔ (تفسیر ضیاء القرآن ص۴۶) حدیث پاک میں ہے

حدثنا ابو الیمان انا شعیب عن الزہری ثنی طلحۃ بن عبد اللہ ان عبد الرحمن بن عمرو بن سہل اخبرہ ان سعید بن زید قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من ظلم من الارض شیئا طوقہ من سبع ارضین (بخاری ص۳۳۱ تا ص۳۳۲) امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ سعید نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرماتے ہیں کہ جس نے ظلم کے طور پر کسی کی زمین لی ساتوں زمینوں سے اتنا حصہ طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا اور امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو سلمہ سے روایت کرتے ہیں کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ اور لوگوں کے درمیان باہمی تنازعہ زمین کا تھا یہ مسئلہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے لے جایا گیا پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابو سلمہ کو کہا کہ ابو سلمہ زمین کو چھوڑ دے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو ایک بالشت زمین ظلم کے طور پر لے قیامت کے

دن ساتوں زمینوں سے اتنا حصہ طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ اور امام بخاری ہی اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی زمین سے بغیر حق کے کچھ لے لیا قیامت کے دن ساتوں زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا (صحیح بخاری ص ۳۳۲) امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی زمین سے کچھ لیا سات زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا (مسلم شریف ص ۳۲) امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ، امام مسلم المتوفی ۲۶۱ھ کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی ان روایات کو ذکر کیا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۵ھ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ کسی کی زمین پر قبضہ کرنا ناجائز اور حرام ہے حافظ بدر الدین عینی المتوفی ۸۵۵ھ بھی فرماتے ہیں کہ زمین کا غصب ظلماً ناجائز ہے علامہ ابن عابدین شامی المتوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری میں ملک ظاہر بیبرس دولت ممالیک میں مصر کے حاکم ہوئے ایک مرتبہ یہ ارادہ کیا کہ مالکان اراضی سے ان کی ملکیت ختم کر دی جائے اور اراضی پر کسی کا مالکانہ قبضہ اور خرید و فروخت درست نہیں ہے لہٰذا یہ تمام اراضی ملک مصر کی حکومتِ وقت کی تحویل میں دے دی جائے جب اس ارادہ کا اظہار ملک بیبرس نے کیا تو اس وقت کے شیخ الاسلام امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ نے بادشاہ کو کہا ذالک غایۃ الجہل والعناد وانہ لا یحل عند احد من علماء المسلمین بل من فی یدہ شئی مخصوص ملکہ لا یحل لاحد الاعتراض علیہ (رد المحتار ص ۲۶۵ ج ۳) کہ یہ تمہارا ارادہ بالکل خلاف شرع اور جہل و عناد ہے جو علمائے اسلام میں سے کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے بلکہ جو چیز جس کے قبضہ میں زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے وہ اسی کی ملک سمجھی جائے گی اور کسی کو اس پر اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے، امام ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ کے زمانہ میں بھی مصر کے بادشاہ نے ارادہ کیا کہ ملک مصر کی زمینوں کو بیت المال (حکومت کی تحویل) میں دے دیا جائے تو ابن حجر اور تمام علمائے وقت نے اس کو باز رکھا اور کہا یہ جائز نہیں ہے

ابن حجر اپنے فتاوی فقیہہ میں لکھتے ہیں فھذا صریح فی انا نحکم لذوی الاملاک والہ دقاف ببیضاء اید یھم علی ما ھی علیہ علامہ ابن عابدین علماء کرام کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں یہ ان ائمہ فقہاء کا کلام ہے جن کے نزدیک مصر و شام کی زمینیں وقف علی المسلمین ہیں وہ بھی اس کو جائز نہیں سمجھتے کہ جن لوگوں کے قبضہ میں جو زمینیں مالکانہ تصرفات کے ساتھ قدیم سے چلی آتی ہیں ان کا قبضہ ہٹا دیا جائے فکیف یصح علی مذھبنا بانھا مملوکتہ کاھلنا تو ہمارے نزدیک (یعنی مذہب حنفیہ میں) جبکہ یہ زمینیں اصحاب اراضی کی مملوک ہیں ان کے قبضہ سے نکالنا کیسے درست ہو سکتا ہے بلکہ یہ صریح ظلم ہے، قرآن پاک اور احادیث نبویہ اور محدثین اور فقہائے عظام کے اقوال سے ثابت ہوا کہ مالک اراضی کو اس کی زمین سے خارج کرنا اور ملکیت ختم کرنا شرعاً ناجائز ہے حاکم وقت یہ نہیں کر سکتا اور نہ حکومت ایسا کوئی قانون نافذ کر سکتی ہے اگر حکومتِ وقت مالکان اراضی کو کچھ معاوضہ دے کر حق ملکیت سے خارج کرتی ہے تو بھی اس وقت صحیح ہو گا جبکہ مالکان اراضی رضامند ہوں جیسے کہ قرآن پاک کے حوالہ سے گذرا ہے الا ان تکون تجارۃ اگر مالکان اراضی اپنی رضامندی سے نہیں دیتے تو حکومتِ وقت کے لئے بھی ہرگز یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کچھ معاوضہ دے کر زمین حاصل کر لے یا کوئی ایسا قانون نافذ کرے جس قانون کے ذریعے سے لوگوں کی حق ملکیت ختم ہو جائے، بہر کیف مالکان اراضی کے حقوق ملکیت کو ختم کرنا شرعاً ناجائز اور ایک صریح ظلم ہے جو کہ حکومت وقت یا مسلمان حاکم کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے اپنی دادی کا دودھ پیا ہے کیا یہ آدمی اپنی حقیقی پھوپھی کی لڑکی کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے

یا نہیں شرعی حکم بیان کیا جائے۔

المستفتی :۔ چوہدری محمد انور ساکن بدھو چیدہ ضلع سیالکوٹ

الجواب

صورت مسئولہ میں نکاح حرام ہے کیونکہ پھوپھی کی لڑکی آدمی کو دودھ پلانے والی کی اولاد ہے اس لئے لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ نہیں ہو سکتا، فقہاء کرام فرماتے ہیں محرم علی الرضیع ابواہ من الرضاع واصولھما وفروعھما من النسب والرضاع جمیعاً (فتاوی نظامیہ صفحہ ۲۲۹) لہٰذا مذکورہ صورت میں نکاح ہر گز نہیں ہو سکتا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

فی زماننا حد شرعیہ زانی و مذنیہ موضوع بحث ہے حال میں شریعت بنچ پاکستان کے فاضل ججان نے رجم اور سنگساری کو بہر صورت سزا غیر شرعی قرار دیا ہے دعوی یہ فرمایا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زانی یا مذنیہ کو رجم فرمانے کا حکم صادر نہیں فرمایا جس مذنیہ صحابیہ کو رجم فرمانے کا حکم فرمایا گیا۔ اس میں تاویل یہ کی ہے کہ وہ عورت فاحشہ پیشہ ور بدچلن تھی۔ اب تک ہمارے علم میں یہی تھا کہ شادی شدہ مرد یا عورت پر اگر زنا ثابت ہو تو وہ رجم ہوگا مگر فیصلہ شریعت بنچ کے بعد صورت تشکیک کی سکینت کے لئے آپ سے مستفسر ہوں کہ بدیں ضمن بالتفصیل کتب معتمدہ کے واضح حوالہ جات سے مذنیہ کی حد کی صحیح صورت حال سے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے اور خلفائے راشدین کے فیصلہ جات اور آئمہ مجتہدین و کتب فقہ معتبرہ کے حوالہ جات سے صورت مسئولہ کا جواب مزین فرما کر طمانیت بخشیں۔

محمد شبیر احمد خاں نقشبندی جماعتی موضع عمر پور۔ ڈاکخانہ چک ماہنی تحصیل و ضلع ملتان ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

بر تقدیر صحت صورت مسؤلہ جہاں تک مسئلہ (حد) رجم کا تعلق ہے صحیح احادیث اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے تمام فقہاء اور ائمہ کرام رجم کے قائل ہیں، البتہ فرقہ خارجیہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ شرعی بنچ نے بھی غالباً اس وقت کے علماء وہابیہ خارجیہ سے متاثر ہو کر ایک عظیم حد شرعی رجم کا انکار کر دیا ہے ورنہ رجم تو حدیث پاک اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے شمس الائمہ سرخسی (المتوفی ٥٠٠ ھ) لکھتے ہیں۔ واما الرجم فھو حد مشروع فی حق المحصن ثابت بالسنۃ الا علی قول الخوارج فانھم ینکرون الرجم کہ رجم حد شرعی محصن کے حق میں ثابت ہے ساتھ سنت کے اس کا انکار خوارج نے کیا ہے (مبسوط صہ ٢٦ ج ٩) امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک مرد (ماعز بن مالک اسلمی) بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ میں نے زنا کیا ہے اور انہوں نے چار مرتبہ یہ لفظ کہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذھبوا بہ فارجموہ، اس کو لے جاؤ اور اس کو رجم کرو۔ جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو بقیع میں رجم کیا وہ بھاگ پڑے حتیٰ کہ ہم نے ان کو مقام حرہ میں رجم کر کے ختم کر دیا (بخاری شریف صہ ١٠٠٦) مزید امام بخاری نے باب الرجم بالمصلیٰ میں ذکر کیا ہے کہ بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جنازہ پڑھا اور ان کا ذکر خیر کیا امام بخاری نے کتاب الحدود میں ایک طویل حدیث میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ رجم حق ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد بعض لوگ یہ کہہ دیں گے کہ رجم نہیں ہے یہ لوگ اللہ کا ایک اہم فریضہ چھوڑنے کی وجہ

سے گمراہ ہو جائیں گے باوجودیکہ رجم (حد شرعی) حق ہے، رجم اس پر ہے جو زنا کرے اور محصن ہو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ گواہوں سے زنا ثابت ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو (صحیح بخاری ص۱۰۰) زانی جب قاضی کے سامنے زنا اور محصن ہونے کا اقرار کرے گا یا گواہ زنا پر اور اس کے محصن ہونے پر گواہی دے دیں گے تو زانی کو رجم کیا جائے گا زنا کا ثبوت چار گواہوں سے یا زانی کے اقرار سے یا حمل سے ہو گا اور محصن ہونے کے ثبوت کے لئے صرف دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ کافی ہیں، محصن ہونے کی سات شرطیں ہیں نمبرا آزاد ہونا ۲ عاقل ہونا ۳ بالغ ہونا ۴ مسلمان ہونا ۵ نکاح صحیح ہونا ۶ نکاح صحیح کے ساتھ وطی ہونا ۷ میاں، بی بی، دونوں کا وقت وطی میں صفات مذکورہ کے ساتھ متصف ہونا؟ امام سرخسی فرماتے ہیں ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجم ماعزاً بعد ما سئال عن احصانہ ورجم الغامدیتہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کو رجم کیا جبکہ اس کے محصن ہونے سے سوال کر لیا اور غامدیہ کو بھی رجم کیا۔ اس کے سوا اور بھی احادیث ہیں جو کہ رجم کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں (مبسوط ص۳۷ ج۹) علامہ علی بن ابی بکر فرغانی المتوفی ۵۹۳ھ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں واذا وجب الحد وکان الزانی محصنا رجمہ بالحجارۃ حتی یموت اور جب حد واجب ہو جائے اور زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کو پتھروں کے ساتھ رجم کیا جائے حتیٰ کہ مر جائے اور آخر میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں وعلی ھذا اجماع الصحابۃ کہ اس پر صحابہؓ کا اجماع واتفاق ہے (ہدایہ ص۴۸۹) علامہ بدرالدین عینی حنفی المتوفی ۸۵۵ھ فرماتے ہیں۔ کہ حدیث پاک میں ہے کہ کسی مسلمان کا خون گرانا جائز نہیں مگر تین چیزوں کے ساتھ، ان میں سے ایک زنا بعد الاحصان ہے اس کی تخریج امام ترمذی، امام نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے (عینی ص۴۸۹) یعنی اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہے تو اس کو رجم کیا جائے ثابت ہوا کہ اگر زانی شادی شدہ ہے تو اس کو رجم کیا جائے گا، اگر غیر شادی شدہ (کنوارا) ہے تو اس کو سو کوڑے مارے جائیں گے، (جج صاحبان کی یہ تاویل کہ وہ عورت فاحشہ تھی، پیشہ ور اور بد چلن تھی، رجم کے

کے انکار کے لئے یہ تاویل غیر معتبر ہے کیونکہ رجم تو کیا گیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کو رجم کا حکم فرمانا ہی رجم کے ثبوت کے لئے واضح ترین دلیل ہے اور حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ بھی محصن تھے، حضرت غامدیہ بھی محصن تھیں، اسی وجہ سے تمام فقہاء اسلام اور آئمہ کرام نے شادی شدہ زانی اور مزنیہ کے لئے رجم کی حد مقرر فرمائی ہے، اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، اجماع بجائے خود ایک عظیم شرعی دلیل اور حجت ہے، گویا کہ یہ رجم جیسا کہ سنت نبویہ سے ثابت ہے۔ اسی طرح اجماع صحابہ سے بھی ثابت ہے شرعی بنچ اور وفاقی شرعی عدالت کا انکار بے معنی اور نہایت ہی غلط ہے، رجم کا انکار صرف خارجیوں نے کیا ہے اگر وفاقی شرعی عدالت پاکستان اس کا انکار کرتی ہے تو گویا کہ وہ خوارج کے نظریات سے متاثر ہے جہاں تک رجم کی شرعی حیثیت ہے وہ یہی ہے کہ شادی شدہ زانیہ اور زانی کو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ موضع اوڈھیاں تحصیل نارووال میں قدیم سے ایک احاطہ قبرستان ہے جس پر حسب ذیل اشخاص نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس جگہ پر گوبر وغیرہ لگایا گیا ہے اب اس کو حویلی کی شکل بنایا گیا ہے یہ کام علاؤالدین ولد بھولا اور مہرالدین ولد علاؤالدین وغیرہ اقوام راجپوت ساکن دیہہ نے قبرستان میں کیا ہے اور قبرستان کی بے حرمتی کی ہے شرعی حکم تحریر فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

سائلین:- اقبال ولد مہر دین، ہدایت علی ولد منشی، نیاز علی ولد علی محمد ساکن اوڈھیاں ضلع سیالکوٹ۔

الجواب

صورت مسئولہ میں جہاں قبرستان یا مسلمانوں کی قبریں ہیں۔ ان پر قبضہ کرنا شرعاً

حرام ہے کیونکہ قبرستان وقف ہوتا ہے۔ فان الوقف لا یملک ، وقف کسی کی ملک نہیں ہوتا اور نہ ہی اس پر کوئی قابض ہو سکتا ہے ثم ھو تصرف فی الوقف بما لیس لہ وتغیرلہ عماقد کان لہ فلا یجوز ، پھر قبروں پر گوبر وغیرہ لگانا، قبروں پہ پاؤں رکھنے اور قبروں پر چلنا پھرنا یہ تمام فعل شرعاً حرام ہیں فتاویٰ رضویہ ۴ ص ۶ میں ہے کہ قبروں پر چلنا، اٹھنا بیٹھنا حرام ہے و قد صرح علماء المودر فی سکتہ حادثتہ فی المقابر حرام کہ قبرستان میں راستہ بنانا تاکہ وہاں سے لوگ گذریں حرام ہے مسلمان کی قبر پہ پاؤں رکھنا بھی ناجائز ہے کیونکہ اس میں قبر کی توہین اور بے عزتی ہے۔ بہر صورت قبرستان پر قبضہ کرنا پھر اس میں سے گذرنا قبروں پر چلنا، پھرنا، گوبر وغیرہ لگانا یہ تمام کام حرام ہیں۔ علاؤالدین اور مہردین راجپوت کو چاہیئے کہ قبرستان سے قبضہ چھوڑ دیں اور قبرستان کی توہین اور بے عزتی نہ کریں اور قبرستان میں گوبر وغیرہ نہ لگائیں اور نہ ہی گذرنے کے لئے راستہ بنائیں اگر علاؤالدین اور مہردین قبضہ نہ چھوڑیں تو عوام مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ حکومت اور عدالت کی طرف رجوع کریں اور زبردستی بھی ان کے قبضہ ختم کروادیں۔ جو کہ شرعی طور پر ضروری ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام دریں مسئلہ کہ حضور پرنور غوث اعظم دستگیر پیران پیر غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کی جو یہ کرامت مشہور ہے کہ بارہ سال کے بعد ایک مائی کا بیڑا تیرا تھا کیا یہ صحیح ہے یا نہیں اور کس کتاب میں یہ واقعہ ہے، دوسرا سوال یہ ہے کہ حضور سیدنا غوث اعظمؓ نے قبرستان سے کئی سو سال کے بعد ایک پرانی قبر سے سارنگی بجاتا ہوا ایک گویا زندہ برآمد فرمایا یہ واقعہ نظر سے نہیں گذرا کیا یہ بھی کسی کتاب میں منقول ہے یا نہیں جواب بمعہ حوالہ جات تحریر فرمائیں۔

سائل نور محمد حیدری جماعتی نقشبندی، چشتیاں شریف

الجواب

حضرت سیدی و سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے بے شمار کرامات ہیں، سوال میں جو کرامات دریافت کئے گئے ہیں ان کا تذکرہ علامہ غلام علی شاہ قادری نے اپنی کتاب درۃ الدارین فی مناقب غوث الثقلین میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ دریائے دجلہ پر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک ضعیفہ عورت رو رہی تھی پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بارہ سال کا عرصہ ہو گیا ہے کہ میرا بیٹا بمعہ اپنی دلہن اور براتیوں کے دریا میں ڈوب گیا تھا۔ حضرت غوث اعظمؓ نے دعا فرمائی اور دریا میں جوش و خروش پیدا ہوا۔ اور کشتی ضعیفہ کے بیٹے کی بمعہ دلہن براتیوں کے پانی کے اوپر آگئی۔

پسر آں پیرزالہ با صحافہ عروس و طائفہ انام و دواب و انعام و آنچہ دراں بود صحیح و سالم برآمد مردم متعجب ماندند (درۃ الدارین ص۲۰۲) (شریف التواریخ ص۶۷۔) ضعیفہ کے بیٹے کا نام کبیر الدین دریائی عرف شاہ دولہ رحمت اللہ علیہ ہے، یہ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے خلفاء سے ہوئے ہیں ان کا مزار گجرات شہر (پاکستان) میں ہے۔ صورت مسئولہ میں جو دوسری کرامت کے متعلق استفسار کیا گیا ہے وہ بھی صحیح ہے جبکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کا باہمی مناظرہ ہوا تو عیسائی کہنے لگے کہ ہمارے عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مردے زندہ نہیں کئے تو حضرت غوث رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نبی صلی اللہ کا تابع فرمان غلام ہوں، میں بھی مردے زندہ کر سکتا ہوں، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند ہے۔ عیسائی ایک قبر پر حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کو لے گئے حضرت غوث اعظمؓ نے قبر پر کھڑے ہو کر فرمایا قم باذن اللہ، چونکہ وہ قبر ایک گویئے کی تھی

لہ ایک ضعیفہ عورت ۱۲

لہذا جب وہ قبر سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سرنگی تھی، قوال خوشحالے سرود گویاں و کنکرہ زنان بیرون آمد (درۃ الدارین ص۲۱۲) حضرت غوث رضی اللہ عنہ کے بے شمار عجیب وغریب کرامات ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

چند مسائل بڑے تنازع میں ہیں ان کا حل تحریر فرمائیں۔

۱۔ ایک مولوی کہتا ہے کہ امام حنیف علی مشکلکشا کا کوئی بیٹا نہیں ہے اگر کوئی عالم دین امام حنفیہ کو علیؑ کا بیٹا ثابت کرے تو میں کان کٹوا دوں گا (۲) امام حسن علیہ السلام نے سو شادیاں کیں، نبی صلی اللہ نے تنگ آکر ہم بیویوں کا حکم لگا دیا (۳) جو کوئی کلمہ پڑھنے والا ہے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ہیں اور سب پر درود پڑھا جاتا ہے،

سائل۔ چوہدری احمد نواز بھوجیا نقشبندی۔ ضلع جھنگ

الجواب بعونہ تعالیٰ۔

۱۔ حضرت محمدؒ حنفیہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے تھے علماء مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اٹھارہ لڑکے اور اٹھارہ لڑکیاں تھیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نو بیویاں تھیں، حضرت خولہ بنت جعفر بن قیس جو آپ کی بیوی تھی ان کے بطن اطہر سے حضرت محمد حنفیہ پیدا ہوئے، (بحوالہ عمدۃ الطالب) آپ کا نام محمد اکبر تھا آپکو محمد بن حنفیہ، اور محمدؒ حنفیہ اور محمد حنیف کہتے ہیں آپ کی والدہ حضرت خولہ قبیلہ حنفیہ سے تعلق رکھتی تھیں، حضرت خولہ کا لقب حنفیہ تھا اس لئے آپ کو محمد بن حنفیہ بھی کہتے ہیں۔ محمد حنفیہ ۸ ھجری میں پیدا ہوئے اور ۸۱ ھجری کو فوت ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے علمبرداری ہوا کرتے تھے آپ بہت بڑے بہادر اور شجاع تھے اور نہایت متقی پرہیزگار، عابد اور زاہد تھے اور حج

شخص محمد حنفیہ کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے نہیں تھے وہ علم تاریخ اور علم انساب سے ناواقف ہے (۲) حضرت امام حسن علیہ السلام نے متعدد شادیاں کیں، لیکن گھر میں بیک وقت چار بیویاں ہی ہوتی تھیں، چار سے زائد نہیں، جب کسی کو طلاق دیتے تو پھر دوسری عورت کے ساتھ نکاح فرما لیتے لوگ اس لئے نکاح دیتے کہ ان کا تعلق اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو جائے اور رضائے رسولؐ حاصل ہو آپکی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بیویوں کا حکم نہیں فرمایا بلکہ چار عورتوں کا حکم تو پہلے نازل ہو چکا تھا، مولوی مذکور، علم تاریخ اور قرآن کے نزول اور امام حسن علیہ السلام کی تاریخی زندگی سے ناواقف ہے (۳) آل سے مراد جن پہ درود پاک پڑھا جاتا ہے حضورؐ کی اہل بیت اور اولاد رسول مراد ہے تمام لوگ مراد نہیں ہیں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا، اپنے شوہر (علی رضی اللہ عنہ) اور دونوں بیٹوں (حسنین) کو لاؤ، وہ لے آئیں تو آپؐ نے اپنی چادر مبارک لی اور ان پر ڈال دی اور فرمایا اللھم ھؤلاء آل محمد فاجعل صلواتک وبرکاتک علی آل محمد کما جعلتھا علی آل ابراھیم انک حمید مجید اے اللہ یہ لوگ میری آل ہیں تو اپنی صلواۃ (درود) اور برکتیں آل محمدؐ پہ نازل فرما جیسا کہ تو نے آل ابراہیم پر صلواۃ اور برکتیں نازل فرمائی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اور ان کی اولاد آل ہیں اور ان پر ہی درود پڑھا جائے گا (رشفۃ الصادی ص ۳۶) صحیح احادیث اور روایات کے مطابق آل سے مراد اہل بیتِ رسولؐ اور آل رسولؐ ہے تمام لوگ مراد نہیں ہیں اور نہ ہی تمام لوگوں پر درود پڑھنا مراد ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین دریں مسئلہ کہ مور (جانور) حلال ہے یا نہیں ! بمعہ

حوالہ جات کتب تحریر فرمائیں،

سائل :۔ مہرالدین بٹ نارووال ضلع سیالکوٹ

الجواب

مور، حلال ہے فقہاء حنفیہ نے اس کے حلال ہونے کی تصریح کی ہے۔ (تنمیر الکلام ص۱۸)

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہم سب حنفی عشاء کی سترہ رکعتیں ادا کرتے ہیں جن میں نماز وتر کے بعد دو رکعت نفل بھی شامل ہیں اب سوال یہ ہے کہ وتروں کے بعد جو دو نفل پڑھے جاتے ہیں ان کا ثبوت شرع میں ہے یا نہیں کتب احادیث و فقہ کے حوالے سے ثبوت تحریر فرمائیں۔

المستفتی، مشتاق احمد، الکویت، المملکۃ العربیہ۔ ص۔ ب ۴۴۲

الجواب

صورت مسئولہ میں نماز وتر کے بعد حنفیہ جو دو رکعت نفل پڑھتے ہیں۔ ان کا احادیث صحیحہ میں ثبوت موجود ہے، (عن ابی امامۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلیھا بعد الوتر وھو جالس یقرأ فیھا اذا زلزلت الارض وقل یاایھا الکفرون رواہ احمد (مشکوٰۃ شریف ص۱۱۲) حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے، جس میں بطور قرأت سورہ زلزال اور سورہ کافرون پڑھا کرتے تھے امام احمدؒ نے اس کو روایت کیا ہے، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ، صریحہ جزئیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نفل پڑھ کر پڑھے مگر ساتھ فرما دیا کہ میں تمہارے مثل نہیں

ہوں کہ میرا ثواب قیام و قعود دونوں میں یکساں ہے تو امت کے لیئے یہ نفل بعد از نماز وتر کھڑے ہو کر پڑھنا افضل اور دو نا ثواب ہے اور بیٹھ کر پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے رفتاوی رضویہ ۲۶ﷺ) بہر صورت وتروں کے بعد جو دو نفل ہیں ان کا ثبوت کتب حدیث اور کتب فقہ میں موجود ہے، اگر پڑھے گا تو ثواب ہوگا۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب،

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرح متین اس مسئلہ میں ایک پیش امام ہے جس نے عامتہ المسلمین کے منشا کے خلاف ایک شخص کا جو کہ مرزائی تھا جنازہ پڑھایا ہے ایک مرزائی قادیانی کا جنازہ کیا جائز ہے اور جنازہ پڑھانے والے پیش امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں! اس کے علاوہ یہ بھی بحوالہ قرآن و سنت فتویٰ دیں کہ شرعی نقطہ نظر سے ایسے امام کے متعلق کیا تعزیر ہے اور دوسرے مسلمان اس کے ساتھ کیا سلوک کریں اس کے ساتھ دنیوی تعلق بھی جائز ہے یا کہ نہیں۔

العارض، مولوی برکت علی موضع مراڑہ شریف، محمد اشرف ممبر یونین کونسل مراڑہ ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں جنازہ کے لئے میت کا مسلمان ہونا شرط اول ہے رد المحتار میں ہے وشرطہا اسلام المیت کہ میت کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ قانون شریعت اسلامیہ اور قانون پاکستان کے مطابق مرزائی قادیانی جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے ہیں یا اس کو مسلمان سمجھتے ہیں مطلقاً کافر ہیں یہ لوگ (مرزائی) ہرگز ہرگز مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر، مرتد اور خارج از اسلام ہیں تفسیر ابن کثیر میں ہے ومن قال بعد نبینا نبی یکفر لانہ انکر النص جو شخص ہمارے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کسی کو نبی تسلیم

کرے وہ کافر ہے کیونکہ وہ نص قطعی کا منکر کافر ہے۔ مرزائی چونکہ غلام احمد (مرزا) کو نبی سمجھتے ہیں وہ کافر ہیں جب مرزائی کافر ہوئے تو ان کا جنازہ پڑھنا اور پڑھانا ناجائز ہے لانہا غیر مشروعۃ لقول تعالیٰ ولا تصل علی احد منہم مات ابداً یعنی قرآن پاک میں ہے کہ کافر اور منافق کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور مذکورہ صورت میں اگر جنازہ پڑھنے اور پڑھانے والوں نے مرزائیوں کو مسلمان سمجھ کر جنازہ پڑھا تو کافر ہوئے، ان کو از سر نو مسلمان ہونا چاہیئے اور نکاح کی بھی تجدید لازماً کرنی ہوگی یومر بالاستغفار والتوبۃ وتجدید الایمان والنکاح (فتاویٰ رضویہ) کہ استغفار اور توبہ بھی کریں ایمان اور نکاح کی بھی تجدید کریں اگر مرزائیوں کو کافر سمجھتے ہوئے جنازہ پڑھا ہے تو پھر بھی وہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے تو پھر توبہ علی الاعلان کریں اور خدا سے معافی مانگیں اور آئندہ عزم کریں کہ ہم ایسے کام کا ارتکاب نہیں کریں گے، اگر وہ توبہ کرلیں تو بہتر ہے ورنہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لئے جائیں اور پیش امام کو امامت سے بھی معزول کر دیا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

میرے کچھ دوست بحث کر رہے تھے کہ قرآن پاک سے فال لینا جائز ہے یا نہیں انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سوچا کہ آپ سے رہنمائی حاصل کروں میں نے اپنے دوستوں کو کہا کہ میں علی پور شریف خط لکھتا ہوں وہاں سے جو جواب آئے گا وہ تسلی بخش ہوگا۔ فتویٰ تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

کیپٹن منور احمد سلہریا، رسالپور، اکوڑہ خٹک۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

نیک فال لینا یا نکالنا جائز ہے حدیث پاک میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے بدشگونی کا ذکر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فال اچھی چیز ہے اور براشگون جو ہو اس پر عمل نہ کیا جائے (ابوداؤد) فتاوی رضویہ میں ہے کہ نیک فال جائز ہے اگر نیک فال قرآن پاک سے لی جائے تو یہ بھی جائز ہے اور حدیث میں جو ممانعت آئی ہے وہ صرف بد فال کی ہے، اگر کوئی قران سے فال لیتا ہے تو جائز ہے اور حدیث میں تو بدشگونی سے منع کیا گیا ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے ایک مولوی صاحب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہ مانے تو وہ کافر ہو جاتا ہے آپ اس مسئلہ کے متعلق صحیح فیصلہ کریں کہ واقعی وہ آدمی جو آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہ مانے وہ کافر ہو جاتا ہے، اور اس مولوی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

العارض، طفیل احمد قادری کھوئی رٹہ آزاد کشمیر۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا اور آزر چچا کا نام تھا تفسیر ابن جریر ص۱۴۹ میں ہے کہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں لیس آزر ابا ابراھیم کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ نہیں ہے۔ علامہ آلوسی بغدادی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ جمہور علمائے اہلسنت کی یہ رائے ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کے والد نہ تھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات والمشرکون نجس، کہ میں ابتدا سے آخر تک پاک لوگوں کی پشتوں پاک خواتین کے رحموں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہوں اور مشرک تو نجس ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

نسب میں کوئی مشرک نہیں ہے اور آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام تھا اور
اب کا لفظ چچا کے معنے میں مستعمل ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے قالو نعبد الٰھک والٰہ
اٰبائک ابراھیم و اسماعیل و اسحاق ' ومعلومٌ ان اسماعیل کان عماً لیعقوب
کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے حالانکہ قرآن پاک
نے یہاں بھی لفظ اَب (باپ) استعمال فرمایا ہے جس سے مراد چچا ہے باپ نہیں ہے
اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جس کی موت کفر اور شرک پر ہو اس کے لئے دعا مغفرت
نہیں ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد تارخ کی وفات اور تعمیر کعبہ کے
بعد اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ رب اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم
الحساب اے رب مجھے بھی بخش دے اور میرے والدین اور مسلمانوں کو بخش دے، اگر حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے والد کافر ہوتے تو ایک پیغمبر یہ جانتے ہوئے کہ کافر کی بخشش
نہیں ہو سکتی کبھی والد کیلئے دعا مغفرت نہ فرماتے، حضرت ابراہیم کا اپنے والدین کیلئے دعا مغفرت کرنا اس بات کی صریح اور واضح دلیل ہے
کہ آپ کے والد پاک مومن تھے (تفسیر روح المعانی صد ۱۶۹) ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے والد ماجد کا نام تارخ تھا جو مومن اور مسلمان تھے، مولوی مذکور کا
یہ کہنا کہ جو آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہ مانے وہ کافر ہے نہ بجائے خود مولوی مذکور
کے یہ الفاظ صریح کفر ہیں کیونکہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ جو کہ امام المفسرین اور حضرت
ابن عباس کے شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آزر آپ کا باپ نہیں تھا
نہ آلوسی اور دیگر مفسرین بھی کہتے ہیں کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہیں تھا کیا مولوی
مذکور کے نزدیک یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں بلکہ مولوی مذکور خود کافر اور شیطان ہے
جو کہ یہ کہتا ہے کہ جو لوگ آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں مانتے وہ کافر ہیں
ایسے آدمی کو مولانا کہنا بھی سنگین جرم ہے، ایسے آدمی کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نمازیں
پڑھنا حرام اور ناجائز ہیں۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

ایک عورت نے اپنے نکاح کو فسخ کروانے کے لئے عدالت میں دعوے دائر کیا ہے اور عدالت اس عورت کو آزاد کر دیتی ہے حالانکہ اس کا خاوند طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس عورت کا دوسری جگہ نکاح کیا جاتا ہے کیا یہ نکاح جائز ہے یا نہیں! اگر نا جائز ہے تو اس نکاح ثانی پڑھانے والے پر شرعی کیا سزا عائد ہو سکتی ہے اس کے متعلق ہمیں فتوی دیا جائے۔

عبد الغنی نمبردار موضع کھارامیگا ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں پہلا نکاح صحیح ہے دوسرا نکاح منعقد نہیں ہوا۔ کیونکہ نکاح کے فسخ کے لئے قاضی ہونا شرط ہے قاضی کے بغیر تنسیخ نکاح نہیں ہو سکتا درمختار میں ہے کہ فسخ کے لئے قضائے قاضی شرط ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ قاضی جب نکاح فسخ کرے تو عورت کا خاوند عدالت میں موجود ہو اگر خاوند موجود نہیں تو پھر قاضی بھی نکاح فسخ نہیں کر سکتا الزوج لو کانا غائبا لم یفرق بینہما مالم یحضر للزوم القضاء علی الغائب فتاوی رضویہ میں ہے کہ تفریق کے وقت حاضری شوہر لازم اور ضروری ہے (فتاوی رضویہ باب الولی ۲۴) اگر عدالت نے نکاح فسخ کیا ہے اور خاوند حاضر نہیں تو پھر نکاح فسخ نہیں ہوگا لہٰذا پہلا نکاح برقرار ہے اور دوسرا نکاح نہیں ہوا۔ اور نکاح پڑھانے والے نے نکاح کے اوپر نکاح کیا ہے۔ جو سنگین جرم ہے نکاح خواں اور گواہوں کو توبہ علی الاعلان لازم اور ضروری ہے اور نکاح خواں اپنے نکاح بھی تجدید کرے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب،

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسلمان قوم

(حجام) نائی جس پر سب لوگوں کو پوری طرح اعتماد ہوتا ہے۔ اس کا پکا ہوا کھانا پاک اور صاف سمجھا جاتا ہے بلکہ نائی لوگوں کو مسلمان قوم کا ہاتھ ہی تصور کیا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بالکل حلال سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس گاؤں کے لوگوں نے مسمی محمد صدیق حجام جس نے عیسائی برادری کی ایک تقریب پر ایک گائے کے گوشت سے اپنے ہاتھ سے چاول پکائے جبکہ اسے پوری طرح علم تھا کہ اس گائے کو عیسائی لوگوں نے خود ذبح کیا ہے اور پھر چاول پکا کر جس میں گوشت پکایا تھا خود کھایا اور لوگوں کو بھی کھلا دیا۔ یہاں تک کہ ہمارے گاؤں میں تقسیم کیا لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ نائی کے چاول پکے ہوئے ہیں کھا لئے مگر بعد میں یہی نائی محمد صدیق کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو سؤر کھلایا ہے۔ مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا ہے کہ اس محمد صدیق مذکور نے لوگوں کو دھوکہ دیا ہے اب اس محمد صدیق مذکور کی دینی طور پر کیا سزا ہے فتویٰ دے کر لوگوں کو اطمینان قلب عطا فرمایا جائے سائلین۔ بشیر احمد۔ رشید احمد۔ نذیر احمد مقام بڈھن ضلع سیالکوٹ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسؤلہ میں عیسائیوں کا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہے فتاویٰ افریقہ میں ہے کہ عیسائی ذبح نہیں کرتے بلکہ جانور کا گلا گھونٹتے ہیں یا گلے میں ایک طرف چھری چبھو نک دیتے ہیں لہٰذا ان کا مارا ہوا جانور حرام اور مردار ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔ جن مسلمانوں نے لاعلمی میں یہ مردار اور حرام گوشت کھایا ہے وہ توبہ کریں۔ چونکہ پکانے والے محمد صدیق مذکور کو علم تھا کہ یہ مردار ہے۔ اس نے مردار پکایا خود کھایا لوگوں کو بھی کھلایا جو کہ سخت ترین جرم ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو خنزیر کھلایا ہے یہ ایک اور گناہ ہے اس نے اہل اسلام اور اسلام کی توہین کی ہے جو کہ کفر کے قریب ہے

اس کو کسی عالم باعمل اہل سنت وجماعت کے حاضر ہوکر تجدید ایمان اور توبہ کرنی چاہیئے اگر یہ توبہ نہ کرے تو اس کے ساتھ کسی قسم کا ربط و تعلق نہیں رکھنا چاہیے اور نہ ہی اس کے ساتھ کھانا پینا چاہیئے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک محفل میں تین آدمیوں نے طلاقیں بغیر الفاظ زبان کے صرف دستخط و انگوٹھا لگایا ان میں سے ایک نابالغ بچہ بھی ہے۔ بعد میں ان سے فرداً فرداً دریافت کیا گیا تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے طلاقیں دے دی ہیں کیا فقہ حنفی کے مطابق طلاقیں واقع ہوتی ہیں یا نہیں۔ بینوا و توجروا

سائل حافظ عبدالمالک چک نمبر ۱۹۵ ھلو والہ ڈاکخانہ خاص تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نابالغ بچے کی طلاق نہ ہوگی ولا یقع طلاق الصبی اگر نابالغ بچے نے طلاق دی تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ طلاق دینے کے لئے خاوند کا عاقل بالغ ہونا ضروری ہے اگر طلاق نامہ لکھا گیا اور خاوند نے لکھایا یا لکھ دیا اور اس پر دستخط کر دیئے تو طلاق ہو جائے گی اگرچہ زبان سے طلاق کے لفظ ادا نہیں کئے وان کانت موسومۃ یقع الطلاق نوی اولم ینو (ردالمحتار) سائل کے قول کے مطابق جب طلاق دینے والوں سے بار بار پوچھا گیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے طلاقیں دے دی ہیں تو طلاقیں واقع ہو جائیں گی (درمختار) بہرصورت مذکورہ صورت میں طلاقیں ہوگئی ہیں اور نابالغ کی طلاق نہیں ہوئی۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ مسجد میں کھڑے ہو کر سپیکر پر سبزی بیچنے

کا اعلان کرنا اور سبزی کے نرخ بتانے اور سبزی کی تعریف کرنا کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں

سائل :۔ محمد علی ساکن بوریوالی ، ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں مسجد میں سبزی کا اعلان کرنا اور اس کے نرخ کا اعلان کرنا منع ہے حدیث پاک میں ہے اذا رائیتم من یبیع او یبتاع فی المسجد فقولوا لاربح اللہ تجارتک جب تم مسجد میں کسی کو خرید و فروخت کرتے دیکھو تو کہو کہ تم کو اللہ تعالیٰ تجارت میں نفع نہ دے ۔ فتاوی شامی میں ہے ۔ مسجد میں خرید بیچنا یا خریدنا منع ہے اسی طرح مسجد میں تجارت کا اعلان کرنا جو کہ حکم تجارت میں ہے / بھی منع ہے مسجد میں بلند آواز کرنا یا دنیاوی باتیں کرنا یا شور وغل کرنا یہ تمام ہی چیزیں منع ہیں ۔ لہٰذا جو آدمی اعلان کرتا ہے اس کو اعلان نہیں کرنا چاہیئے اگر باز نہ آئے تو سختی سے اسے منع کرنا چاہیئے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک گائے میں ، جو کہ قربانی کے لائق ہے اس میں چھ حصے دار شامل ہو گئے ہیں ساتواں حصے دار نہیں ملتا اب ساتویں حصے کا کیا کیا جائے بمطابق فقہ حنفی جواب دیا جائے ۔

ماسٹر محمد اشرف باجوہ قلعہ سوبھا سنگھ ضلع سیالکوٹ

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں سات حصے مکمل ہونے چاہئیں یعنی سات حصے دار ہوں یا ایک آدمی دو حصے رکھ لے اس طرح حصے مکمل ہو جائیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ساتواں حصہ چھ حصے داروں میں تقسیم کیا جائے ۔ قربانی میں ایک حصہ کی تقسیم ناجائز ہے ہر حصہ مکمل

طور پر ہوگا۔ اس میں کسر اور تقسیم نہ ہوگی۔ حدیث پاک میں ہے وعن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البقرۃ عن سبعۃ و الجزور عن سبعۃ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گائے سات کی طرف سے ہے اور اونٹ بھی سات کی طرف سے ہے (مشکوٰۃ شریف ص ۱۲۷) شامی میں ہے کہ اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ واجب ہے، ساتویں حصے سے کم نہیں ہو سکتا البتہ ایک حصے دار کے دو حصے یا تین حصے ہو سکتے ہیں لیکن ساتویں حصے سے کم نہیں ہوگا بہر صورت مذکورہ صورت میں یا ساتواں حصے دار شریک کیا جائے یا ایک حصے دار دو حصے رکھ لے اگر ساتویں حصے کو چھ شریکوں نے باہمی تقسیم کیا تو کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ زید نے اپنی منکوحہ بیوی ہندہ کو عرصہ تقریباً ایک سال سے طلاق مغلظ بذریعہ یونین کونسل دے دی تھی اب ہندہ کے والدین نے ہندہ کا نکاح ثانی بکر کے ساتھ کر دیا ہے جو کہ ابھی نابالغ ہے اور ایجاب قبول خود بکر نے کیا تھا۔ پھر بکر نے ہندہ کو ایک یوم کے بعد طلاق دے دی تھی جس کو دس یوم گذرے ہیں اب اندریں صورت ہندہ نے زید کے ساتھ نکاح تجدید پڑھ لیا ہے جو کہ ابھی عدت شرعی پوری نہیں ہوئی صرف دس یوم کی مدت کے اندر نکاح تجدید پڑھ لیا گیا ہے۔ مسئولہ صورت حال یہ ہے کہ جس نکاح خواں نے نکاح پڑھا ہے۔ اس نے دیدہ دانستہ نکاح پڑھا ہے۔ ہندہ کے والدین نے بھی بتلایا تھا کہ دوبارہ طلاق ہوئے کو دس یوم ہو گئے ہیں۔ نکاح خوان امام مسجد بھی ہے لہٰذا ان حالات کے ہوتے ہوئے شرعی احکام کی رو سے ایسے امام مسجد کے پیچھے نماز جمعہ و دیگر نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرنے کا کیا حکم ہے۔ اہل دیہہ حضرات میں ان حالات مذکورہ سے بہت تشویش ہے۔ جناب والا مذکورہ سوال کا جواب شریعت محمدی کے مطابق بیان فرما کر عنداللہ اجر عظیم

حاصل کریں۔

سائل۔ حکیم محمد شفیع وسائلان جماعت نقشبندیہ موضع بھیلہ ہٹھار تحصیل وضلع قصور

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں نکاح ثانی برائے حلالہ جو بکر کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہ نکاح ہوا ہے نہ طلاقیں، کیونکہ نابالغ بچہ نہ خود ایجاب وقبول کر سکتا ہے اور نہ ہی طلاقیں دے سکتا ہے کیونکہ فقہاء کرام فرماتے ہیں لا ولایۃ لھم علیٰ انفسھم ولا یقع طلاق الصبی صورت مذکورہ میں جب نکاح ہی ہوا تو طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب بنیادی طور پر بکر کے ساتھ نکاح ہی نہیں ہوا تو پھر زید کے ساتھ جو دوبارہ (تجدید نکاح) کیا گیا ہے وہ بھی نہیں ہوا کیونکہ زید نے جب طلاق مغلظہ (طلاق ثلاثہ) بقول سائل دی ہے تو زید پر ہندہ قطعاً حرام ہو چکی ہے۔ جب تک ہندہ کا نکاح کسی عاقل بالغ کے ساتھ نہ کیا جائے تو زید پر یہ ہندہ حلال نہیں ہو سکتی۔ پیش امام نے زید کے ساتھ ہندہ کا نکاح پڑھا کر فعل حرام کا ارتکاب کیا ہے۔ پیش امام پر لازم ہے کہ وہ ہندہ اور زید کو کہے کہ جو میں نے تمہارا باہمی نکاح کیا ہے وہ نکاح نہیں ہوا۔ زید اور ہندہ آپس سے جدا ہو جائیں اگر ہندہ یہی چاہتی ہے کہ میں زید کے ساتھ ہی نکاح کروں تو پہلے کسی اور بالغ مرد کے ساتھ نکاح کر کے وہاں سے طلاق لینے کے بعد، بعد از عدت پھر زید کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے، مولوی مذکور کو علی الاعلان اور وہ گواہ جو زید کے نکاح میں شریک ہوئے ہیں توبہ کریں۔ بلکہ مولوی مذکور اپنے نکاح کی بھی تجدید کرے اگر پیش امام توبہ نہیں کرتا تو پھر اس کے پیچھے نماز جمعہ وغیرہ ہرگز نہ پڑھا جائے۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ موضع ہیال میں ایک آدمی کے گھر یہ

ختم شریف تھا۔ وہاں مجلس میں ایک آدمی نے مولوی اعظم سے مسئلہ دریافت کیا کہ کہ مہر کی شرعی کتنی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ مہر طاقت پر ہے۔ اس پر دریافت کیا گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح جب حضرت علیؓ کے ساتھ ہوا تھا تو ۳۲ درہم باندھے گئے تو مولوی صاحب نے یہ بے ادبانہ جواب دیا کہ علیؓ تو بڑے غریب آدمی تھے، مفلس تھے ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، اور ان ۳۲ درہم پر (نعوذ باللہ) جوتے مارو اور وہاں مجلس میں یہ بھی کہا کہ آپ خواہ مخواہ حضرت علیؓ کو بہادر کہتے ہو، بہادر تو حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ جس مجلس میں یہ بے ادبانہ کلام کیا گیا وہاں بیس کے قریب معززین بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے دو نے مجھے یہ واقعہ بیان کیا۔ صوفی عبدالعزیز، مستری عبدالکریم، اب التماس یہ ہے کہ ایسے بے ادب شخص کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے اور ایسے عقائد والے کے پیچھے امامت جائز ہے یا ناجائز؟

بینوا توجروا

سید خادم حسین شاہ مقام سنجوال شریف ضلع کوٹلی آزاد کشمیر۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

صورت مسئولہ میں مہر کی حد اقل (کم از کم) شرعاً دس درہم (اڑھائی روپیہ پرانی قیمت مقرر ہے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ جتنا ہی مہر باندھ لیا جائے جائز ہے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ کی شادی حضرت سیدہ خاتون جنت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی تھی تو مہر چار سو مثقال چاندی مقرر کی گئی تھی (الرشفۃ الصادی ص ۲۷) مثقال ساڑھے چار ماشے ہے، اہل بیت کرام کی محبت فرض عین ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے علیؓ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (امام احمد) امام الطبرانی فرماتے ہیں کہ حضرت علی کی محبت فرض ہے۔ مولوی مذکور جس نے مہر کی بات کرتے ہوئے حضرت علیؓ کی توہین کی ہے وہ خارجی ناجی ہے۔ ان خارجیوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا،

یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ کہ یہ لوگ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے ۔ یہ لوگ بے دین اور شیطان کے تابعدار ہیں صاحب فتاوی نظامیہ ان خوارج اور وہابیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ نماز میں ان کی اقتداء درست نہیں ہے پس اہل سنت وجماعت کو چاہیئے کہ ایسے لوگوں کو اپنی مساجد سے نکال دیں اور ان کے ساتھ میل جول نہ رکھیں (فتاوی نظامیہ ص ۳۲) بہر صورت مہر کی حد شرعی کم از کم دس درہم ہے اس سے کم نہیں ہونا چاہیئے زیادہ ہو سکتا ہے ۔ مولوی مذکور چونکہ خارجی وہابی ہے اس کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں ہے اس کو مسجد سے نکال دینا چاہیئے اس کے ساتھ کسی قسم کا ربط وتعلق نہ رکھا جائے ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین دریں مسئلہ کہ محمد ممتاز نے مسماۃ سلیما کے ساتھ نکاح کیا ہے جس سے اس کی اولاد بھی ہے اب سلیما کی سگی (حقیقی) بھتیجی شمیم کو محمد ممتاز نے اغوا کر لیا ہے اس شمیم کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے کیا دونوں پھوپھی اور بھتیجی وہ نکاح میں بیک وقت رکھ سکتا ہے یا نہیں ۔

سائل :۔ اللہ دتہ چک نمبر ۱۹ کھوکھراں والہ تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ ۔

الجواب بعونہ تعالیٰ

بر تقدیر صحت صورت مسئولہ میں دونوں پھوپھی اور بھتیجی کا بیک وقت جمع کرنا حرام اور ناجائز ہے لا تنکح المرءۃ علی عمتھا ولا خالتھا (فتاوی رضویہ) محمد ممتاز کو چاہیئے کہ شمیم کو اپنے گھر سے نکال دے پھوپھی کے ہوتے ہوئے بھتیجی کے ساتھ قطعاً نکاح نہیں ہو سکتا دونوں کا اجتماع بیک وقت حرام اور ناجائز ہے لہذا سلیما کے ہوتے ہوئے شمیم کے ساتھ محمد ممتاز نکاح نہیں کر سکتا ۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

"الاستفتاء"

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

اس مسئلہ میں کہ پیر و مرشد کے ہاتھ و پاؤں چومنا پیر کی قبر پر بوسہ دینا جائز ہے یا نہیں اگر جائز ہے تو کتب حدیث و کتب فقہ معتبر کے حوالجات کے ساتھ تحریر فرمائیے۔

سائل غلام حسین چک نمبر ۱۹۳، ضلع جھنگ،

"الجواب بعونہ تعالیٰ"

بزرگانِ دین اور پیر و مرشد کے ہاتھ پاؤں چومنے اور ان کی قبر کا بوسہ لینا شرعاً جائز ہے حدیث پاک میں ہے کہ مروان ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور کی طرف آیا دیکھا کہ ایک آدمی نے اپنا چہرہ قبر مبارک پر رکھا ہوا ہے مروان نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ کیا کام کر رہا ہے اور پھر مروان اس مرد پر متوجہ ہوا تو کیا دیکھتا ہے وہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ہیں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا کہ اے مروان جئت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ولم آت الحجرۃ" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہوں کسی پتھر کے پاس نہیں آیا یعنی اگر میں نے قبر مقدس پہ اپنا چہرہ رکھا ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے حضور میں حاضر ہوا ہوں کوئی پتھر تو نہیں ہے۔ (امام احمد، جوہر المنظم صـ۸۱) ایک صحابی بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے عرض کی میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضور آپ کی پیشانی پر سجدہ کر رہا ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا تو اپنی خواب سچی کر لے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم لیٹ گئے "فسجد علی جبھتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر سجدہ کیا امام ترمذی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ کے ساتھ معانقہ کیا اور ان کا بوسہ لیا امام ابو داؤد نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے امام ترمذی نے ہاتھ پاؤں چومنے کا باب،

باندھتے ہوتے ذکر کیا ہے فقبلوا یدیہ ورجلیہ کہ صحابہ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پاؤں چومے، امام ابن ماجہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت صفوان سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسہ دیا امام بخاری نے حضرت صہیب سے روایت کی ہے "رأیت علیاً یقبل ید العباس ورجلیہ" کہ میں نے حضرت علی کو دیکھا کہ وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیتے تھے، امام بخاری نے کتاب المفرد میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن اکوع کے ہاتھ چومے گئے، محمد بن عمر واقدی المتوفی ۲۰۷ھ لکھتے ہیں کہ میسرہ بن مروق نے حضرت دامس ابو الحصول کا وقت جنگ ہاتھ چوما۔ علامہ حموی شرح اشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں واما تقبیل الید ان کان ممن یستحق الاکرام کالعلماء والسادات والاشراف یرجی لہ ان ینال الثواب کما فعلہ بعض الصحابۃ، علماء، اور سادات اور بزرگوں کے ہاتھ چومنے موجب ثواب ہیں جیسے کہ صحابہ کرام سے ثابت ہے، در مختار میں ہے ولا بأس ان یقبل ید الرجل العالم علی سبیل التبرک یعنی عالم کے ہاتھ چومنے باعث برکت ہیں۔ امام نووی نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ کسی بزرگ کے ہاتھ کو بوسہ دینا مستحب ہے، نواب صدیق حسن خان جو وہابیہ کے مورث اعلیٰ ہیں لکھتے ہیں کہ پاؤں اور ہاتھ کا بوسہ لینا جائز ہے (رو اللہ الموندۃ)

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب المیزان میں لکھا ہے کہ متعدد فقہاء اور محدثین جن میں امام ثوری حماد بن سلمہ مقاتل بن حبان وغیرہ ہیں یہ لوگ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیتے تھے۔ امام بخاری نے فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر بوسہ دیا (بخاری ج۲ ص۶۴۰ باب وفات النبی) امام ابو داؤد نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فوت ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرہ مبارک کو چوما، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر مبارک اور قبر مقدس کا بوسہ لینا جائز ہے اس میں کسی قسم

کا کوئی حرج نہیں ہے علامہ ابن ابی الصیف مکی شافعی فرماتے ہیں جواز تقبیل المصحف واجزاء الحدیث وقبور الصالحین قرآن کریم اور کتب حدیث اور قبور اولیاء کرام کا بوسہ لینا جائز ہے ان احادیث اور اقوال فقہا کرام سے ثابت ہوا کہ اولیا رکرام، علمار صلحا ر کے ہاتھ پاؤں چومنا نہ صرف جائز ہی ہیں بلکہ سنت صحابہ ہے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر مبارک کو چومتے تھے، اور مروان نے جب حضرت ابوایوب کو منع کرنے کی کوشش کی تو آپ نے فرمایا کہ میں بارگاہ نبوت اور رسالت میں حاضر ہوا ہوں نہ کہ کسی پتھر کے پاس آیا ہوں بہر صورت پیرو مرشد کے ہاتھ پاؤں چومنا اور اپنے مرشد برحق کی قبر کو بوسہ دینا شرعاً جائز ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم بالصواب۔

"الاستفتاء" کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ خنزیر کا گوشت کیوں حرام ہے۔

سائل "ملک" محمد ضمیر الیسحائے ڈنمارک،

الجواب بعونہ تعالیٰ،

صورت مسئولہ میں مسلمان کے لئے یہی کافی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خنزیر کو مسلمان کے لئے حرام قرار دیا ہے قرآن پاک میں ہے "انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر" اس نے حرام کیا ہے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور قرآن پاک میں ہے "اولحم خنزیر فانہ رجس اوفسقاً" حرام ہے سور کا گوشت کیونکہ وہ سخت گندہ ہے کتب حدیث اور کتب فقہ میں اس کا حرام ہونا

مذکور ہے علماء اسلام نے اس کو نجس العین کہا ہے جب گوشت خنزیر کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے تو اس کی حرمت میں شک کرنا صریح کفر ہے رہی یہ بات کہ سائل کا یہ کہنا کہ گوشت (خنزیر) حرام کیوں ہے غالباً سائل گوشت خنزیر کے گوشت کے حرام ہونے کی وجہ عقلی پوچھنا چاہتا ہے کیونکہ اسلام ایک عقلی اور منطقی مذہب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک عظیم محقق ڈاکٹر احمد شوق لکھتے ہیں کہ سور کا گوشت نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام نوع انسانیت کے لئے حرام ہے اور اس حرمت کے کم از کم ظاہری طور پر تین طبی اور سائنسی سبب ہیں اول گندے گاڑھے پانی یا کائی کی قسم کی ایک چیز ہوتی ہے جسے کیچوا یا گندارا (TAENIA) وغیرہ کہتے ہیں یہ کیڑے جانوروں کا گوشت کھانے سے انسان کو لاحق ہو جاتے ہیں پھر وہ کیڑا جو سور میں پایا جاتا ہے وہ دیگر جانوروں مثلاً بکری اور گائے میں پائے جانے والے کیڑوں سے مختلف ہوتا ہے دونوں میں زبردست اختلاف ہے سور کے کیڑے کا نام (TAENIASOLIUM) ہے جبکہ دوسرے جانوروں میں پائے جانے والے کیڑوں کا نام (TAENIASAGINATA) ہے اور یہ بات پیش نظر رہے کہ دونوں جانوروں میں فرق صرف شکل وصورت جسامت وقامت، عادات واطوار کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ آخر نوع انسانی کے لئے دونوں میں کون زیادہ مضر و مہلک ہے کون سی چیز انسانی زندگی کے لئے قاتل ہے اور کون سی چیز پیغام حیات ہے بکری وغیرہ کے کیڑوں کو لیجیئے (TAENIASAGINATA) یہ گوشت کے ذریعے انتڑیوں میں پہنچتے ہیں وہیں پرورش پاتے ہیں اور انسانی جسم کو نقصان نہیں پہنچاتے، لیکن سور کے کیڑے (TAENIASOLIUM) صرف انتڑیوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ اور دوسرے انسانی اعضائے رئیسہ کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ جیسے بھیجا، دماغ، آنکھ، دل، پھیپھڑا، جگر وغیرہ اور پھر وہاں پہنچکر ایک مکمل

جسامت اختیار کر لیتے ہیں جو لوبیا کے بیج کے برابر یا اس سے کچھ بڑے ہی ہوتے ہیں، اگر یہ کیڑے دماغ میں پہنچیں تو پاگل اپاہج، لنج، اور مخبوط الحواس ہو جانے کا اندیشہ ہے اگر آنکھ پر نظر انداز ہوئے تو اندھا ہونا یقینی سا ہو جاتا ہے اور اگر قلب و جگر ان سے متاثر ہوئے تو حرکت قلب بند ہو جانے یا پھر دل کی دھڑکن تیز ہو جانے کا خطرہ ہے، بعض وہ ممالک جہاں ان کیڑوں کی وبا عام ہے مثلاً لاطینی امریکہ وغیرہ میں جب کسی شخص کے پاگل پن، اندھے پن یا اچانک موت کا حادثہ ہو جاتا ہے تو فوراً لوگوں کا خیال اس جانب مبذول ہوتا ہے کہ اس سور کے کیڑے (TAENIASOLIUM) لگ گئے ہیں اور وہ خطہ ارضی جہاں یہ جراثیم یا مہلک کیڑے غیر معروف ہیں وہاں ہر مذکورہ بالا قسم کے امراض کی تشخیص محال ہو جاتی ہے اور لبا اوقات تو لوگ مر جاتے ہیں میرے نزدیک یہی سب سے بڑی پر اسرار علمی وجہ یہ ہے جس کے پیش نظر اسلام نے سور کا گوشت حرام قرار دیا ہے، سبب دوم علمی اصطلاح میں جانوروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جانور جو گھاس چارہ وغیرہ کھاتے ہیں (HANBILONA) جیسے ہرن، اونٹ، خرگوش، بکری وغیرہ دوسرے جانور جو گوشت کھاتے ہیں۔
(CANNIVONA) جیسے شیر، بھیڑیا، لومڑی، کتا، بلی وغیرہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک جب سے اللہ تعالیٰ نے انسانی خلقت کا آغاز کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں انسانی جانوروں سے بہت قریب رہا ہے مگر کبھی بھی اس نے گوشت خور جانوروں کا گوشت نہیں کھایا، گوشت خور جانور نسبتاً ذہین ہوتے ہیں اور لبا اوقات وہ ذبح کرنے اور کھانے کا ویسا ہی شعور رکھتے ہیں جیسا کہ خود انسان اسی لئے انسان اپنے کتے کو کھانے کی ہمت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود احساس کرتا ہے اور درد محسوس کرتا ہے اور اس کے جذبات انسان کے جذبات کی طرح ہوتے ہیں انہیں ایک قسم بد خلقی، درندگی، تند خوئی لاحق ہو جاتی ہے وہ عادت کے مطابق یہ وجہ بھی خونریزی

کرتے رہتے ہیں کیونکہ خونریزی سے انہیں دلچسپی ہے اور ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو عملی طور پر انسان کا گوشت کھاتے ہیں اور یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ اس قسم کے حرام گوشت کا استعمال انسان کے اندر ایک طرح کی جنسی انارکی اور لاپرواہی پیدا کرتا ہے یا یوں سمجھیئے کہ اس کے جنسی تعلقات پر عدم تقدیس، بہیمیت، بے حیائی، انتشار، و لاپرواہی غالب آجاتی ہے، جو عزت، و آبرو، شرافت و وقار اور عورتوں کی غیرت و عصمت کے لئے کھلا ہوا موت کا پیغام ہے اب سور اور اس کے گوشت کی حرمت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس کا شمار علمی اصول و معیار کے مطابق گوشت خور اور سبزی خور جانوروں کے درمیان ہوتا ہے بلکہ زیادہ مناسب طریقہ پر یوں کہیئے کہ اس کی بناوٹ، جسمانی ساخت اس کا جگر اس کے دانت اسے گوشت خور جانوروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتے ہیں اور سب سے بدترین بات تو یہ ہے جو گوشت یہ کھاتا ہے تازہ نہیں بلکہ سڑا ہوا باسی، بدبودار اور دوسرے جانوروں کا چھوڑا ہوا جیسے گیدڑ، بھیڑیئے وغیرہ کا ہوتا ہے یورپ میں اگرچہ بعض لوگ خنزیروں کو ستھرے باڑوں اور ڈربوں میں رکھتے ہیں لیکن یہ خبیث جانور تمام صفائیوں کے باوجود بھی اپنے ساتھ میں رہنے والے دوسرے جانوروں کا گندہ اور کبھی کبھی خود اپنا ہی گندہ کھا لیتا ہے نیز راستے میں پڑے ہوئے مردہ چوہوں کو بھی کھا لیتا ہے اس وجہ سے مغربی لوگ جو سور کا گوشت کھاتے ہیں تند خوئی اور جنگ جوئی پر زیادہ آمادہ رہتے ہیں اور [illegible]مان یا اہل مشرق جو سور کا گوشت نہیں کھاتے خوش اخلاقی کا مظہر اور صلح پسندی کا خوگر معلوم ہوتے ہیں ساتھ ہی ساتھ عورتوں کی عزت و آبرو کے محافظ اور مغربی آداب و رسوم کے مخالف ہیں، تیسرا[۳] سبب خنزیر کے گوشت کے حرام ہونے کا یہ ہے کہ اندرونی امراض کے ماہر اطباء کا خیال یہ ہے کہ انسانی صحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جانوروں کے گوشت کی کئی قسمیں ہو جاتی ہیں ایک تو وہ جو زود

ہضم اور کھانے میں پر لطف ہو ایک وہ جو ثقیل ہوتی ہے اور جگر وغیرہ پر غلط اثر
ڈالتی ہے اور ایک وہ غذا ہوتی ہے جو ہلکی ہوتی ہے جس میں چکنائی کا استعمال کم ہوتا ہے
اب اگر ڈاکٹر کے پاس کوئی بد ہضمی کا مریض آتا ہے یا وہ شخص جو مرض جگر میں مبتلا ہو تو
طبیب اسے ایسے کھانے کا مشورہ دیتا ہے جس میں تیل اور چربی دار گوشت استعمال
نہ کیا گیا ہو اور یہ ایک حقیقت ہے کہ سور کا گوشت سب سے زیادہ چربی دار ہوتا
ہے پھر اس کے بعد بکری اور اس کے بعد گائے کا نمبر آتا ہے جس میں چربی کی مقدار نسبتاً
کم ہوتی ہے طبی اور سائنسی نقطہ نظر یہ تیسری وجہ تھی جس کی رو سے اسلام نے سور کا گوشت
حرام کیا ہے، (منقول از ضیا حرم) تحقیق بالا سے ثابت ہوا کہ سور کا گوشت جیسے کہ
شرعی طور پر حرام ہے اس طرح یہ سور کا گوشت تمام عالم انسانیت کے لئے عقلی طور پر بھی
حرام اور مہلک ہے سور نجس العین ہے اور گندہ ہے اور گند کھاتا ہے اسی لئے قرآن پاک
نے فرمایا ہے فانہ رجس کہ یہ سور کا گوشت گندہ ہے اور جو اس کا گوشت کھاتا ہے اس
کے اثرات اور خبیث جراثیم اس میں بھی اثر کرتے ہیں اسی لئے سور کا گوشت کھانے
والا خنزیر کی طرح ہی خبیث جراثیم کا ارتکاب کرتا ہے، سور کے گوشت کھانے سے
بے غیرتی، لاابالی۔ بے پروائی جنسی انار کی پیدا ہوتی ہے بعض دفعہ موت ہو جاتی ہے
یا موذی مہلک مرض لاحق ہو جاتی ہے، انسان پاگل، اپاہج اور مخبوط الحواس ہو جاتا ہے
یہ تمام عقلی اور طبی نقصان وہ اسرار اس کے گوشت کے کھانے میں مضمر تھے لہذا اللہ تعالیٰ
اور اس کے رسول نے خنزیر کے گوشت کھانے کو تمام نوع انسانی کے لئے حرام فرمایا ہے
ہر مسلمان کے لئے خصوصی احتیاط چاہیئے کہ جب وہ مغربی ممالک میں جائے تو سور کا گوشت
ہرگز نہ کھائے اس کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور عقلاً بھی یہ حرام ہے۔

واللہ و رسولہ اعلم بالصواب،

مفتی غلام رسول
دار العلوم نقشبندیہ علی پور شریف، سیالکوٹ۔